مقالاتِ شیرانی



محمود شیرانی

مقالاتِ شیرانی

حافظ محمود شیرانی

کتاب منزل لاہور

سلسلہ مطبوعات نمبر ۵۹

مصنف ــــــــــــــ حافظ محمود شیرانی

طابع ــــــــــــــ شیخ نیاز احمد

کاتب ــــــــــــــ عارف حسین

مطبع ــــــــــــــ علمی پرنٹنگ پریس لاہور

ناشر ــــــــــــــ کتاب منزل لاہور

اشاعت ــــــــــــــ دوسری

قیمت ــــــــــــــ

فہرست

چند لمحے وکٹوریہ البرٹ میوزیم میں

انگلستان میں ہندوستان کی غریب الوطن یادگاریں اور انکی سرگزشت

لندن کا وکٹوریہ البرٹ میوزیم بارہ ایکڑ زمین پر واقع ہے۔ یہ عمارت اولاً ۱۸۵۰ء کی نمائش کے لیے تیار ہوئی تھی۔ جس پر دولتِ برطانیہ نے ساٹھ ہزار پونڈ یعنی نو لاکھ روپے صرف کیے۔ ۱۸۵۵ء میں اس پر ایک اور چوبی و آہنی عمارت مستزاد ہوئی۔ ۱۸۵۷ء میں اس کا نام سوتھ کینزنگٹن میوزیم رکھا گیا۔ ۱۸۹۹ء میں اسی عمارت میں اور اصلاح ہوئی اور اس اصلاح شدہ عمارت کا نام تاجدار بیوی اور بے تاج شوہر کی یادگار میں وکٹوریہ البرٹ میوزیم رکھا گیا۔

اس عمارت میں قدیم وجدید فنون وعلوم کا ایک بیش ذخیرہ موجود ہے۔ جو دنیا کی ممتاز قوموں کے تمدّن اور تمدّن کی ترقی کی تاریخ ظاہر کر رہا ہے۔ مشرقی اقوام کا تمدّن ایک علیحدہ عمارت میں دکھایا گیا ہے۔ جہاں ہندی

ایرانی، شامی، عربی، چینی اور جاپانی صنائع کے علیحدہ علیحدہ کمرے موجود ہیں۔ اس عمارت کے قریباً تیس کمرے ہندوستان کی صنعت و حرفت سے پُر ہیں۔ باقی کمرے ممالک متذکرہ بالا کی مصنوعات سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں اس وقت میوزیم کے دوسرے حصّوں سے بحث نہیں کرتا۔ صرف اسی حصّہ عمارت کی بابت گفتگو کرتا ہوں جس سے ہندوستان کو تعلق ہے۔

میوزیم کے اس حصّے کی ابتدا ایسٹ انڈیا کمپنی سے علاقہ رکھتی ہے۔ کمپنی کی وفات پر اس کا ورثہ انڈیا آفس کو پہنچا۔ جس میں انڈین میوزیم بھی شامل تھا۔ ۱۸۸۰ء میں یہ میوزیم سوتھ کینزنگٹن میوزیم میں ملحق کر دیا گیا۔ اس عمارت کے دروازے پر جلی حروف میں لکھا ہوا ہے "انڈین سیکشن" غیر قوم اس سے متاثر ہو یا نہ ہو لیکن ایک ہندوستانی کو یہ الفاظ مغموم یا مغرور ضرور کریں گے۔ دروازے پر ایک گورا کالی وردی میں ٹہلتا نظر آئے گا۔ اگر آپ پگڑی باندھے ہوئے ہیں تو "انڈین پرنس" سمجھ کر سلامی دے گا اور آپ کے لیے راستہ چھوڑ دے گا۔ دروازے میں گھستے ہی جے پور کے ہوا محل نظر آئیں گے۔ جن کی نقل پیتل کی ہے۔ اب آپ ایک چوبی چھت دیکھیں گے جو کو چین کے کسی مندر کی ہے اور راجہ رامچندر جی کی شادی کا مرقع پیش کر رہی ہے۔

آگے چل کر ایک چوبیں برآمدہ ہے جس میں دو دروازے جھانکتے ہیں۔ دروازوں کے دو جھروکے ہیں۔ لکڑی پر کام بھدا ہے۔ یہ حصّہ عمارت شاہ سام بہادر

کے محل کا ظاہر کیا جاتا ہے۔ اس کی تاریخ تین صدی پیشتر سے متعلق ہے۔ اس برآمدے کی خرید میں دو سو پونڈ صرف ہوئے۔ پاس ہی خان دوران خاں کی قبر کی جالی دار دیوار ہے جو گوالیار سے لی گئی ہے۔ پھر سید مراد شاہ کے مزار واقع ملتان کا نمونہ ہے جس پر مرحوم کی تاریخ بھی کندہ ہے۔

پھر سانچی ٹوپ واقع بھیلن بھوپال (ممالک متوسط) کی نقل ہے۔ یہ عمارت ہندوستان میں بدھ مت کے عروج کے زمانے کی یادگار ہے اور اس کو ہندوستان کی نہایت ہی قدیم عمارت کہا جا سکتا ہے۔ عمارت کی صورت ایک بڑے گنبد کے مشابہ ہے۔ جس کے گرد احاطہ کھنچا ہوا ہے۔ احاطے میں چار دروازے ہیں۔ ان میں ایک دروازہ بجنسہٖ میوزیم کے بالائی حصّے میں رکھا ہوا ہے۔ گنبد کی تاریخِ تعمیر پانسو سال قبل مسیح ظاہر کی جاتی ہے۔ اس کے بانی کا نام نامعلوم ہے۔ دو سو ساٹھ برس قبل مسیح راجہ اشوکا نے اس کو سنگِ سرخ سے تعمیر کیا اور سینتیس برس قبل مسیح سری سنگارنی (ماگدہ دیس) نے اس کے دروازے تعمیر کیے۔

دو خانوں میں بدھ کی ثابت اور شکستہ مجلسیں ہیں۔ بعض میں بدھ جی شاگردوں میں مشغول ہیں اور تعلیم دے رہے ہیں۔ بعض میں یادِ الٰہی میں مصروف نظر آتے ہیں بعض میں قوال سے جس کے ہاتھ میں ساز بھی ہے۔ وجدانی بھجن اور گیت سُن رہے ہیں۔ یہ مجلسیں حال ہی میں ملک یوسف زئی سے برآمد ہوئی ہیں۔ ان کی

تاریخ نامعلوم ہے۔ قیاسا کہا جاتا ہے کہ یہ سمت بکرمی سے بھی نہایت قدیم ہیں۔ یہیں اجمیر کے قدیم بدھ مندر کے شکستہ بت اور ستون موجود ہیں۔ جن کی تاریخ دوسری اور آٹھویں صدی عیسوی کے درمیان بیان کی جاتی ہے یہاں قطبی عمارات (قطب الدین ایبک) کے بھی چند ستون نظر آتے ہیں۔ قریب ہی شمسی عمارات (شمس الدین التمش) کے کچھ باقیات ہیں۔ جن پر کلام مجید کی آیات کندہ ہیں۔ گوڑ واقع بنگال سے شیر شاہی عمارات کے بقیے ہیں۔ جو پندرھویں صدی عیسوی کا نمونہ ہیں۔ فتح پور سیکری سے تختِ اکبری بجنسہٖ یہاں دکھا ہُوا ہے۔ اکبر کی قبر واقع سکندرہ کے نمونے اور آرام بانو کے مزار کی نقل بھی موجود ہے۔ تاج گنج کی کئی نقلیں ہیں۔ امرتسر کے سنہرے مندر کی نقل بھی یہاں نظر آتی ہے۔ دو کمرے یہاں ختم ہوتے ہیں۔

تیسرے کمرے میں ہندوستان کے پیشہ ور، صنعت پیشہ اور تجارت پیشہ دکھائے ہیں۔ ان کے اوقاتِ زندگی، مختلف رسمیں، شادی، ماتم داری، مذہبی رسمیں، ہولی، درگا پوجا اور محرم وغیرہ وغیرہ دکھائے ہیں۔ قدیم و جدید سواریوں کے نمونے، پیشہ وروں کے اوزار اور موسیقی کے ساز قدیم و جدید جمع ہیں۔

چوتھے کمرے میں ہندوستان کی ساخت کا کپڑا نظر آتا ہے۔ چھینٹیں، سیلے، مندیل، زردوزی، گوٹا اور سوئی کے کام کے اعلےٰ سے اعلےٰ نمونے

رکھے ہوئے ہیں۔ یہیں ہندوستان کی قوموں کا لباس رکھا گیا ہے۔

پانچویں کمرے میں لیس کا کام، لکڑی کا کام، ہاتھی دانت پر کام، سینگ کا کام، چمڑے کا کام۔ غرض سب صنعتوں کے نمونے رکھے ہیں۔ میز، کرسی، پلنگ، صندوق، زین، پالان وغیرہ وغیرہ سب مشہور مقامات کا سامان موجود ہے۔ یہیں چند خانوں میں ہندوستان کے مختلف اضلاع کی پگڑیاں اور ٹوپیاں رکھی ہوئی ہیں۔

صحنِ عمارت یہاں ختم ہوتا ہے۔ زینے کا راستہ لیجیے اور دیواروں پر لٹکی ہوئی تصویروں پر بھی نظر ڈالتے چلیے جو ہندوستان کے مختلف مقامات کے مناظر پیش کر رہی ہیں۔ زینے کے ایک حصے میں دو الماریاں دیوار کے برابر کھڑی ہیں، جن میں ہتھیار بند ہیں۔ ایک تلوار پر جو سلاح خانہ الور سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ شعر آبِ زر سے لکھا ہوا ہے ؎

روزے کہ ہیچ کس نہ بود داد رس مرا
یا مرتضےٰ علی توئی فریاد رس مرا

پہلے کمرے میں تانبے، پیتل، کانسی کے برتن دکھائے ہیں اور دیواروں پر ایرانی، افغانی، ترکستانی اور ہندوستانی قالین لٹک رہے ہیں۔ دوسرے کمرے میں ہندوستان کا مروجہ حال و قدیم زیور طلائی و نقرئی دکھایا گیا ہے۔ دو تین خانوں میں شاہِ برما کے خزانے کی جڑاؤ چیزیں رکھی ہیں جو انگریزوں نے

۱۸۸۵ء میں مانڈلے کے محل سے لی تھیں۔ جن میں کچھ نقرئی اور طلائی برتن بھی ہیں۔

تیسرے کمرے میں ہندوستان کے مختلف اضلاع اور قوموں کے ہتھیار دکھائے ہیں۔ پہلے خانے میں آسام کے ہتھیار ہیں جو زیادہ بھدے اور ناتراشیدہ ہیں۔ پھر نیپال کے ہتھیار ہیں جو ان سے بہتر ہیں۔ مرہٹوں کے ہتھیار ہیں، راجپوتوں کے، سندھ کے، پنجاب کے اور پٹھانوں کے۔ بناوٹ کے لحاظ سے یہ ہتھیار سب ایک ہیں۔ کیونکہ کسی خاص ہتھیار سے ہندوستان میں کسی خاص قوم کو علاقہ نہیں۔ راجپوتوں کا کھانڈا اور کٹار، مرہٹوں کا بچھوا اور پٹھانوں کا چُھرا مشہور ہے۔ لیکن اور قوموں نے بھی اس کو استعمال کیا ہے۔ انگریزوں نے ان ہتھیاروں کی تقسیم جداگانہ یوں کی کہ جس قوم سے جو ہتھیار اُن کے ہاتھ لگے وہ ہتھیار اسی قوم کے خانے میں دکھا دیئے۔ اسی خانے میں دو تین توپیں پڑی ہوئی ہیں اور خود و زرہ بکتر رکھے ہوئے ہیں۔

چوتھے کمرے میں مٹی کے برتن، پیالے اور صراحیاں ہیں۔ دو خانوں میں کانچ کے برتن ہیں۔ دو تین خانوں میں حال کی مہم تبت کی چند یادگاریں ہیں۔

ایک خانے میں قدیم نگینے رکھے ہوئے ہیں۔ ان نگینوں کا رواج زیادہ تر ایران، یونان، شام اور بابل میں تھا۔ یہ مجموعہ جو ہندوستان سے برآمد ہوا ہے۔ اس میں ایرانیوں کے نگینے بھی ہیں اور یونانیوں اور رومیوں کے بھی۔

اور چند ہندوستانیوں کے بھی۔ ان نگینوں کی عجیب عجیب طرح کی شکلیں ہیں بعض پر پرند کھدے ہیں، بعض پر چوپائے کندہ ہیں اور بعض پر انسانی شکلیں ہیں۔ ان کی تاریخ نگینوں کی طرح خاموش ہے اور ہم نہیں جانتے کہ کس کس زمانے سے تعلق رکھتے ہیں ؎

خزاں سے کون یہ پوچھے کہ کیا ہوئے آخر
وہ پھول لائی تھی اگلے برس جو فصلِ بہار

ہمارے ملکی ناموروں کی یہاں بہت سی یادگاریں ہیں جن کی بابت میرے ہم وطنوں نے بہت کم سنا ہوگا۔ یوں تو یہ میوزیم اور اس کی ہر چیز بجائے خود ایک داستان اور از یادِ رفتہ اسلاف کی یادگار ہے۔ لیکن یہ نہایت مشکل ہے کہ ہم ان کے موجدوں اور بانیوں کی تاریخ معلوم کر سکیں۔ البتہ چند چیزیں ہیں جو اپنے بانیوں کے نام روشن کر رہی ہیں اور ان کو ان اوراق پر ہم درج کرنا چاہتے ہیں۔ علمی یادگاروں میں تو صرف اکبر نامے کے چند باتصویر اوراق ہیں جو ابوالفضل کا نام زندہ کر رہے ہیں۔ جن میں زیادہ تر نقاشی سے کام لیا گیا ہے۔ ان اوراق کے مصوّر اکثر ہندو ہیں۔ بعض مقام پر مسلمان نام بھی پائے جاتے ہیں لیکن مصوّری میں ان کی بدشوقی تو ان کی دینی تعلیم اور قومی شناخت ہے صنعت و حرفت میں جو ہمارے ملک میں سربرآوردہ گزرے ہیں ان کی شہرت ان کے مٹنے پر غالب ہو گئی۔ یا یہ کہیے کہ ان کی مصنوعات موجود ہیں لیکن وہ نام

جنھوں نے یہ پیاری اور خوشنما چیزیں ایجاد کیں غائب ہیں۔ اب رہے وہ نامور جنھوں نے ہندوستان کی تاریخ میں کارہائے نمایاں کیے اور اپنے زمانے میں شاہی اور خدائی اختیارات پائے۔ ان مرہٹوں کی تمام تو نہیں پر چند نشانیاں باقی ہیں۔ انگریز اٹھائی گیرے تو پرلے درجے کے ہیں اور اصل بھی یہ ہے کہ ان کے چھوٹے چھوٹے گھر مندروں کی طرح آراستہ بجائے خود عجائب خانے ہیں۔ کوئی بدنصیب گھر ہوگا جس میں ہندوستان کی ایک آدھ چیز نئی پرانی نظر نہ آئے۔ جس زمانے میں ان کو ہندوستان سے تعلق ہوا جب سے آج تک انھوں نے کیا کچھ نہ لیا ہوگا۔ اس کا حساب تو وہ جانیں اور ان کا خدا۔ لیکن عام تفرج گاہوں میں جو کچھ نظر آتا ہے وہ بہت ہی کم ہے۔ کچھ چیزیں ونڈسر کاسل میں ہیں۔ کچھ قصر بکنگھم میں، کچھ برٹش میوزیم میں، کچھ ٹاور میں، کچھ انڈیا آفس میں اور چند یہاں ہیں۔ ٹاور میں ہمارے غریب الوطن کوہ نور کی نقل رکھی ہوئی ہے اور یہیں میواجی مرہٹہ کا وہ جاں ستاں بچھوا رکھا ہے جس نے افضل خاں کی جان لی تھی۔ اس میوزیم میں جو چیزیں تاریخ سے تعلق رکھتی ہیں اُن کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلے ایک کرسی سنگِ مرمر کی ہے۔ یہ کرسی سراج الدین محمد بہادر شاہ نے جنرل سر جارج بروک کو بخشی تھی۔ ایک مقام پر اسی بدنصیب بادشاہ کے دو فرمان لٹک رہے ہیں جو زرافشاں کاغذ پر ہیں۔ اگر ایک فرمان کی نقل بھی درج

کردی جائے تو خالی از لطف نہیں :-

"دریں وقت میمنت اقتران فرمان والاشان واجب الاذعان صادر شد کہ بہ مقتضائے وفورِ مراحم خاقانی و تفضیلاتِ خسروانی کہ نمونۂ افضال یزدانی است فدوی خاص لائق عنایت والاحسان سیمن فرزند را بہ خطاب امین الدولہ بہادر دلیر جنگ یمین الاعیان والارکان وفی الامثال والاقتران سرفراز و ممتاز فرمودیم۔ باید کہ فرزندانِ نام دار کامگار و الاتبار و وزرائے ذوالاقتدار و امرائے عالی مقدار و حکام ممالک فدوی خاص معز الیہ را از جانب فیض مآب بادشاہے بہ شمول ایں خطاب برگزیدہ و القاب پسندیدہ معز و مباہی دانستہ انظار عنایت باید و لت را با حوال فرخندہ مآل بہادر معز الیہ یوماً فیوماً متزاید و بے نہایت مانند تاریخ بست و پنجم ربیع الثانی سال سی ام از جلوس ابد مانوس معلیٰ زیب تحریر یافت۔"

اس فرمان پر شاہ موصوف کی مُہر ہے۔ مُہر کے حاشیے پر گزشتہ سلاطین مغلیہ کے نام تحریر ہیں۔ برابر ہی خط طغرا میں "ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ بادشاہِ غازی" لکھا ہوا ہے۔

یہاں ایک مسند پوش بھی ہے۔ اس کی ولادت اگرچہ ترکستان ہے لیکن انقلابِ زمانہ اسے ہندوستان اور ہندوستان سے یہاں لایا۔ یہ مسند پوش امیر بخارا

نے امیر علی نثیر خاں امیر افغانستان کو تحفۃً بھیجا تھا۔ ان سے انگریزوں کے ہاتھ لگا۔ سرخ بانات پر زردوزی کا کام ہے۔

سابق مہاراجہ بڑودہ کا کوٹ، پتلون اور ہیٹ بھی یہاں رکھے ہوئے ہیں۔ پتلون سیاہ کشمیرے کی ہے جس پر دوہری لیس ٹکی ہوئی ہے۔ الپاکا کا سیاہ کوٹ ہے۔ کالر، کفوں، کندھوں اور حاشیے پر سنہرا روپہلا کام ہوا ہے۔ ہیٹ تمام زرنگار ہے۔ چندوے پر سرخ و سفید پر پھیلے ہوئے ہیں۔

پگڑیوں اور ٹوپیوں کی قطار میں ایک سرپیچ مرصّع ہے جس پر کلغی اور مالا پڑی ہوئی ہے۔ اس سرپیچ کا علاقہ مہاراجہ مان سنگھ مہاراجہ جودھپور سے ہے۔

اسی موقع پر ایک ٹوپی بھی قابلِ ذکر ہے۔ نہ صرف اس لحاظ سے کہ اس کا علاقہ وزیر شاہِ اودھ سے ہے۔ بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ وہ اپنی طرز میں اکیلی ہے حضراتِ لکھنؤ تراش خراش اور ایجاد میں تو فرد ہیں۔ یہ بھی ان کی ایک ایجاد ہے اور بالکل عجیب ہے۔ پہلے ایک بل دار پگڑی کا تصوّر کیجیے۔ پگڑی کی چھت پر ایک چوگوشہ تاج نما ٹوپی مستزاد کیجیے۔ ایسی پگڑی یا ٹوپی کے لیے سر بھی خاص قسم کا تلاش کرنا ہوگا۔ کیونکہ ما و شما کے سروں پر تو وہ بہت ہی بڑی ہے لیکن وزیر شاہ اودھ تھے۔ شاید سر بھی شملہ بمقدارِ علم، معمولی سروں سے بڑا ہو۔ مگر افسوس ہے کہ اس ایجاد کو فروغ کا تاج نہیں ملا۔

مہاراجہ ہلکر کی تلوار بھی قابلِ تحریر ہے۔ یہ تلوار مہدپور کے واقعہ کی یادگار ہے۔

جس میں انگریز فتح یاب رہے اور مہاراجہ ہلکر کو شکست ہوئی۔ جنگ کے خاتمہ پر مغلوب ہونے کی علامت میں یہ تلوار مہاراجہ موصوف نے انگریزی سپہ سالار کو دی۔ گورنمنٹ نے سر جان ملکم کو تحفۃً دی۔ ان کے متعلقین سے ایک سو پچاس پونڈ میں میوزیم کے لیے خریدی گئی۔ قبضہ پر معمولی سنہری کام ہے اور لعل و زمرد جڑے ہوئے ہیں۔ میان قرمزی مخمل کا ہے۔

رنجیت سنگھ کی ایک آرام کرسی ہے۔ تمام کرسی پر سونے کا پانی پھرا ہوا ہے۔ اندر کی طرف گلابی مخمل کے تکیے بچھے ہوئے ہیں۔ امیر افغانستان کی بھی ایک کرسی یہاں رکھی ہوئی ہے۔ یہ کرسی اکتوبر ۱۸۷۹ء میں امیر کے محل واقع بالاحصا سے انگریزوں کے ہاتھ لگی۔ کرنل ٹی۔ ڈی۔ بجر نے شاہ ایڈورڈ کو ان کے ولیعہد ہونے کے زمانے میں نذر کی۔ شاہ موصوف نے میوزیم میں مستعار بھیج دی۔ کرسی پر بادامی ہلکا رنگ ہے۔ دونوں بازوؤں پر دو شیر تراشے ہوئے ہیں۔ نشست پر ہلکے سرخ رنگ کا کپڑا منڈھا ہوا ہے۔

شاہ شجاع کے آہنی دستانے بھی ہتھیاروں کے کمرے میں نظر آتے ہیں۔ دستانوں پر چاندی چڑھی ہوئی ہے اور چاندی پر سونے کے پانی سے عربی میں اسماء الٰہی اور عربی جملے تحریر ہیں۔ پونچے کی طرف بسم اللہ تحریر ہے۔ کلائی پر یا مظہر العجائب اور کہنی کے قریب لا فتیٰ اِلّا علی۔ لا سیف اِلّا ذو الفقار مرقوم ہے حاشیہ پر پوری آیۃ الکرسی لکھی ہوئی ہے۔

نواب آصف الدولہ بہادر کی توپ بھی یہاں رکھی ہے۔ یہ توپ غالباً ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے ہاتھ لگی ہوگی۔ اس توپ پر یہ جملہ تحریر ہے۔

"سرکار آصف الدولہ بہادر وزیر الممالک رستم ہند"۔

امیر ایوب خاں سابق والیٔ افغانستان کا ایک جھنڈا یہاں لٹک رہا ہے۔ پرچم کے وسط میں پوری بسم اللہ خطِ طغرا میں تحریر ہے۔ یہ جھنڈا انگریزوں نے قندھار کے مقام پر لیا تھا۔

زنانہ پوشاکوں میں ایک پوشاک لکھنؤ کی آخری بیگم کی نظر آتی ہے جس میں غرارہ دار زنانہ پاجامہ، دوپٹہ اور محرم شامل ہے۔ دوپٹہ سبز ریشمی ململ کا ہے جس پر گوٹے ٹپہ سے بیل بوٹے کاڑھے گئے ہیں۔ کوریں لیس دار ہیں۔ گوکھرو ٹکے ہیں۔ پاجامہ سرخ اطلس کا گھیردار ہے۔ علیٰ ہذا محرم ہے۔ پوشاک کا اصلی رنگ مرجھا چکا ہے۔ قیاساً کہا جاسکتا ہے کہ وہ استعمال شدہ ہے۔ انقلاب زمانہ دیکھیے۔ بیگم کی پوشاک اور لندن میں۔

برہما کی رانی کی خواب گاہ کا پلنگ بھی قابلِ لحاظ ہے۔ یہ پلنگ انگریزی کوچ سے زیادہ ملتا جلتا ہے۔ پائے ایک بالشت اونچے ہیں۔ پایوں کا وہ حصّہ جو زمین کو چھوتا ہے۔ پرند کے پنجوں کے مشابہ ہے۔ ٹیپوں اور پایوں پر سرخ و سفید اور سبز شیشے بڑی صفائی سے جڑے ہوئے ہیں۔ سونے کے پانی میں یہ ٹکڑے بھی عجیب بہار دیتے ہیں۔ یہ وہ پلنگ ہے جس پر شاہِ برہما کی رانی سوتی تھی۔

سلطان ٹیپو کی یہاں کئی یادگاریں ہیں۔ کوئی چیز اس قدر حیرت انگیز نہیں ہوگی جس قدر یہ چیزیں۔ اور جب ہم اس کے مقصدِ زندگی کا خیال بھی ذہن میں لاتے ہیں تو یہ چیزیں اور بھی دل کو گداز کرتی ہیں۔ یوں تو اس کا مزار ہندوستان میں ہے۔ لیکن یہ چیزیں بھی مزار سے کچھ کم نہیں۔ یا یہ کہیے وہاں ایک مزار ہے اور یہاں کئی مزار ہیں۔ اُس مزار میں اس کا جسم دفن ہے اور ان مزاروں میں وہ چیزیں دفن ہیں جو زندگی میں ان کے جزوِ بدن رہ چکی ہیں۔ اصلی مزار اس قدر پائدار نہ ہوگا جس قدر یہ مزار پائدار ہیں ؂

رہے گا کوئی تو تیغ ستم کے یادگاروں میں!

مرے لاشے کے ٹکڑے دفن کرنا سو مزاروں میں

ایک صندوق میں اس کی شمشیر ہے۔ میان گم ہے۔ یہ تلوار ایرانی ساخت کی ہے۔ بالکل ہلالی وضع ہے۔ قبضہ پر سونا چڑھا ہوا ہے۔ جس پر دمشقی کام ہے۔ جو ہندی ساخت کی تلواروں میں بہت نایاب ہے۔ قبضہ اور تلوار دونوں پرانے معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ قبضہ کا سونا اور بیل بوٹے دونوں مٹ چلے ہیں۔ قیاساً کہا جاسکتا ہے کہ یہ تلوار ٹیپو کے زمانے سے بھی پرانی ہے۔ تلوار پر سنہری حرفوں میں لکھا ہوا ہے "**ٹیپو سلطان**" یہ کام نیا ہے اور قبضے کے کام سے بعد کا۔ یہ وہ تلوار ہے جس کے زور سے سلطان ٹیپو ہندوستان کے وہ مردہ قوے زندہ کرنا چاہتا تھا جن کو حکمرانی کہا جاسکتا ہے اور کیا عجب ہے

یہی تلوار اس وقت اس کے ہاتھ میں ہو جب کہ وہ سرنگاپٹم کے دروازے پر زخموں سے چور نقشِ بیجان ہو کر گرا۔ میان کا گم ہونا ہمارے خیال کی تائید کر رہا ہے اور یہ نفی بھی ظاہر کر رہا ہے کہ وہ اس کے سلاح خانے سے انگریزوں کے ہاتھ نہیں لگی۔

ایک صندوق میں ٹیپو کا آہنی خود ہے۔ جس کے کناروں پر سونے کی بیل پھری ہے۔ لوہے کا بینی پناہ ہے جس کو کنڈے کے ذریعے اتارا چڑھایا جا سکتا ہے۔ بینی پناہ کے دونوں بازوؤں میں دو نلیاں ہیں۔ جن میں دو زرتار طرے اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔ خود کے وسط میں ایک شاخ نکلی ہے۔ دامن پر لوہے کی چادر جھالر کی طرح لٹک رہی ہے جس کو کڑیوں کے ذریعے سے خود کے ساتھ پیوست کیا ہے۔ یہ چادر چہرے کی طرف چار انگل چوڑی ہے۔ لیکن پشت اور بازوؤں پر اس قدر چوڑی ہے کہ گردن اور کندھوں کی حفاظت بخوبی ہو سکے۔ یہ خود ایرانی خودوں کی قطع سے زیادہ ملتا جلتا ہے۔ کام اس پر اس قدر عمدہ اور خوشنما نہیں کہ اسلامی خودوں میں بہتر کہلایا جا سکے۔ اسی میوزیم میں اس سے اچھے اچھے خود ہیں۔ لیکن ان کی تاریخ سے ہم ناواقف ہیں۔ برٹش میوزیم میں شاہ عباس صفوی کا ایک خود ہے جو تمام خودوں سے بہتر اور اعلیٰ ہے۔

ایک مقام پر ٹیپو کا ٹوپ ہے۔ چمڑے کے آستر پر ایک ایک انچ موٹی روئی کی تہ جمی ہوئی ہے جس پر چھینٹ کا آستر ہے۔ اس پر سبز اطلس منڈھی ہے۔

سبز مخمل کی آدھ آدھ انگل چوڑی گوٹ ہے۔ پہننے پر یہ ٹوپ آدھی پیشانی ڈھانپ لیتا ہے۔ گردن اور کندھوں کی طرف سے اس قدر نیچا ہے کہ گردن اور کندھوں کا بچاؤ ہو سکے۔ ٹوپ کے اندر فارسی میں کچھ تحریر ہے۔ لیکن پڑھا نہیں جاتا۔ انگریزی میں اس قدر بیان کیا ہے کہ یہ چیز زمزم کے مقدّس پانی سے دھوئی گئی ہے۔ اس لیے کوئی حربہ اثر نہیں کرے گا۔ اس عقیدے پر آج کی دنیا ہنسے گی۔ لیکن یہ یاد رہے کہ ٹیپو کا زمانہ اور تھا اور یہ زمانہ اور ہے۔ وہ زمانہ ایسا تھا کہ مسلمان مذہب کی روشنی میں آنکھ کھولتے تھے اور اسی روشنی میں آنکھ بند کرتے تھے۔

ایک خانے میں ٹیپو کے دستانے ہیں۔ کہنی سے لے کر کلائی کے قریب تک یک طرفی حفاظت کا کام دیتے ہیں۔ کلائی پر کفوں کی طرح دوہرے ہیں۔ دو طرفہ حفاظت مقصود ہے جو کڑیوں کے ذریعے سے کھولے اور بند کیے جا سکتے ہیں۔ اندر کی طرف تسمے اور گھنڈیاں ہیں جن کو پہننے پر کس دیا جاتا تھا۔ ان دستانوں پر سونے کا کام ہوا ہے اور دمشقی بیل بوٹے ہیں۔

اسی خانے میں ٹیپو کا سینہ بند ہے جس سے سینے اور پشت کی حفاظت مقصود ہے۔ سینے کی طرف سے کھلا ہوا ہے اور بٹنوں کی بجائے کڑیاں لگی ہوئی ہیں جو ریشمی تسمے کے ذریعے کس دی جاتی ہوں گی۔ یہ سینہ بند بھی ٹوپ کی طرح ایک انچ موٹا ہے اور شاید چمڑا ہو۔ باہر کا استر سبز اطلس کا ہے۔ جو

ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے۔

ٹیپو کا زین پوش۔ یہ زین پوش قرمزی مخمل کا ہے چار فٹ آٹھ انچ لمبا اور چار فٹ ساڑھے آٹھ انچ چوڑا ہے۔ مخمل پر نہایت اعلیٰ درجہ کا زریں کا کام ہوا ہے۔ یہ کام کسی استاد کے ہاتھ کا ہے۔ تمام میوزیم میں اس قدر صفائی کا نمونہ نہیں ملتا۔ بیل بوٹے اپنی وضع میں اعلیٰ درجہ کے ہیں اور جو نزاکت اور ستھرا پن کاریگر نے اس کام میں دکھایا ہے وہ لاجواب ہے۔ میوزیم نے چالیس پونڈ میں اس زین پوش کو خریدا ہے۔

ایک چھوٹی سی پیتل کی توپ ہے جو ڈیڑھ گز لمبی ہے۔ توپ کے منہ پر گینڈے کی شکل بنی ہوئی ہے۔ یہ توپ سرنگاپٹم سے انگریزوں کے ہاتھ لگی۔ یہ توپ بھی سلطان ممدوح کی یادگار ہے۔

یہاں عجیب قسم کا ساز ہے جو اپنی وضع میں اکیلا ہے۔ اس ارگن کی یہ شکل ہے کہ لکڑی کے ڈیڑھ گز لمبے اور پون گز چوڑے تختے پر ایک انگریز چت لیٹا ہے۔ جس پر ایک شیر سوار ہے۔ شیر کی دونوں ڈاڑھیں انگریز کی گردن میں گڑی ہوئی ہیں۔ اگلے پنجے سینے میں پیوست ہیں اور پچھلے پنجے زانوؤں میں ہیں۔ شیر کا جسم اندر سے خالی ہے۔ اس خالی مقام میں ایک کل رکھی ہوئی ہے۔ اس کل میں ہارمونیم کی طرح سے برابر قطار میں اٹھارہ پردے ہیں۔ پردوں پر تین تین انگل اونچی انگل انگل موٹی۔ اٹھارہ نلیاں دوہری قطار میں ہیں۔ جن پر تانبے کا دو انچ چوڑا

پردوں کے متوازی لگایا گیا ہے۔ پردوں کے اختتام پر ایک دندانے دار چکّر ہے جس کا تعلق ایک آہنی تار کے ذریعے باہر کے دستے سے ہے۔ دستہ شیر کے بازو پر باہر کی طرف بنا ہوا ہے۔ دستے کو گردش دینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اندر کا چکّر حرکت میں آتا ہے اور اس کا اثر تیلیوں اور پردوں پر پہنچتا ہے۔ شیر کی دُم پر دو مروڑیاں ہیں جن کے مروڑنے سے اندر کا تار گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ شیر کا جسم تختیوں کے ذریعے سے ڈھکا ہوا ہے۔ تختیاں اس قسم کی ہیں کہ ان کو کھولا اور بند کیا جا سکتا ہے۔ یہ ساز سلطان ٹیپو کی تفریح طبع کے لیے ایجاد کیا گیا تھا۔ عیّار موجد نے یہ کمال دکھایا کہ اپنی اختراع کے ساتھ سلطان کی ادا شناسی اور مزاج دانی کو بھی نباہ دیا۔ یہ آلہ ہم کہہ سکتے ہیں کسی ہندوستانی کے دماغ کا نتیجہ تھا۔ اس کو یورپین مصنوعات سے کوئی مشابہت نہیں۔ پردوں کا ڈھنگ ممکن ہے کہ ہارمونیم کے پردوں سے اُڑایا گیا ہو۔ اگر یہ ممکن ہے کہ اس وقت ہارمونیم ہندوستان میں رواج پا گیا تھا۔ ہارمونیم کے پردے طویل مربّع ہوتے ہیں۔ لیکن یہ پردے بالکل مدوّر ہیں۔ پھر اٹھارہ پردوں کا ہونا کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ سوال ہم ماہران فنِ موسیقی کے لیے چھوڑتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ایرانی موسیقی کے دوازدہ پردہ اور شش آہنگ کا مجموعہ ہو۔ سلطان ٹیپو کی ایرانی تمدّن سے محبّت اس کے ہر مذاق سے پائی جاتی ہے۔

اب ہم یہاں ایک تصویر کا ذکر کرتے ہیں جو اسی میوزیم کے کسی مقام پر

لٹک رہی ہے۔ یہ تصویر ایک پُرانے فیشن دار بزرگوار کی ہے۔ نئی نسلیں بسراپائے مقدس دیکھ کر ہنسیں گی۔ لیکن یہ ان کی زیادتی ہوگی۔ بزرگ ہر حال ہیں واجب التعظیم ہیں۔ ایک زرتار مسند پر ایک پُرانے بانکے بیٹھے ہیں۔ نشست کی قطع دو زانو ہے جو مغلیہ دربار کی خصوصیات سے ہے۔ سر پر تاج نما دندانہ دار ٹوپی ہے۔ اس پر ہلکا سا ٹپہ لپٹا ہوا ہے۔ جس پر موتیوں کی مالا بہار دکھا رہی ہے۔ پیشانی پر زرتار طرۂ اڑیسا ہوا ہے۔ پیشانی چوڑی، قد درمیانہ، رنگ گورا، ناک ستواں، ڈاڑھی شرعی، سر سے گردن تک لمبے بال ہیں۔ جیسا سندھ میں رواج ہے۔ گلے میں ایک چھوڑ تین ہار اور چوتھی ہیکل جواہرات کے جڑے ہوئے ہیں۔ بازو پر بازوبند کہیے یا تعویذ۔ آج کل دنیا میں اس قدر تعویذ پرست نہیں۔ لیکن وہ زمانہ اللہ والوں کا تھا۔ بہشتی بندے بستے تھے۔ تعویذ گنڈوں پر تو جان قربان تھی۔ حرز و ہیکل سے زندگی کا سہارا تھا۔ کلائی پر سونے کی زنجیر بندھی ہوئی ہے۔ سیدھے ہاتھ کی چوتھی اور پانچویں اُنگلی میں سونے کی انگوٹھیاں چمک رہی ہیں۔ اُلٹے ہاتھ کی مٹھی قریباً بند ہے۔ لیکن پانچویں انگلی سے باہر نکلی ہوئی ہے۔ جیسے کوئی دکھلائے کہ اس میں بھی انگوٹھی ہے۔ کمر میں پٹکا بندھا ہے۔ اس پر ڈھال کسی ہے اور تلوار بندھی ہے۔ زانو کے قریب ہی ایک توڑے دار بندوق پڑی ہوئی ہے۔ پشت پر میاں محمد بخش خدمت گار ہیں کہ بُت بنے کھڑے ہیں۔ ایک ہاتھ میں مورچھل ہے۔ کمر کسی ہے اور ڈھال تلوار بندھی ہے۔ قاضی جی کے چہیتے بھی سیلانے۔ یہ بھی اپنے آقا کی

طرح سپاہ گری کا دم بھرتے ہیں۔ خدمت گار ہیں تو کیا ہوا۔

زمانۂ گزشتہ کے طرز بود و باش کے اس نمونے پر ہم اس عجائب خانے کی سیر کو ختم کرتے ہیں۔ جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے اس کی دل چسپیوں کا اندازہ ہو سکتا ہے اور ناظرین یہ خیال کر سکتے ہیں کہ کتنی دفعہ جا کر گھنٹوں وہیں رہنے کے لیے سامان موجود ہے۔ ایک ایک چیز لامتناہی سلسلۂ خیالات چھیڑتی ہے۔ اور ایک ایک خیال گھڑیوں بے چین رکھتا ہے۔ دل میں، قوتِ احساس اور نگاہ میں شوقِ مشاہدہ درکار ہے۔

قصّۂ چہار درویش

کچھ عرصہ ہُوا حیدرآباد سے ایک استفسار قصّۂ چہار درویش کے سلسلے میں ہمارے نام موصول ہُوا تھا جس میں لکھا تھا کہ اس قصے کو عام طور پر حضرت امیر خسرو دہلوی کی تصنیف مانا جاتا ہے۔ اس عقیدے کی تائید میں کیا کوئی تاریخی بیان مل سکتا ہے۔ اس بارے میں تمھاری کیا رائے ہے؟

مجھ کو افسوس ہے کہ میں اپنے مشاغلِ ضروریہ سے عدم فرصت کی بنا پر اس وقت اس استفسار کا کوئی جواب نہیں دے سکا۔ جناب مستفسر سے میں اس تاخیر کی معافی مانگتا ہوں اور التماس کرتا ہوں کہ سطورِ ذیل اسی استفسار کا جواب تصوّر کیا جائے۔

چہار درویش ہمارے ملک کے مشہور افسانوں میں سے ہے۔ جس میں آزاد بخت پادشاہِ روم اور چار درویشوں کا قصّہ مع دیگر ذیلی کہانیوں کے ملتا ہے۔ موجودہ افسانوں میں اس کا پایہ نہایت بلند ہے اور الف لیلےٰ کے بعد

قصّہ حاتم طائی کے ساتھ بہترین افسانوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ یہ قصّہ ہمارے ہاں فارسی سے آیا ہے۔ سب سے پہلے محمد حسین۔ عطا خان تحسینؔ اس کو مکلّف اُردو میں لکھ کر نواب آصف الدولہ والیٔ اودھ کے نام پر معنون کرتے ہیں۔ ان کی تالیف کا نام نوطرز مرصّع ہے۔ اس کے بعد فورٹ ولیم کالج کے ایک انعامی اشتہار کی بنا پر میر امّن نے اس کو ٹھیٹ اُردو محاورہ میں لکھ کر بقائے دوام کا خلعت حاصل کیا۔ میر امّن کی یہ تالیف جس کا تاریخی نام "باغ و بہار" ہے۔ اُردو زبان کی زندہ جاوید مصنّفات میں شمار ہونے کے قابل ہے۔

یہ امر موجب دلچسپی ہے کہ میر امّن نے اس تالیف کے قبول کیے جانے کے بعد کالج کمیٹی کی خدمت میں ایک درخواست بغرضِ وصولی انعام بالفاظ ذیل دی تھی۔

عرضی میر امّن دلّی والے کی جو مدرسی کے مختار کار صاحبوں کے حضور میں دی گئی۔

صاحبان والا شان نجیبوں کے قدر دانوں کو خدا سلامت رکھے۔

اس بے وطن نے حکم اشتہار کا سن کر چار درویش کے قصّے کو ہزار جد و کد سے اُردوئے معلّےٰ کی زبان میں "باغ و بہار" بنایا۔ فضلِ الٰہی سے سب صاحبوں کی سیر کرنے کے باعث سرسبز ہوا۔ اب اُمیدوار ہوں کہ اس کا پھل

مجھے بھی ملے تو میرا غنچۂ دل مانند گل کے کھلے۔ بقول فردوسی کے شاہنامے میں کہا ہے۔

بسے رنج بردم دریں سال سی　　عجم زندہ کردم بہ ایں پارسی

سو اُردو کی آراستہ کر زبان　　کیا میں نے بنگالہ ہندوستان

خداوند آپ قدر دان ہیں۔ حاجت عرض کرنے کی نہیں۔ "الٰہی تارا اقبال کا چمکتا رہے۔"

مولانا عبدالحق صاحب ایڈیٹر رسالہ "اُردو" اورنگ آباد نے "باغ وبہار" پر جو محققانہ مضمون اپنے رسالے میں سپردِ قلم کیا ہے۔ اس کے ضمن میں فاضل مضمون نگار نے اس تالیف کے مآخذ کے ذکر میں ایسی بحث چھیڑی ہے، جس میں میرامّن کی دیانت اور راست بازی پر یقیناً حرف آتا ہے۔ یہ بیان چونکہ اُردو کے ممتاز اور مسلم الثبوت محقق کے قلم سے نکلا ہے، اس سے غلط فہمی پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ اس لیے ذیل میں اس معاملے پر کسی قدر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

مولانا فرماتے ہیں:۔ فارسی اور نوطرز مرصّع کے مطالعے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ باغ و بہار فارسی کتاب کا ترجمہ نہیں بلکہ اس کا ماخذ نوطرز مرصّع ہے۔ تعجب اس بات کا ہے کہ میرامّن نے فارسی کتاب اور اس کے ترجمے کا تو ذکر کیا مگر

نوطرز مرصّع کا ذکر صاف اُڑا گئے "۔

(رسالہ اُردو۔ جلد دہم حصہ، ۲۹ جولائی ۱۹۳۱ء صفحہ ۳۹۵)

اور اس دعوے کی تائید میں کہ "باغ و بہار" کسی فارسی ماخذ پر مبنی نہیں ہے۔ بلکہ نوطرز مرصّع پر، صفحہ ۳۹۵ سے لے کر صفحہ ۴۰۴ تک دونوں تالیفات کے مختلف مقامات سے اقتباسات نقل کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ایک اصل ہے اور ایک نقل۔

مولانا کے استدلال کو ہم تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں میر امّن پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ میر نے اپنے دیباچے میں نوطرز مرصّع کا بحیثیت ماخذ کوئی ذکر نہیں کیا۔ مگر اپنی تالیف کے سرورق پر صاف الفاظ میں اس کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ عبارت سرورق ملاحظہ ہو:۔

"باغ و بہار تالیف کیا ہُوا میر امّن دلی والے کا ماخذ اس کا نوطرز مرصّع کہ وہ ترجمہ کیا ہُوا عطا حسین خاں کا ہے فارسی قصّہ چہار درویش سے"

یہ عبارت "باغ و بہار" کی اشاعتِ اوّل پر درج تھی جو کلکتہ میں چھاپی گئی تھی۔

یہی نہیں بلکہ خود ڈاکٹر گلکرائسٹ جنہوں نے "باغ و بہار" کے واسطے فرمائش کی تھی۔ اسی اشاعت کے ساتھ اپنے انگریزی دیباچے میں اس طرح لکھتے ہیں:

"عطا حسین خان نے ابتداءً اصل فارسی سے اس کا ترجمہ شائع کیا۔ مگر

چونکہ اس کی زبان بوجہ کثرت تراکیب و محاورۂ فارسی و عربی مغلق اور قابلِ اعتراض مانی گئی تھی۔ اس لیے اس نقص کو رفع کرنے کی غرض سے کالج کے ملازمین میں سے میر امّن دہلوی نے مذکورۂ بالا ترجمہ سے موجودہ متن تیار کیا ہے۔"

یہ بیانات میر امّن کو ہر قسم کے الزام سے بری کر دیتے ہیں۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر امّن کے بعد ہندوستانی اہلِ مطالعہ نے سرورق کی عبارت کو حذف کر کے صرف کتاب کے نام پر قناعت کر لی ہے۔

فارسی میں چہار درویش کے قصّہ پر مختلف شخصوں نے قلم اٹھایا ہے۔ نثر کے علاوہ نظم میں بھی اس پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ اس کے مؤلفین میں سے صرف دو شخصوں کے نام ہم تک پہنچے ہیں۔

(۱) حکیم محمد علی المخاطب بہ معصوم علی خاں۔

(۲) انجب جس کا ذکر مصحفی نے اپنے تذکرے میں کیا ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ چہار درویش کم از کم اب تک تین منازلِ ارتقا ختم کر چکی ہے یعنی ابتدائی، درمیانی اور آخری۔ یہ قصّہ اپنی ابتدائی حالت میں نہایت سیدھی سادی اور روکھی پھیکی عبارت میں ملتا ہے، جس میں زبان آرائی اور رنگینی کی چاشنی قریب قریب مفقود ہے اور واقعات کی ترتیب بھی چنداں دلآویز نہیں ہے لیکن اپنے ارتقا کے آخری دور میں پہنچ کر حک و اصلاح و ترمیم و تنسیخ کے بعد گوناگوں

دلچسپیوں کا مرکز بن جاتا ہے اور زبان و بیان کے اعتبار سے شگفتہ اور خوش آیند معلوم ہوتا ہے۔ ہم اپنا تبصرہ اس آخری اصلاح یافتہ چہار درویش سے شروع کرتے ہیں جو ہمارے ملک میں بے حد مقبول ہے اور اردو ترجموں کا ماخذ ہونے کے علاوہ امیر خسرو سے بھی منسوب ہے اور متعدد بار طبع ہیں آچکا ہے۔

میر احمد خلف شاہ محمد نے اس کی ترتیب کی ہے اور قاضی محمد ابراہیم بن قاضی نور محمد نے چھاپا ہے۔ اسی کی ایک اور اشاعت کے ذمہ دار شیخ الٰہی بخش محمد جلال الدین تاجر کتب کشمیری بازار لاہور ہیں۔ یہی نسخہ باختلاف قلیل مطبع محمدی بمبئی نے ۱۳۱۸ھ میں طبع کیا ہے۔ اس میں تکملہ بختیار نامہ بھی شامل ہے اور میر احمد کا دیباچہ نکال دیا گیا ہے۔ اس کے دو سو چوہتر صفحات اور اکیس سطریں فی صفحہ ہے۔ اصل قصّہ صفحہ ۲۲۷ پر ختم ہوتا ہے۔ باقی ماندہ صفحات میں بختیار نامہ ہے۔

اس نسخہ میں قصّہ کی تالیف امیر خسرو کے نام سے منسوب کی گئی ہے۔ میر امّن نے بھی اس روایت کو قبول کیا ہے۔ اگرچہ میر محمد حسین عطا خاں نو طرز مرصّع میں اس کا کوئی ذکر نہیں کرتے جس سے ظاہر ہے کہ یہ روایت ان ایام میں اس قدر عالمگیر نہیں تھی۔ بہر حال روایت مذکور عبارت ذیل پر تعمیر پاتی ہے:

"باعث تصنیف ایں داستان از راز ترجمان اخبار پیشینیان باین نوع مفہوم گردید کہ بارے طبع مقدس جناب سالک مسالک طریقت و ناسک مناسک

شریعت قدوۃ العارفین و زبدۃ الصالحین حامی دین متین چراغ ہدایت شمع یقین
حضرت شیخ نظام الدین قدس سرہ العزیز بعارضہ علیل بودند حضرت امیر خسرو
دہلوی مدام ایں قصہ را زیب رقم فرمودہ بحضور پیر و مرشد خود مے خواندی تا آں کہ
حضرت موصوف غسل صحت فرمودند و ایں دعا مے نمودند کہ یارب ہر کس کہ ایں قصہ
را بخواند یا بشنود از علتِ امراض نجات یابد۔" صفحہ ۳-۴

اس عبارت سے مفہوم ہوتا ہے کہ اصل قصہ امیر خسرو کی تالیف ہے اور یہ مختصر دیباچہ مع حمد و نعت کسی نے بعد میں اضافہ کر دیا ہے۔ باوجودیکہ اس قصہ کے ایک سے زیادہ متن ہیں لیکن ان میں سے کسی ایک کی زبان بھی ایسی نہیں جسے امیر خسرو یا ان کے عہد کی زبان کہا جا سکے۔ امیر خسرو کی نثر کے نمونے کافی سے زیادہ ہمارے پاس موجود ہے۔ جن کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ حضرت امیر خسرو صنائع و بدائع۔ دقت پسندی اور پیرایۂ کلام کو پیچ دے کر دشوار فہم بنانے کے عادی تھے۔ لیکن یہ نسخہ نہایت سادہ و سلیس اور خوش مذاقی کی حد تک مقفیٰ و رنگین عبارت میں مرقوم ہے۔ اس کی املا و انشا و پیرایۂ بیان بالکل اسی اسلوب میں ہے جو ہمارے ہاں گزشتہ اور اس سے قبل کی صدی میں رائج تھا۔

چہار درویش کے جو قلمی نسخے ہم تک پہنچے ہیں ان میں قدیم ترین وہی ہیں جو بارھویں صدی ہجری کے مصنف تک ہمیں لے جاتے ہیں اس کے آگے ان کی سراغ رسی نہیں کی جا سکتی۔ نہ اس عہد سے پیشتر کوئی اہلِ قلم اس تالیف سے

آشنا معلوم ہوتا ہے۔ ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں جہاں اپنے عہد کے مروّجہ افسانوں کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً کلیلہ دومنہ۔ نل ومن، رامائن۔ رزم نامہ اور قصّۂ امیر حمزہ۔ ان میں چہار درویش کا نام نظر نہیں آتا۔

ادھر شیخ نظام الدین اولیا کے حالات و مقالات و ملفوظات پر متعدّد کتب و رسائل موجود ہیں جو خود اسی عہد کے مشاہیر نے مرتّب کیے ہیں۔ بعض کے نام یہاں درج کرتا ہوں:

(۱) فوائد الفواد، مرتّبہ حسن دہلوی سنجری

(۲) افضل الفوائد، مرتّبہ امیر خسرو دہلوی

(۳) انوار المجالس، از خواجہ محمد بن بدر الدین اسحاق

(۴) تحفۃ الابرار، از خواجہ عزیز الدین صوفی

(۵) سیر الاولیا، از سیّد محمد ابن سیّد مبارک کرمانی

ان ملفوظات و مؤلفات کے ذریعے سے تقریباً شیخ کی زندگی کے روزانہ حالات و واقعات پر اطلاع بہم پہنچ سکتی ہے۔ لیکن ان کتابوں میں چہار درویش اور اس کے سبب تالیف کا کوئی مذکور نہیں۔

اسی طرح امیر خسرو کے حالات و تصنیفات بالتفصیل معلوم ہیں۔ لیکن نہ مؤرخین نہ تذکرہ نگار اس نام کی کوئی تالیف ان کی تصنیفات میں شمار کرتے ہیں۔

جب ہم اصل قصّہ چہار درویش کی طرف رجوع کرتے ہیں تو اس میں متعدّد لیسے

وجوہ اور قرائن موجود پاتے ہیں جو ایک طرف امیر خسرو سے اس کے تعلق کی تردید اور دوسری طرف اس کے جدید الاصل ہونے کی تائید کرتے ہیں۔

اس نسخہ کو مختلف شعرا کے کلام سے موقع و محل کے مناسب ابیات لاکر آراستہ کیا گیا ہے۔ جس میں باستثناء بعض اکثر ایسے شعرا داخل ہیں جو امیر خسرو کے بعد کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً خواجہ حافظ جن کو کثرت کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔ صفحات ۹ - ۲۷ - ۵۳ - ۵۹ - ۷۲ - ۷۵ - ۹۲ - ۱۳۱ ، ۱۳۵ - ۱۹۵ - ۲۰۶ پر ان کے اشعار اور غزلیں ملتی ہیں۔ حافظ کے علاوہ فغانی کا یہ شعر منقول ہے ؎

سرو قدش کہ از چمن جاں برآمدہ
شاخ گلے بہ صورت انساں برآمدہ — صہ ۶۱

اور نظیری کا شعر ؎

محبت با دل غم دیدہ الفت بیشتر گیرد
چراغے را کہ دودے ہست در سر زود در گیرد — صفحہ ۶۸

غیرتی کی غزل کے تین بیت ؎

ز دیدہ قطرۂ اشکے رواں نمے آید
کہ یک دو لخت جگر درمیاں نمی آید — صفحہ ۴۳

عرفی کی غزل سے دو شعر ؎

دو عالم سوختن نیرنگ عشق است
شہادت ابتدائی جنگ عشق است صفحہ ۹۴

نشاپور کی غزل کے چار شعر ؎

مے نماید تپش دل رہ پرواز بمن
مے روم تا چہ کند نالۂ ناساز بمن صفحہ ۷۳

اور عرفیؒ کی غزل سے دو شعر ؎

کو بکو آں را کہ مے جستم بداماں یافتم
ہم چو صبح ایں دولت از چاک گریباں یافتم صفحہ ۷۷

حافظ کے بعد سب سے زیادہ شیخ سعدیؒ کے اشعار و اقوال ملتے ہیں:۔

صفحہ ۱۲ ؎

ابلے کہ روز روشن شمع کافوری نہد
زود باشد کش بہ شب روغن نہ بینی در چراغ

صفحہ ۱۳۱ ؎

مراد را رسد کبریا و منی
کہ ملکش قدیم است و ذاتش غنی

صفحہ ۱۴۹ ؎

در بیاباں خشک و ریگ رواں شلغم پختہ بہ کہ نقرۂ خام

صفحہ ۱۴۹ مصرع

تو خواہی از سخنم پند گیر و خواہ ملال

صفحہ ۱۵۸ ؎

درویش و غنی بندۂ ایں خاک در اند

آناں کہ غنی تر اند محتاج تر اند

صفحہ ۲۰۶ "دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز"

اب ہم بعض الفاظ کی شہادت پیش کرتے ہیں۔ جن کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ امیر خسرو کے عہد میں ان کا وجود نہ تھا۔

صفحہ ۲۴ "بہزار تومان خریدم"

صفحہ ۲۵ "دو سہ اشرفی بہ غلاماں تواضع کردم"

ہم نے صرف ان دو مثالوں پر قناعت کی ہے۔ ورنہ تومان اور اشرفی کا ذکر اس تالیف میں بہ کثرت موجود ہے۔ اوّل الذکر ایرانی اور آخر الذکر ہندوستانی سکّہ ہے۔ تومان اور اشرفی بحیثیت اصطلاح زر مروّجہ بالکل جدید الاستعمال ہیں۔ ساتھ ہی الفاظ آیندہ پر بھی غور ہو۔

صفحہ ۶۱ و ۱۰۰، تورچیان۔ صفحہ ۱۴۴، کشکچیاں۔ صفحہ ۱۶۸، کشک خانہ۔ صفحہ ۱۶۸، اشک آقایان؟ صفحہ ۱۵۵، وکیل السلطنہ۔ صفحہ ۲۳۵ خزانہ دار۔ صفحہ ۲۳۴، امیر آخورا۔ اب یہ تمام اصطلاحات ہندوستان میں مغلوں کی

آمد کے بعد رواج پاتی ہیں۔

اس تالیف میں دوربین کا بھی ذکر آتا ہے۔ خواجہ سنگ پرست اپنے اونچے محل کی چھت پر بیٹھا ہوا۔ زیرِ دامن صحرا و دریا کے نظارے میں مصروف ہے۔ دور میدان میں اسے دو صورتیں نظر آتی ہیں جنھیں وہ پہچان نہیں سکتا۔ دوربین منگوا کر دیکھتا ہے۔

"ناگاہ سیاہی دو نفر دیدم کہ در بیاباں مے آمدند۔ دوربین را طلبیدم و نیک ملاحظہ کردم۔" صفحہ ۱۴۵

اب دوربین یورپ میں بھی جو اس کا وطن ہے سترھویں صدی عیسوی میں رائج ہوتی ہے۔

مؤلف کئی موقعوں پر حضرت علیؓ کا ذکر کر رہا ہے۔ مگر ذیل کے مقامات سے واضح ہوتا ہے کہ وہ فرقہ اثنا عشری کا ایک رکن ہے۔

صفحہ ۱۰۲۔ "کیشم محبت دوازدہ امام است و ادائے صلوٰۃ و صیام۔"

صفحہ ۱۵۱۔ "و تو باید کہ بہ مصلحت وقت تقیہ کنی و بے مضائقہ بت را سجدہ کنی۔"

اب وہی نسخہ جو امیر خسرو کو اپنی تالیف کا ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ یہ شہادت بھی پیش کر رہا ہے کہ اس کا مؤلف شیعہ جماعت سے تعلق رکھتا ہے۔ اس صغریٰ و کبریٰ سے یہ نتیجہ نکلا کہ امیر خسرو شیعہ تھے۔ لیکن امیر ایسے پکے سُنّی ہیں کہ قاضی

نوراللہ جیسے شیعہ تراش بھی ان کو مجالس المومنین میں داخل کرنے کی جرأت نہیں کرسکے۔ حالانکہ وہ سنائی۔ عطار۔ مولانا روم۔ سعدی و حافظ جیسے سنیوں کی شیعیت کا فتویٰ دے چکے ہیں۔ چونکہ امیر خسرو کا تسنن یقینی ہے اور یہ کتاب شیعی جذبات و احساسات کی حامل ہے۔ اس لیے امیر کی تالیف نہیں مانی جا سکتی۔

یہ عقیدہ کہ یہ افسانے اصلاً ایران میں لکھے گئے ہیں یا ہندوستان میں، کتاب میں اس کے متعلق متضاد شہادت موجود ہے۔ مؤلف کا اکثر اوقات اپنے افراد کو "مرد عجمی" بیان کرنا۔ ان کے فارسی نام تو ہان کا استعمال اور ایرانی شہروں کا زیادہ ذکر دلالت کرتے ہیں کہ مؤلف ایرانی ہوگا۔ مگر ذیل کے امور سے خیال ہوتا ہے کہ وہ ہندوستانی ہے۔

صفحہ ۱۶۹۔ " حال ہم در ہند قاعدہ چناں است کہ ہر کس یک لک روپیہ دارد یک بیرق برسر دیوار خانہ مے بندد۔"

صفحہ ۱۸۲۔ " در بلادِ ہندوستان جزیرہ ایست خوش آب و ہوا یہ کیفیت و صفا مشہور۔ بہ جزیرۂ حکیم بداں اعتبار کہ جوگی دراں جزیرہ باغے ساختہ۔"

جنوں کے متعلق اس کا عقیدہ ہے کہ ان کے پاؤں بکری کے پاؤں سم کی طرح چرے ہوتے ہیں۔

صفحہ ۲۰۰۔ " اما پا یہائے ایشاں مانند گوسفند سم شگافتہ "

الفاظ روپال اور اشرفی کئی مقام پر اس تصنیف میں لائے گئے ہیں جو

استعمال ہند کے ذیل میں شمول ہیں۔

چار درویش میں روم۔ قسطنطنیہ۔ یمن۔ شام۔ بیت المقدس۔ بصرہ۔ بغداد۔ آذربائیجان۔ فارس۔ عجم۔ نیم روز۔ نیشاپور۔ ترکستان۔ بخارا۔ ہندوستان زیرباد اور بلاد فرنگ کا ذکر آتا ہے۔ مصنّف کی جغرافیائی معلومات جیساکہ افسانوں کا دستور ہے، ناقص ہے۔ زیرباد جس سے اس کی مراد ملک برما ہے۔ اس کے بیان کے مطابق فرنگستان کے قریب واقع ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے۔

"بہ شہرے رسیدیم کہ درمیانۂ فرنگ و زیرباد بود" (صفحہ ۱۲۰)

اسی طرح ایک آذربائیجانی نوجوان کے قصہ میں لکھا ہے کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ تجارت کی غرض سے ہندوستان آیا۔ یہاں سے باپ بیٹے زیرباد پہنچے۔ وہاں سے فارغ ہو کر فرنگ کے ارادے سے جہاز میں سوار ہو گئے۔ صفحہ ۱۳۶

ہم سوچتے ہیں کہ یہ کیسا برما ہے جہاں سے انسان براہِ راست فرنگ پہنچ جاتا ہے۔ اس فرنگ سے مصنّف کی مراد کہیں پرتگالیوں اور دیگر مغربی اقوام کے وہ مقبوضات تو نہیں جو گیارھویں بارھویں صدی ہجری میں جزائر شرق الہند اور ہند کی دیگر بندرگاہوں میں پھیلے ہوئے تھے۔

درویش اوّل یمن کا رہنے والا ہے۔ اس کی بہن روپیہ دے کر تجارت

کے لیے اسے ملک شام بھیجتی ہے۔ جب شام کے دارالخلافے میں پہنچ جاتا ہے شام کی شہزادی کو ایک صندوق میں زخمی اور بے ہوش پاتا ہے۔ علاج کے لیے جرّاح کو بلا کر لاتا ہے۔ جرّاح خیال کرتا ہے کہ خود درویش نے اس کو زخمی کیا ہے۔ کہتا ہے ظالم کہیں یوں گھائل کرتے ہیں۔ درویش معذرت میں کہتا ہے۔ "یہ عورت میری بہن ہے۔ ہمارا سارا کنبہ یمن سے جو ہمارا وطن ہے۔ بیت المقدّس کی زیارت کو نکلا۔ کل رات جنگل میں ہمارے قافلے پر قزاق آگرے۔ میرے خاندان کے تمام لوگ مارے گئے۔ صرف بہن بچی۔ اسے بھی بُری طرح گھائل کر گئے۔ میں اُٹھا لایا ہوں۔" (صفحہ ۱۹)

اب سوچنے کا مقام ہے کہ ایک شخص یمن سے بیت المقدّس کے ارادے سے چلتا ہے۔ اس کو شام کا دارالخلافہ (دمشق) جو بیت المقدس سے بھی شمال میں واقع ہے کیسے مل سکتا ہے۔

چہار درویش کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فرنگیوں کے ساتھ کثرت سے ارتباط و اختلاط کے تعلّقات دکھلائے گئے ہیں۔ دو قصوں میں وہ حصّہ لیتے ہیں۔ دربار روم میں ان کا سفیر وزیر روم کی جان بچاتا ہے۔

فرنگیوں کے متعلق مصنّف کی اطلاعات بعض صحیح اور بعض غلط ہیں۔

وہ نعمان سیّاح کو راہبوں کے لباس میں ملبوس بیان کرتا ہے۔ (صفحہ ۵۲)

اس کو معلوم ہے کہ فرنگیوں کے ہاں برہنہ سر ہو کر سلام کرنے کا دستور ہے۔

صفحہ ۵۴ - "سر برہنہ کردہ پیش رفتم وسلام گفتم ~
برہنہ پیش تو آیم برسم ُراہ فرنگی کہ من گدائے فرنگم تو بادشاہ فرنگی

وہ جانتا ہے کہ کتے ان کے ہاں نجس نہیں مانے جاتے۔

صفحہ ۹۶ - "سگ در ہمہ مذہب نجس است مگر بہ مذہب کفار فرنگ"

اسے علم ہے کہ شاہ روم کے ہاں فرنگی سفیر متعین ہے۔ وہ فرنگیوں میں کرسی کے رواج سے باخبر ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کتاب میں اکثر جگہ کرسی اور صندلی کا مذکور آتا ہے۔ بادشاہ، ملکہ، شہزادے اور شہزادیاں۔ افسر اور تاجر سب کے سب کرسیوں پر بیٹھے دکھائے گئے ہیں۔

امیر خسرو کے عہد میں فرنگیوں کے متعلق یہ اطلاع مشکل سے بہم پہنچ سکتی تھی۔ ہمارے نزدیک یہ امور اس تالیف کے جدید العہد ہونے کی دلیل ہیں۔

فرنگی ملکہ اور دیگر لوگ مسلمانوں کو "مسلمی" کے عجیب خطاب سے یاد کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں صفحہ ۵۷، ۵۹، ۶۱ و ۱۳۴

جہاں تک ان کی پرستش کا تعلق ہے، مؤلف کتاب ان میں اور ہندوؤں میں کوئی تمیز نہیں کرتا۔ ان کے عبادتی تذکرے میں اس نے بھول کر بھی حضرت عیسےٰ کا نام نہیں لیا ہے۔ چہ جائیکہ دیگر بزرگانِ دین سے واقف ہو۔ نہ وہ انھیں عیسائی اور نصارےٰ کے نام سے یاد کرتا۔ اس کے بیان کے مطابق ان کے عبادت خانے بت خانے کہلاتے ہیں۔ صفحہ ۱۴۲، ۱۴۳ و ۱۵۱۔ وہ بُت

بزرگ کو پوجتے ہیں۔ صفحہ ۱۲۶، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۹ و ۱۴۰۔ لات و منات بھی ان کی پرستش میں داخل ہیں۔ صفحہ ۱۳۹۔ ان کے پجاری کشیش اور برہمن کہلاتے ہیں۔ صفحہ ۱۳۹، ۱۵۲۔

ایک مادر ہومناں کا ذکر آتا ہے جس کی عمر ۱۱۸ سال ہے۔ دیارِ فرنگ میں یہ عورت نہایت مقبول و محبوب ہے۔ فرنگیوں کے ہاں ناقوس کا بھی رواج ہے۔ صفحہ ۱۴۱ و ۱۵۳

یہ بعض امور ہیں، جو اس کتاب کے سرسری مطالعہ کے وقت ہماری نظر سے گزرتے ہیں۔ ان میں اکثر و بیشتر ایسا مواد ہے جو کتاب کو امیر خسرو کے ساتھ وابستہ کرنے کے بجائے اس کے جدید العہد ہونے کی شہادت پیش کر رہا ہے۔

اب تک ہم نے چہار درویش کے ایسے نسخے کا مطالعہ کیا ہے جو اس فسانے کی تعمیر کی سب سے آخری اور ارتقا یافتہ کڑی ہے۔ اب ہم اس کی ابتدائی کڑی کا معائنہ شروع کرتے ہیں۔ جس چیز کو ہم ابتدائی کے نام سے تعبیر کرتے ہیں ایسی تالیف ہے جو دیگر مؤلفات کے مقابلے میں بہ لحاظ سادگی عبارت وادائے مضمون و اختصار پسندی یقیناً قدیم ہے۔ اس میں امیر خسرو کے ساتھ انتساب کا قصہ مذکور نہیں ہے۔ بلکہ مصنف کا دعوےٰ ہے کہ وہ اس کو زبانِ ہندی سے فارسی میں منتقل کر رہا ہے۔ خوش قسمتی سے ہم اس کتاب کے مصنف اور اس کے زمانۂ تالیف سے واقف ہیں۔

مصنف کا نام حکیم محمد علی الخاطب بہ معصوم علی خاں ہے۔ وہ محمد شاہ بادشاہ (۱۱۳۱ھ و ۱۱۶۱ھ) کے عہد میں گزرا ہے۔ آؤزلی اپنی فہرست میں اس کا نام محمد علی معصوم لکھتا ہے۔ (صفحہ ۱۴۷)

محمد علی کا بیان ہے کہ ایک روز میں نے محمد شاہ بادشاہ کی خدمت میں کسی تقریب پر درویشوں کی ایک کہانی بہ زبان ہندی سنائی۔ جسے اعلیٰ حضرت نے بے حد پسند کیا اور حکم دیا کہ اسے ہندی عبارت سے فارسی زبان میں ترجمہ کردو۔ تعمیل ارشاد عالی میں مَیں نے اسے فارسی زبان میں منتقل کردیا۔ یہاں مصنف کی اصل عبارت درج کی جاتی ہے۔

"دریں ایام کہ جہاں و جہانیان از ریزش سحاب عدل و کرم شاہنشاہی چوں روضۂ جنت و ساکنانِ فردوس خورم و مسرور مے باشند و بندگان درگاہ عرش اشتباہ۔ ملائک پناہش غبار آستان کیوان نشانش کحل الجواہر دیدۂ پرُ نور مے سازند یعنی حضرت خدیو جہاں کشائے عالمگیر اقلیم ستان جہانگیر۔ ملائک سپاہ۔ خلافت پناہ۔ نور پیشانیٔ صبح سعادت دعائے جوشن سازوئے شجاعت۔ ماحی اطوار جور و اعتساف بانیٔ آثار عدل و انصاف فرازندۂ تخت و تاج۔ معالج روزگار علیل مزاج سمی حضرت ختمی پناہ ظل اللہ طرازندۂ اورنگ جہاں بانی حضرت صاحبقران ثانی محمد شاہ دام دولتہ و قام لقایہ الیٰ یوم القیام۔ امابعد روزے ایں غلام مستہام در محفل اقدس و مجلس مقدس خسرو گردوں (پناہ)

حاضر و پروانہ آسا براں شمع خورشید نظر ناظر بود۔ بہ تقریبے حکایتے از دل ریشان درویشان و سرگزشتے از سرگزشتگان قلندران بہ زبانِ ہندی بعرض ہمایوں رسانید و آں حکایت مرغوب طبع و پسند خاطر مشکل پسند بادشاہ فیروز مند آمد بایں کمینہ یعنی حکیم محمد علی مخاطب بہ معصوم علی خاں فرمان فرمان فرمائے دل و جان صادر شد کہ آں را از عبارت ہندی بزبان فارسی ترجمہ نماید۔ بنا علیٰ ہذا اطاعت فرمان واجب الاذعان نمودہ آں حکایت را بالسطر بزبان عجمی نقل نمودہ۔ وہی ہذا؛"

تعجب ہے کہ حکیم محمد علی نے اس تالیف کا کوئی نام نہیں رکھا ہے لیکن اس کا جو مخطوطہ ہمارے زیر نظر ہے۔ خاتمہ میں عبدالکریم کاتب اس کو حکایات عجیب و غریب کے نام سے یاد کرتا ہے اور کوئی تعجب نہیں اگر ابتدا میں "چہار درویش" کا یہی نام ہو۔ خاتمہ کی عبارت ہے :-

"تمت حکایات عجیب و غریب بتاریخ ۱۴ شہر شوال ۱۵ سنہ محمد شاہی الراقمہ عبدالکریم ۵

"نوشتہ بماند سیہ بر سفید   نویسندہ را نیست فردا امید"

یہ نسخہ حجم میں مطبوعہ نسخے سے تقریباً نصف ہے۔ اس کے ایک سو تہتر صفحات اور فی صفحہ ۱۴ اسطریں ہیں۔ اگرچہ محمد علی کا یہ متن اس داستان کے اکثر مطالب و دیگر خط و خال تمام کمال پیش کر رہا ہے۔ تاہم طبع شدہ متن کے مقابلے میں

بہت مختصر ہے۔ نہ اس کی زبان میں وہ شگفتگی و برجستگی ہے جو مطبوعہ متن میں ملاحظہ کی جاتی ہے۔ عبارت اکثر مختصر سادہ اور عاری ہے۔ حسن بیان کی بجائے بیان واقعات پر توجہ مصروف ہے۔ داستانی واقعات کے سلسلے میں بعض موقعوں پر اس میں اور دوسری تالیفوں میں کسی قدر فرق ہے۔ لیکن قصۂ خواجہ سگ پرست میں یہ فرق بہت نمایاں ہو جاتا ہے۔ میں جزئی اختلاف کو ترک کر کے بعض صریح اختلافات کی چند مثالیں یہاں دیتا ہوں۔

(۱) ایک فرق تو یہ ہے کہ مطبوعہ نسخے میں دوسرے درویش کی کہانی کے بعد بادشاہ آزاد بخت خواجہ سگ پرست کی کہانی شروع کرتا ہے۔ محمد علی یہ کہانی تیسرے درویش کی کہانی کے بعد لاتا ہے۔

(۲) خواجہ سگ پرست روم کی وزیر زادی کے ساتھ جو مردانہ بھیس میں تھی قسطنطنیہ کے قریب پہنچ جاتا ہے اور شہر کے باہر خیمے لگا کر ٹھہر جاتا ہے۔ آزاد بخت کے دربار میں اس کی طلبی کے متعلق دونوں نسخوں میں فرق ہے۔ مطبوعہ نسخہ کا بیان ہے کہ قرادل شاہی کی معرفت اس کی آمد کی اطلاع دربار میں پہنچتی ہے۔

محمد علی کا بیان ہے کہ خود دختر وزیر اپنی ماں کو ترغیب دیتی ہے کہ خواجہ کو دربار میں بلایا جائے میں دونوں نسخوں کی اصل عبارت یہاں نقل کرتا ہوں۔

نسخۂ محمد علی

آں جوان عملی از خواجہ بیچارہ رخصت شدہ بہ شہر آمد و وقت شب داخل حرم خود شد۔ بخدمت مادر احوالِ خود خواجہ سگ پرست مفصل ظاہر کردہ گفت۔ دو روز دیگر مرا معاف دار تا پدرم را خلاص نمایم والے مادر مہربان بخدمت فرمان فرمائے معروض (دار) کہ بر صدق مقال پیر غلام حق تعالے کرم فرمودہ۔ ایں پیر کنیز امیدوار است کہ آں سوداگر سگ پرست را بامداد ان طلب داشتہ جواہر آویزاں گلوئے سگ ملاحظہ فرمایند و سرگزشت آں را تفحص نمایند و اگر تاجر در اظہار آں مضائقہ نماید آں جوان خوش ظاہر کہ ہمراہ اوست او را سزا دار قتل فرمایند۔ تا آں تاجر از خوفِ قتلِ آں سرگزشت سگ پرستی واضح سازد و پیر غلام را از زندان برآرند چوں ایں پیغام ترجمان وزیر رسید در طلب سوداگر حکم فرستادیم"۔ (ب ۴۸)

نسخہ مطبوعہ

از قضا یکے از میر شکاران بادشاہ کہ از شکار برگردیدہ بود۔ وقت عصر گزرش برآں مکان افتاد۔ خواجہ زادہ و سائر تجار از خواب چاشت بیدار شدہ و بیرون سراپردہ خواجہ برلب جوئے بر فراز صندلی ہا نشستہ صحبت میداشتند اورا تعجب مے آید کہ آیا ایشان کیانند۔ بادشاہ کسے را امر بہ سفر نہ فرمودہ وانیچی نیز بتازگی از طرفی نیامدہ۔ پس شاطر خود را بخبر گرفتن امر مے کند۔ شاطر چوں یکبار بہ اردوئے تجار مے رسد۔ خواجہ او را پیش مے طلبد و از احوال

مخدومش مے پرسد و چوں وجاہ و منزلت او مطلع مے گردد پیغام مے فرستد اگر شمارا از صحبت درویشاں ملالی نباشد. غریب نوازی فرمودہ منزل ما را منور نمایند و لمحہ بیاسایند و نیز بجہت اطلاع بر کماہی احوال ایشاں بداں صوب روانہ می شود و بعد از تکریم و تعظیم از جانبین بر فراز صندلی می نشینید و آں ہمہ اسباب و اثاثہ و خیل و خدم و خواص با آں مکنت و ثروت و خواجہ زادۂ آفتاب طلعت رامے بیند و برابر صندلی سگ و قفس ہائے مذکورہ را بنظر مے آورد ہوش از سرش بدر مے رود و خواجہ بعد از ادائے وظائف میزبانی چند جامہ و از متاع نفیس یاد تکلیف مے کند و بعد از تفتیش احوال خواجہ و نام و مقام او بشہر مے آید روز دیگر بدرگاہ ما حاضر مے شود. بجہت امرا حکایت می کند ہمگی از شنیدن او (کذا) متعجب شدند. چوں داخل بارگاہ گردیدند بغرض ما رسانیدند و خبث اطوار خواجہ بحدے گفتند کہ نائرہ غضب من شعلہ ور گردید و خبرم کردم کہ آں مرد از مشرکان است و سیاست او موجب حفظ ایمان است و تنبیہ سائر بے ادبان و چند از قورچیان پُر غضب را بحاضر ساختن سرا او و ضبط اموال او امر فرمودم. درویشان از قضا ہماں ایلچی فرنگ کہ دراں روز شفاعت وزیر نمودہ بود. چوں ایں حکم از من شنید بے اختیار فرد خندید و قہر بر من مستولی گردید بلی شعر ؎

خندہ کہ از دل نہ کشاید گرہ   گریہ ازاں خندہ بے وقت بہ

حاضر و پروانہ آسا براں شمع خورشید نظر ناظر بود۔ بہ تقریبے حکایتے از دل ریشان
درویشان و سرگزشتے از سرگزشتگان قلندران بہ زبانِ ہندی بعز عرض ہمایوں
رسانید و آں حکایت مرغوب طبع و پسند خاطر مشکل پسند بادشاہ فیروز مند آمد
بایں کمینہ یعنی حکیم محمد علی مخاطب بہ معصوم علی خاں فرمان فرمائے
دل وجان صادر شد کہ آں را از عبارت ہندی بزبان فارسی ترجمہ نماید۔ بنا ء علیٰ
ہذا اطاعت فرمان واجب الاذعان نمودہ آں حکایت را بالسطر بہ زبان عجمی
نقل نمودہ۔ وہی ہذا"۔

تعجب ہے کہ حکیم محمد علی نے اس تالیف کا کوئی نام نہیں رکھا ہے لیکن
اس کا جو مخطوطہ ہمارے زیرِ نظر ہے۔ خاتمہ میں عبدالکریم کاتب اس کو حکایات
عجیب و غریب کے نام سے یاد کرتا ہے اور کوئی تعجب نہیں اگر ابتدا میں
"چہار درویش" کا یہی نام ہو۔ خاتمہ کی عبارت ہے :۔

"تمت حکایات عجیب و غریب بتاریخ ۱۴ شہر شوال ۱۵ سنہ محمد شاہی الراقمہ
عبدالکریم ؎

"نوشتہ بماند سیہ بر سفید نویسندہ را نیست فردا امید"

یہ نسخہ حجم میں مطبوعہ نسخے سے تقریباً نصف ہے۔ اس کے ایک سو تہتر صفحات
اور فی صفحہ ۱۴ سطریں ہیں۔ اگرچہ محمد علی کا یہ متن اس داستان کے اکثر مطالب و
دیگر خط و خال تمام کمال پیش کر رہا ہے۔ تاہم طبع شدہ متن کے مقابلے میں

بہت مختصر ہے۔ نہ اس کی زبان میں وہ شگفتگی و برجستگی ہے جو مطبوعہ متن میں ملاحظہ کی جاتی ہے۔ عبارت اکثر مختصر سادہ اور عاری ہے۔ حسن بیان کی بجائے بیان واقعات پر توجہ مصروف ہے۔ داستانی واقعات کے سلسلے میں بعض موقعوں پر اس میں اور دوسری تالیفوں میں کسی قدر فرق ہے۔ لیکن قصۂ خواجہ سگ پرست میں یہ فرق بہت نمایاں ہو جاتا ہے۔ میں جزئی اختلاف کو ترک کر کے بعض صریح اختلافات کی چند مثالیں یہاں دیتا ہوں۔

(۱) ایک فرق تو یہ ہے کہ مطبوعہ نسخے میں دوسرے درویش کی کہانی کے بعد بادشاہ آزاد بخت خواجہ سگ پرست کی کہانی شروع کرتا ہے۔ محمد علی یہ کہانی تیسرے درویش کی کہانی کے بعد لاتا ہے۔

(۲) خواجہ سگ پرست روم کی وزیر زادی کے ساتھ جو مردانہ بھیس میں تھی قسطنطنیہ کے قریب پہنچ جاتا ہے اور شہر کے باہر خیمے لگا کر ٹھہر جاتا ہے۔ آزاد بخت کے دربار میں اس کی طلبی کے متعلق دونوں نسخوں میں فرق ہے۔ مطبوعہ نسخہ کا بیان ہے کہ قراول شاہی کی معرفت اس کی آمد کی اطلاع دربار میں پہنچتی ہے۔

محمد علی کا بیان ہے کہ خود دختر وزیر اپنی ماں کو ترغیب دیتی ہے کہ خواجہ کو دربار میں بلایا جائے میں دونوں نسخوں کی اصل عبارت یہاں نقل کرتا ہوں۔

نسخۂ محمد علی

آں جوان عملی از خواجہ بیچارہ رخصت شدہ بہ شہر آمد و والا وقت شب داخل حرم خود شد۔ بخدمت مادر احوالِ خود خواجہ سگ پرست مفصل ظاہر کرد و گفت ۔ دو روز دیگر مرا معاف دار تا پدرم را خلاص نمایم والے مادر مہربان بخدمت فرمان فرمائے معروض (دار) کہ بر صدق مقال پیر غلام حق تعالےٰ کرم فرمودہ۔ ایں پیر کنیز امیدوار است کہ آں سوداگر سگ پرست را بامداد ان طلب داشتہ جواہر آویزاں گلوئے سگ ملاحظہ فرمایند و سرگزشت آں را تفحص نمایند و اگر تاجر در اظہار آں مضائقہ نماید آں جوان خوش ظاہر کہ ہمراہ اوست او را سزا دار قتل فرمایند۔ تا آں تاجر از خوفِ قتل آں سرگزشت سگ پرستی واضح سازد و پیر غلام را از زندان بر آرند چوں ایں پیغام ترجمان وزیر رسید در طلب سوداگر حکم فرستادیم "۔ (۴۸ ب)

نسخہ مطبوعہ

از قضا یکے از میر شکاران بادشاہ کہ از شکار بر گردیدہ بود۔ وقت عصر گزرش بر آں مکان افتاد۔ خواجہ زادہ و سائر تجار از خواب چاشت بیدار شدہ و بر در سراپردہ خواجہ بر لب جوئی بر فراز صندلی ہا نشستہ صحبت میداشتند او را تعجب مے آید کہ آیا ایشان کیانند۔ بادشاہ کسے را امر بہ سفر نہ فرمودہ و اینجی نیز بتازگی از طرفی نیامدہ۔ پس شاطر خود را بخبر گرفتن امر مے کند۔ شاطر چوں یکبار بہ اردوئے تجار مے رسد۔ خواجہ او را پیش مے طلبد و از احوال

مخدومش مے پرسد و چوں وجاہ و منزلت او مطلع مے گردد پیغام مے فرستد
اگر شمارا از صحبت درویشاں ملالی نباشد۔ غریب نوازی فرمودہ منزل ما را
منور نمایند و لمحۂ بیا سایند او نیز بجہت اطلاع بر کماہی احوال ایشاں بداں صوب
روانہ می شود و بعد از تکریم و تعظیم از جانبین بر فراز صندلی می نشیند و آں
ہمہ اسباب و اثاثہ و خیل و خدم و خواص باآں مکنت و ثروت و خواجہ زادۂ
آفتاب طلعت را مے بیند و برابر صندلی سگ و قفس ہائے مذکورہ را بنظر مے
آورد ہوش از سرش بدر مے رود و خواجہ بعد از ادائے وظائف میزبانی چند جامہ
و از متاع نفیس یاد تکلیف مے کند و بعد از تفتیش احوال خواجہ و نام و مقام
او بشہر مے آید روز دیگر بدرگاہ ما حاضر مے شود۔ بجہت امرا حکایت می کند
ہمگی از شنیدن او (کذا) متعجب شدند۔ چوں داخل بارگاہ گردیدند بغرض ما
رسانیدند و خبث اطوار خواجہ بحدے گفتند کہ نائرہ غضب من شعلہ در گردید
و جزم کردم کہ آں مرد از مشرکان است و سیاست او موجب حفظ ایمان است
و تنبیہ سائر بے ادبان و چند از قورچیان پُر غضب را بحاضر ساختن سر او و ضبط
اموال او امر فرمودم۔ درویشان از قضا ہماں ایلچی فرنگ کہ دراں روز شفاعت
وزیر نمودہ بود۔ چوں ایں حکم از من شنید بے اختیار فرو خندید و قہر بر من مستولی
گردید بلی شعر ؎

خندہ کہ از دل نہ کشاید گرہ　　گریہ ازاں خندہ بے وقت بہ

گفتم اے مردک ناداں بچہ سبب خندیدی گفت شہر یار اخندۂ بندہ چند سبب دارد۔

اوّل آنکہ صدق قول وزیر صائب تدبیر در خدمت امیر کبیر ظاہر شد و آں مرد فقیر بے تقصیر از زندان خلاص خواہد یافت الحمد للّٰہ کہ بہ شفاعت ایں بے بضاعت دراں روز حضرت اعلیٰ بہ خون بے گناہی آلودہ نہ گردیدند۔

دیگر آں کہ شہریار جہاں بدون آنکہ مرد تاجر را بطلبند و از احوال او پرسند۔ بمجرد شنیدن حرفے از شخصے کہ بخواہش ہر چہ گوید حکم قتل فرمودن۔ نظم

گوش بر قول آں و ایں کردن رخنہ باشد بہ ملک و دین کردن

سخن مفسدان اگر شنوی جانب خلد بے گماں نہ روی

درویشاں چوں آں مرد نیک خواہ بدیں نکتہ مرا آگاہ ساخت دبیا وزیر انداخت فرمودم بردند۔ خواجہ را بالبسرش و آں دو نفر محبوس و آں سگ بیارند۔ حسب الامر قورچیان ہمہ را حاضر ساختند۔ صفحہ ۱۰۰ تا ۱۰۲"

(۳۱) ایک اختلاف اُس موقع پر نظر آتا ہے۔ جب خواجہ سگ پرست شہزادی فرنگ سے شادی کر کے ممالک فرنگ میں آباد اور شاہ بندر کے عہدے پر ممتاز ہے اور بھائیوں کو پنجروں میں قید کر چکا ہے۔ مطبوعہ نسخے میں ذیلی کہانی کے طور پر ایک آذربائجانی نوجوان کا قصّہ درج ہے۔ جو حسب ذیل ہے:۔

یہ نوجوان اپنے والد کے ساتھ تجارت کی غرض سے ہندوستان آتا ہے۔ وہاں سے زیر باد اور زیر باد سے بارادہ دیار فرنگ سفر دریا اختیار کرتا ہے۔ راستہ میں طوفان آتا ہے اور جہاز ڈوب جاتا ہے۔ ہمارا نوجوان ایک تختے کے سہارے ساحلِ دریا تک پہنچ جاتا ہے۔ کنارے پر اسے چنے کے کھیت نظر آتے ہیں جن میں سیاہ فام انسان آگ جلاکر ہولے کر رہے تھے۔ نوجوان نے بھی تھوڑے سے چنوں کے ہولے کیے۔ کچھ کھائے اور کچھ ساتھ لیے اور چل دیا۔ کئی دن کے سفر کے بعد ایک شہر میں پہنچا۔ وہاں کا دربان کوئی ایرانی تھا۔ اس نے اسے شہر میں جانے سے روکا اور سمجھایا کہ یہ شہر بڑا منحوس ہے۔ آدمی یہاں ہر وقت خطرے میں رہتا ہے۔ تم کسی اور شہر کو چلے جاؤ اور یہاں نہ رہو۔ نوجوان اس کی نصیحت نہیں سنتا۔ مجبور ہو کر وہ اسے اپنے بھائی کے پاس بھیج دیتا ہے۔ وہ بھی سمجھاتا ہے۔ مگر نوجوان شہر چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتا۔ آخر دخترِ وزیر سے اس کی شادی ہو جاتی ہے۔ ایک ہی سال کے اندر لڑکی کا انتقال ہو جاتا ہے۔ اس شہر کا دستور ہے کہ اگر خاوند مر جائے تو بیوی کو اور بیوی مر جائے تو خاوند کو چالیس روز کی خوراک دے کر ایک مقفل قلعہ نما چار دیواری میں جو درحقیقت مُردہ خانہ ہے۔ مُردے سمیت بند کر دیتے ہیں۔ نوجوان اس عمارت میں بیوی کی لاش کے ساتھ لایا جاتا ہے اور بند کر دیا جاتا ہے۔ جب اس کی خوراک ختم ہونے کے قریب پہنچتی ہے۔ عین اس وقت کسی اور شخص کا

مُردہ مع اس کے زندہ زوج کے مُردہ خلنے میں داخل ہوتا ہے۔ نوجوان اس زندہ کو قتل کر کے اس کی خوراک پر گزران کرتا ہے۔ اس طرح عرصہ تک زندہ رہتا ہے۔ حتیٰ کہ شہر کے وکیل السلطنت کا داماد انتقال کرتا ہے۔ اس کی لاش کے ساتھ وکیل السلطنت کی لڑکی گورستان میں لائی جاتی ہے۔ نوجوان اسے قتل نہیں کرتا اور اپنی بیوی بنالیتا ہے۔ اس سے اولاد ہوتی ہے۔ آخر مُردوں میں زندگی سے تنگ آکر پانی کی موہری کے راستے سے میاں بیوی باہر نکل جاتے ہیں۔ اور عام راستوں سے بچتے اور بنا بستی پر گزر اوقات کرتے۔ مہینہ بھر کے سفر کے بعد اس جنگل میں پہنچ جاتے ہیں جہاں سے خواجہ سگ پرست کا محل قریب رہ جاتا ہے خواجہ محل کی چھت سے انھیں دیکھتا ہے اور چونکہ پہچانے نہیں جاتے دُوربین سے دیکھتا ہے۔ دونوں کو عجیب وضع کا پاکر اپنے پاس بلوالیتا ہے۔ عورت کو اپنی بیوی کے پاس بھیج دیتا ہے اور مرد کو اپنے پاس بُلالیتا ہے۔ نوجوان اپنی رام کہانی سناتا ہے۔ خواجہ بڑی مہربانی سے پیش آتا ہے اور اسے اپنی سرکار کا ناظر مقرر کرتا ہے۔ جب وطن کا شوق گدگداتا ہے۔ خواجہ شاہ بندر کا منصب بادشاہ سے نوجوان کو دلا کر مع اپنے بھائیوں کے جو پنجروں میں مقید ہیں ایران پہنچ کر نیشا پور میں آباد ہو جاتا ہے۔

محمد علی کے ہاں آذربائیجانی نوجوان کا کوئی تذکرہ نہیں۔ اس کا قصّہ در حقیقت خواجہ سگ پرست کی اپنی سرگزشت کا ایک جزو ہے۔ یعنی جب خواجہ ممالک

فرنگ میں عہدۂ شاہ بندر پر فائز ہو کر شہزادی فرنگ کو اپنی بیوی بنا لیتا ہے۔ میاں بیوی ایک عرصے تک شادمانی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ مگر خواجہ کو اپنے بھائیوں کی فکر پریشان رکھتی ہے۔ تین سال کے بعد سوداگروں کا ایک قافلہ براہ دریا بندرگاہ میں آیا۔ اہلِ قافلہ نے خواجہ کی ضیافت کی۔ دعوت کے وقت اس نے دیکھا کہ اس کے دونوں بھائی قافلے میں موجود ہیں اور خدمتگاری کے کام پر متعین ہیں۔ خواجہ کو بڑا صدمہ ہوا۔ انھیں پھر گھر لے آیا اور ہر طرح سے ان کی دلجوئی اور ناز برداری میں مشغول رہا۔ شاہ فرنگ سے ان کو اپنے ہی دفتر میں عہدے دلوا دیئے اور ان کی ترقی میں ساعی رہا۔ لیکن بہ مصداق جبل گردد، جبلی برنہ گردد۔ یہ بدذات اپنی خباثت سے باز نہ آئے۔ ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ خواجہ کی بیوی باغ میں سیرِ دریا میں مصروف تھی۔ منجھلا بھائی اتفاقیہ دیکھ کر اس پر عاشق ہو گیا۔ دونوں بھائیوں میں صلاح ٹھہری کہ خواجہ کے خون سے ہاتھ رنگین کیے جائیں۔

ایک رات خواجہ نیند میں سو رہا تھا۔ دونوں موذی پہنچے۔ ایک خواجہ کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا۔ دوسرے نے پھندا گلے میں ڈال کر اسے فشار دیا۔ خواجہ سگ پرست بیہوش ہو گیا۔ کتا بھونکا اور ان ظالموں نے خواجہ کو اٹھا کر دریا میں پھینک دیا۔ جب خواجہ کو ہوش آیا دیکھا کہ دھوبی دریا کے کنارے اس کے منہ میں چاولوں کا پانی چوا رہے ہیں۔ شام کو اسے گھاس پر لٹا دیا گیا۔ صبح

جب اُٹھنے کے قابل ہوا اسے سامنے چنوں کے کھیت نظر آئے۔ جہاں سیاہ رنگ کے انسان کام کر رہے تھے۔ وہ اسے چنے دیتے ہیں۔ یہ ان چنوں کو پتھر پر پیس کر روٹی تیار کرتا ہے۔ جب یہ سیاہ فام وہ روٹی چکھتے ہیں، بڑے خوش ہوتے ہیں۔

اس کے بعد وہی واقعات دُہرائے جاتے ہیں جو ہم کو آذربائیجانی نوجوان کے قصّے میں اوپر دیکھ آئے ہیں۔ ان کو دُہرانے کی یہاں ضرورت نہیں۔ البتہ اتنا فرق ہے کہ ان مصائب میں کتّا خواجہ کا شریک رہتا ہے"

بالآخر ہم دیکھتے ہیں کہ خواجہ بیوی بچّوں اور کتّے سمیت پانی کی راہ سے مُردوں کے قلعے سے نکل کر جنگلوں میں چھپتا اور فاقے کرتا ایک شہر میں پہنچ جاتا ہے۔ کچھ دن کرایہ کے مکان میں رہ کر اپنی حالت درست کرتا ہے اور جواہرات بیچ کر ایک حویلی خرید لیتا ہے۔ دریا کے کنارے دُکان کھولتا ہے اور امیرانہ ٹھاٹ کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔ ایک روز صبح کے وقت وہ دریا کا نظارہ کر رہا تھا۔ دُور سے دو صورتیں نظر پڑیں۔ خیال پڑا کہ انھیں جانتا ہے۔ دُوربین منگوائی اور پہچان لیا کہ یہ وہی دونوں بھائی ہیں۔ سپاہی بھیج کر انھیں پکڑ بلوایا۔ جب پاس آئے بہت لعنت ملامت کی۔ دونوں اپنی حرکات پر نادم ہوئے، رونے لگے۔ آخر خون نے جوش مارا۔ خواجہ نے انھیں معاف کر دیا۔ حمام میں بھیجا۔ کپڑوں کے نئے جوڑے بھیجے۔ اپنے گھر کے پاس انھیں گھر

لے دیا اور خانہ داری کی ضرورت کا ہر قسم کا سامان ان کے ہاں بھجوا دیا۔ تین سال تک وہ خاموش رہے۔ آخر ان کے جرم و گناہ کی رگ جنبش میں آئی۔

خواجہ سگ پرست ایک دن کسی دوست کے ہاں مہمان گیا تھا۔ موقع تاڑ کر دونوں بھائی زنانے میں دَرّانہ گھس آئے۔ خواجہ کی بیوی انھیں دیکھ کر کوٹھڑی میں چھپ گئی اور اندر سے زنجیر لگا لی۔ ان خبیثوں نے بچوں کو پکڑ لیا۔ اور بچوں کی ماں سے کہنے لگے کہ اگر تو باہر نہیں آئی اور ہمارا کہنا نہیں مانا تو ہم ان بچوں کو قتل کر ڈالیں گے۔ عورت نے نہ مانا۔ ان پاجیوں نے بچوں کو قتل کر دیا۔ ماں نے جب بچوں کی یہ حالت دیکھی اپنا سر پتھر پر دے مارا اور مر گئی۔ اس اثنا میں خواجہ سگ پرست اپنے مکان پر پہنچا۔ اس نے غلاموں کو حکم دیا کہ انھیں گھیر کر گرفتار کر لو۔ ان کی سفّاکی اور غدّاری سے خواجہ کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ تاہم وہ ان کی خوں ریزی پر راضی نہ ہوا۔ آخر یہ تدبیر کی کہ دو پنجرے منگوائے اور ان پنجروں میں ان کو بند کر دیا۔

(۴) اسی قسم کا ایک فرق خواجہ سگ پرست کی کہانی میں اس موقع پر ملتا ہے۔ جب خواجہ کے بھائی خواجہ کو اپنا غلام ظاہر کر کے اس پر اپنے بھائی کے قتل کی تہمت لگاتے ہیں اور سو تومان حاکم کو رشوت میں دے کر پھانسی کا حکم حاصل کر لیتے ہیں۔

مطبوعہ نسخے میں آتا ہے کہ:۔ جب خواجہ کو پھانسی پر لٹکانے لگے خدا

کے حکم سے عین اسی گھڑی بادشاہ شہر کے قولنج کا درد شدت کے ساتھ اٹھا۔ ایک وزیر نے صلاح دی کہ درد کا یہی علاج ہے کہ صدقہ اور قربانی دی جائے اور قیدیوں کو رہا کیا جائے۔

شاہی ندیم بندیوں کو قید سے آزادی دلانے کے لیے روانہ ہو گیا۔ راستے میں خواجہ کو پھانسی دی جا رہی تھی۔ ندیم گھوڑا دوڑاتا بے تحاشا ہجوم میں گھس گیا اور تلوار سے پھانسی کی رسّی کاٹ دی۔ خواجہ سگ پرست کی جان بچ گئی لیکن اس کے بھائی دوبارہ حاکم کے پاس پہنچے اور اپنے مفروضہ بھائی کے خون کے طالب ہوئے۔

حاکم چونکہ رشوت کھا چکا تھا بولا۔ اب تو کھُلم کھُلا اس کا قتل مشکل ہے۔ مگر تمھاری خاطر سے یہ ہو سکتا ہے کہ اس کو زندان سلیمان میں ڈلوا دوں۔ جہاں وہ خود بخود بھوک پیاس سے ہلاک ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ جنھوں نے خواجہ کو پوشیدہ طور پر لے جا کر ایک کنوئیں میں جو زندان سلیمان کے نام سے موسوم تھا ڈال دیا۔

محمد علی اس موقع پر ایک فقیر کے ذکر اور خواجہ کے بھائیوں کی گرفتاری و رہائی کے بیان سے قصّہ میں جدید عنصر داخل کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

جب خواجہ کے گلے میں پھانسی ڈال دی گئی۔ قدرت الٰہی سے اسی وقت حاکم کے پیٹ میں قولنج کا درد اٹھا۔ ایک ندیم نے مشورہ دیا کہ اس درد سے

نجات کی یہی صورت ہے کہ قیدیوں کو آزاد کیا جائے۔ حاکم نے یہ مشورہ مان کر ایک مصاحب کو اس کام پر مقرر کر دیا۔ جس طرف خواجہ کو پھانسی دی جا رہی تھی مصاحب اسی طرف سے نکلا اور پھانسی کی رسی تلوار سے کاٹ دی۔ خواجہ خدا کا شکر بجا لایا اور شہر سے باہر نکل گیا۔ ایک گاؤں میں پہنچا۔ وہاں ایک فقیر سے ملاقات ہوئی۔ اس نے کھانا دیا۔ خواجہ نے پیٹ بھر کر کھایا اور کتّے کو بھی کھلایا۔ فقیر نے اس کی سرگزشت پوچھی۔ جو کچھ بیتی تھی کہہ سنائی۔ درویش افسوس کرتا رہا۔ اس اثنا میں ایک مرید نے دس تومان فقیر کے نذر کیے۔ یہ رقم لے کر اس نے خواجہ کو دے دی اور بولا اس رقم کو تجارت میں لگاؤ۔ اگر خدا توفیق دے میری رقم مجھے دے دینا۔ ورنہ خیر۔ میرا تم سے کوئی دعوےٰ نہیں۔ خواجہ فقیر کو دعائیں دے کر رخصت ہوا۔ خدا کے فضل سے تجارت میں اس قدر برکت ہوئی کہ جب سال بھر کے بعد خواجہ اسی گاؤں میں آیا۔ اس وقت چالیس زرّیں کمر غلام اس کی خدمت میں حاضر باش تھے۔ خواجہ آ کر فقیر سے ملا اور بولا کہ میں فلاں شخص ہوں اور تمھاری دعا سے اس رتبہ کو پہنچ گیا ہوں۔ یہ کہہ کر بہت سا روپیہ فقیر کی نذر کیا۔ مگر درویش نے کچھ نہیں لیا۔ چند روز فقیر کی خدمت میں رہا۔ پھر رخصت لے کر شہر میں گیا۔ لوگوں کا ہجوم دیکھا۔ سبب دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ دو چور حاکم شہر کے ہاں چوری کرنے گئے تھے، پکڑے گئے ہیں۔ ان کو سزا دی جانے والی ہے۔ خواجہ نے چوروں کو غور سے دیکھا اور پہچان لیا کہ اس کے اپنے بھائی ہیں۔ بھائیوں کے

درد سے بے تاب ہو گیا اور رقم کثیر حاکم کے ہاں بھر کر دونوں کو چھڑا لیا۔ گھر لے گیا۔ تین ماہ تک تینوں بھائی اس شہر میں مقیم رہے۔ اس کے بعد وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ایک اور شہر کے قریب پہنچے۔ قافلے نے پڑاؤ کیا۔ عصر کا وقت تھا۔ خواجہ کے بھائیوں نے تجویز کی۔ پیدل سیر کو نکلیں اور جنگل کی ہوا کھائیں۔ یہاں سے قریب ایک عمدہ شکارگاہ ہے جسے حاکم وقت نے تیار کیا ہے۔ ان کی خواہش کے مطابق خواجہ پیدل چل نکلا۔ کوس بھر زمین طے کی ہو گی۔ خواجہ نے سوال کیا کہ شکارگاہ کہاں ہے۔ بھائیوں نے جواب دیا ابھی اور آگے ہے۔ چلتے چلتے ایک کوئیں پر پہنچے۔ منجھلا بھائی کنوئیں پر کھڑا ہو گیا اور جھانک کر بولا۔ "بھئی واہ یہاں تو عجیب ہی تماشہ نظر آتا ہے" اس پر بڑے بھائی نے کنوئیں میں جھانکا اور اچنبھے کے ساتھ کہنے لگا۔ "میں نے عمر بھر ایسا تماشا نہیں دیکھا۔ خواجہ سگ پرست بھی بڑھا اور کنوئیں میں جھانکنے لگا۔ لیکن اندھیرے کے سوا اسے کچھ نظر نہ آیا۔ چاہتا تھا کہ منہ کھولے۔ اتنے میں منجھلے بھائی نے کمر پکڑ کر کنوئیں میں دھکا دے دیا۔ خواجہ کنوئیں میں گرا اور سخت چوٹ آئی۔ یہ وہ کنواں تھا جس میں ان لوگوں کو جھونک دیا جاتا تھا جن سے حاکم وقت ناخوش ہوتا تھا (ورق ۵۲ و ۵۳)

میں بخوف طوالت ان ہی مثالوں پر قناعت کرتا ہوں اور یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگرچہ اس وقت مجھ کو تفصیل میں جانا منظور نہیں ہے۔ تاہم اکثر ایسے موقعے ملتے ہیں۔ جن میں مطبوعہ نسخہ محمد علی کے نسخے سے مختلف ہے۔ لیکن یہ اختلاف

اس قسم کا ہے کہ یا پیرایۂ بیان کو پھیلا دیا گیا ہے یا عبارت میں اصلاح دے دی گئی ہے۔ چُست فقرے بڑھا دیئے گئے ہیں یا مختصر عبارت کو بعض حشویات کے ادخال سے جو نفسِ قصّہ پر اثر انداز نہیں طول دے دیا گیا ہے یا بیان واقعہ میں بہ نظر تہذیب و تزیین ضروری تبدیلی داخل کر دی گئی ہے۔ بیان غائبانہ کو بصیغۂ متکلم تبدیل کر دیا ہے۔ بعض موقعوں پر شخصوں اور شہروں کے نام کے اضافہ ہوئے ہیں اور مناسب موقع و محل اشعار داخل کیے گئے ہیں۔ باوجود اس قدر تبدیلیوں کے جن سے مطبوعہ نسخہ تقریباً المضاعف ہو گیا ہے دیکھا جاتا ہے کہ محمد علی کے اصل متن کے آثار طبع شدہ نسخے میں جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں۔ کہیں کم اور کہیں زیادہ نظر آتے ہیں۔ یہاں مقابلے کے لیے تمثیلاً کچھ عبارت دونوں نسخوں سے نقل کی جاتی ہے:-

نسخہ محمد علی

"علی الصباح مرا بحمام فرستادہ ولباسے فاخر پوشانیدہ بر مرکبے ہمراہ خود سوار کردہ رو بہ بت خانہ کردیم۔ خلق آں شہر از ہفت سالہ تا ہفتاد سالہ اعلیٰ وادنیٰ وداں جا حاضر شدند و دختراں خورشید سیما و پسرانِ خوش لقا صف زدہ سیر کناں رفتیم تا بجائے کہ فرمان فرمائے وامرا بخدمت بت سربکورنش وتسلیمات نہادہ من نیز بظاہر زمین بوسیدہ و دستِ برہمن و فرمان فرمائے را ہم بوسیدہ و دامن وے را (کذا) گرفتہ طلب دختر کردم۔ فرمان فرمائے ازاں مرد

پرسید کہ ایں کیست واز کجا آمدہ است۔ گفت از خویشان منست بہ امید زیارت بت بزرگ آمدہ والحال بر دختر وزیر مائل شدہ التماس وارد کہ بامر فرمان فرمائے در غلامی او را قبول کند۔ فرمان فرمائے فرمودہ حکم بت نافذ است۔ فی الحال برہمن رشتۂ سیاہی در گردن من کردہ مرا بپائے بت بزرگ آورد و سجدہ فرمود حرفے چند گفت۔ آوازے از جوف بت برآمد کہ خواجہ زادہ خوش آمدی۔ از مرحمت ما امیدوار باش۔ یک مرتبہ خلائق ہمہ بر خاک افتادند و بہ ترانۂ صدقنا صدقنا مترنم گشتند۔ فرمان فرمائے خلعت فاخر بمن پوشانید و حکم بہ نواختن نقار خانہ فرمود در افواہ عوام افتاد کہ عجمی را بت بزرگ نظر کردہ دختر وزیر را با او داد۔"

نسخۂ مطبوعہ

"چوں صبح نزدیک شد مرا بحمام فرستاد و لباس فاخرہ داد۔ چوں بخانہ آمدم آں مرد سوار شدہ و مرا نیز بر مرکبی نشانیدہ روانۂ بت خانہ شدیم و آں بت خانہ در کنار دریا واقع بود و بہ ترتیب و زینتے کہ زبان از شرح آں عاجز و قاصر است و خلق آں شہر از ہفت سالہ تا ہفتاد سالہ اعلیٰ و ادنےٰ دراں جا حاضر، ہمہ مستان و پائے کوبان۔ دختران خورشید سیما و پسران یوسف لقا در ہر طرف صف زدہ در سیر و صفا۔ بیت

گل رخاں جملہ در صفا و حضور
چشم بد از جمالِ نیکاں دور

سیر کناں رفتم۔ تا بجائے کہ بادشاہ و امرا بخدمت برہمن بدو زانوے ادب نشستہ بودند۔ سرہا برہنہ کردہ۔ گوش ہا بر آواز بت داشتند۔ من بموجب تعلیم کورنش و تسلیم نمودہ بت را بظاہر زمین بوسیدیم و دست برہمن و بادشاہ راہم بوسیدم و بعدۂ دامن وزیر را گرفتم و طلب دختر کردم۔ بادشاہ ازاں مرد پرسید کہ ایں کیست و از کجا آمدہ است۔ گفت از خویشانِ من است۔ باامید زیارت بت بزرگ آمدہ است و الحال دختر وزیر را دیدہ و مائل او گردیدہ۔ چوں بدیں در آمدہ التماس دارد کہ وزیر بامر بادشاہ بہ غلامی خود قبول کند۔ بادشاہ فرمود امر بُت بزرگ نافذ است۔ فی الحال برہمن رشتہ سیاہی در گردنِ من کردہ بپائے تخت بت بزرگ آوردہ سجدہ فرمود و حرفے چند گفت۔ آوازے از جوف بت بزرگ برآمد کہ خواجہ زادہ خوش آمدی۔ از رحمتِ ما امیدوار باش۔ ترنگ از خلائق برآمد تمامی بر خاک افتادہ صدق صدق گفتند۔ بارے بادشاہ مرا خلعت دادہ نقارخانہ را بنواختند و آواز بلند شد کہ عجمی را بت بزرگ نظر کردہ۔ دختر وزیر را باو دادہ"

(صفحہ ۱۵۲-۱۵۱)

ان اقتباسات میں اس قدر مماثلت و مشابہت کوئی توارد تو ہے نہیں یہی کہنا پڑتا ہے کہ مطبوعہ متن کا مالک محمد علی کے متن سے نہ صرف واقف ہے بلکہ اسی کی عمارت پر اس نے اپنی تعمیر کھڑی کی ہے۔ اس کے باوجود یہ بیان کہ جب نظام الدین اولیا کسی بیماری میں مبتلا ہوئے۔ امیر خسرو ان قصّوں کو رقم

کر کے اپنے پیر و مرشد کو سناتے رہے۔ جب آں حضرت نے غسلِ صحت فرما لیا اس وقت دعا کی کہ الٰہی جو شخص بھی ان قصّوں کو پڑھے یا سُنے وہ ہمیشہ بیماریوں سے مامون و مصئون رہے۔ محمد علی کے بیان کے سامنے کہ اس نے محمد شاہ بادشاہ کے حکم سے اس کتاب کا ہندی سے ترجمہ کیا ہے۔ کسی وقعت کا مستحق نہیں۔ اس روایت سے نہ صرف محمد علی ناواقف ہے بلکہ محمد حسین عطا خاں تحسین بھی اس سے بے خبر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت سب سے پہلے طبع شدہ فارسی نسخہ سے شروع ہوئی اور میر امّن نے اس سے نقل کی۔ "باغ و بہار" کے بیان نے اس کو شہرت دے دی۔ بحالیکہ اس کی صحت کے حق میں کسی کی دلیل بھی باوجود تلاش نہیں ملتی۔ مسلمانوں میں قصّوں اور افسانوں کے متعلق ہر زمانہ میں تعصب رہا ہے۔ علمائے کرام مخربِ اخلاق قصّوں کے ہمیشہ مخالف رہے ہیں۔ فسانۂ وامق و عذرا اور ویس و رامین اسی بناء پر ممنوع تھے۔ اس لیے کوئی تعجب نہیں اگر امیر خسرو کو اس کا مصنّف بنا کر اور نظام الدین اولیا سے تبریک دلوا کر مرتب قصّہ نے اس کو مقبولِ عام بنانے کی غرض سے دروغ مصلحت آمیز والا حیلہ تراشا ہو۔ نیم مذہبی قصّوں میں مصنّفین قاری و سامع کو ثوابِ دارین کی بشارت اکثر دیا کرتے ہیں۔

مُلّا دوپیازہ اور جعفر زٹلی کی مروّجہ سوانح عمریوں کا جائزہ اور تنقید

اُردو ادب میں ایک یہ رجحان پیدا ہوتا چلا آرہا ہے کہ تاریخی اشخاص کے حالات کی جستجو کے وقت ان کی صحیح تاریخ کے فقدان کی حالت میں بعض اہلِ قلم دنیا کے سامنے ان کی خیالی اور فرضی سوانح عمری پیش کردیتے ہیں۔ تاریخ اور افسانہ میں صرف ایک قدم کا فرق ہے۔ یعنی یہی کہ پہلا حقیقی واقعات سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا خیالی باتوں کو حقیقت کا رنگ دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص ان میں تخلیط پیدا کردے تو یہ بڑا ظلم ہے۔ اور ہر حال میں طشت از بام کیے جانے کا مستحق ہے۔ یہ بڑی بے اصولی ہے کہ ایک مصنّف قارئین کے ساتھ اپنے فرائض کو پسِ پشت ڈال کر ان کو ادبی دھوکے میں رکھے اور فرضی حالات کے قصر ان کے مطالعہ کے واسطے کھڑے کردے

ایسی خدا‌ئیاں ہر زبان و ادب میں ہوا کرتی ہیں اور اُردو اس بارے میں استثنا پیش نہیں کرتی بلکہ قاعدہ۔

ہم اپنے وقت کو محدود سمجھتے ہوئے صرف دو شخصوں کے حالات سے تعلق رکھیں گے۔ ان اشخاص سے ہمارا مقصد مُلّا دو پیازہ اور جعفر زٹلی ہیں۔ جن کا ہم علیحدہ علیحدہ تذکرہ کرتے ہیں۔

(۱) مُلّا دو پیازہ

دو پیازہ ایک تاریخی شخص ہے۔ جو اپنی ظرافت کے لیے مشہور ہے۔ جس طرح جوحی عربی میں اور عبید زاکانی فارسی میں۔ اس کے متعلق گزشتہ چالیس پچاس سال میں کافی لٹریچر جمع ہو گیا ہے۔ اور مختلف اشخاص نے اس کے سوانح پر قلم اٹھایا ہے۔ ان میں سے میں ان تالیفات کا ذکر کرتا ہوں۔ جن کا مجھے پتہ لگ سکا ہے۔

(۱) سوانحعمری مُلّا دو پیازہ از ہندوستانی سپیکولیٹر طبع اوّل ۱۸۹۰ء

(۲) سوانحعمری مُلّا دو پیازہ از ہندوستانی سپیکولیٹر باخذ حق تصنیف فضل الدین تاجر کتب قومی لاہور بازار کشمیری نے ۱۸۹۱ء لاہور کے اسلامیہ پریس میں چھپوائی۔ طبع ثانی۔ قیمت فی جلد ۲ر۔ ۳۲ صفحات۔

(۲ب) سوانحعمری مُلّا دو پیازہ از ہندوستانی سپیکولیٹر باخذ حقوق تصنیف

خاکسار فضل الدین تاجر کتب قومی و مالک اخبار اشاعت لاہور بازار کشمیری نے ۱۸۹۳ء۔ لاہور کے رحمانی پریس میں چھپوایا۔ تیسری دفعہ۔ قیمت فی جلد ۲ ؍

(۳) سوانح عمری مُلّا دو پیازہ از ہندوستانی سپیکو لیٹر۔ ملک فضل الدین، ملک چنن الدین، ملک تاج الدین ککے زئی تاجر کتب بازار کشمیری لاہور نے نول کشور گیس پرنٹنگ ورکس لاہور میں طبع کرائی۔ دفعہ پنجم قیمت فی جلد ۲ ؍ (دو آنے) کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸۹۰ء سے ۱۹۲۰ء تک یہ تالیف پانچ مرتبہ چھپ چکی ہے۔

(۴) دو پیازہ از منشی محمد الدین فوقؔ بار اوّل ۱۹۰۲ء میں۔

(۵) مُلّا دو پیازہ یا ابو الظرفا ملّا دو پیازہ کے حالاتِ زندگی مصنّفہ منشی محمد الدین صاحب فوقؔ بار دوم در ۱۹۰۵ء حافظ آبادی پریس لاہور (ناول ایجنسی لاہور کی تاریخی کتب کے سلسلہ میں ۹ ۔۷) قیمت ۶ ؍

(۵ ب) ابو الحسن مُلّا دو پیازہ کی سوانح عمری مرتبہٗ منشی محمد الدین صاحب فوقؔ جس کو شائقین کی تفریح طبع کے لیے بہ اجازت مصنّف منشی رام اگروال تاجر کتب مہتمم تعلیمی کتب خانہ پنجاب و پروپرائٹر اردو اخبار انار کلی لاہور نے فیض عام پریس لاہور میں طبع کرایا۔ بار سوم قیمت ۸ ؍

(آٹھ آنے) تاریخ ندارد۔ مگر مالک کتاب نے سُرخ سیاہی میں اپنا نام
عزیزالدین احمد بی۔ او۔ ایل۔ امرتسری اور تاریخ ۲۳-۱۲-۳ درج
کی ہے۔

(۶) ابوالحسن دوپیازہ از منشی موصوف قیمت ۴ر۔ الناظر چوک لکھنؤ

(۷) ابوالحسن ملا دوپیازہ از منشی موصوف قیمت ۴ر۔ الناظر بکڈپو۔ علی گڑھ

(۸) ملا دوپیازہ قیمت ۴ر طبع رامد تامل و محمد علی تاجر کتب۔ لوہاری دروازہ
لاہور۔ ۱۹۰۵ء سے قبل کی طبع شدہ

(۹) سرگزشت مُلّا دوپیازہ۔ منیجر کریمی لائبریری۔ انجمن اسلام۔ بمبئی۔

(۱۰) سرگزشت مُلّا دوپیازہ۔ حسب خواہش میاں قاضی نور محمد ابن قاضی
عبدالکریم تاجر کتب۔ مطبع نامی کریمی واقع بمبئی (بہ اضافہ ملا صاحب
کی قیافہ شناسی) ۱۳۳۳ھ۔

(۱۱) سوانح عمری مُلّا دوپیازہ۔ قیمت ۲ر۔ منیجر تاریخی کتب خانہ لاہور

(۱۲) سوانح عمری مُلّا دوپیازہ با تصویر از ایس احمد علی چشتی حسب فرمائش
شیخ گلزار محمد۔ ۳۲ صفحات۔ قیمت ۲ر

ہ ص ۲۵۳ ، ؎ الفہرست محمد سجاد مرزا بیگ ص ۵ ایضاً ص ۲۵۸ ، ص ۴۷ ، ص ایضاً
ص ۲۶۲ ، ص ۸۱ ، ص ایضاً ص ۲۷۰ ، ص ۱۳۳ ، ص ایضاً ص ۳۱۱ ، ص ۴۹۶ ،

مُلّا دوپیازہ کو بیربل کا حریف اور مدِ مقابل مانا گیا ہے۔ اس بنا پر کئی لوگوں نے دونوں کے حالات پر یک جائی قلم اٹھایا ہے۔ اس لیے میں بعض ایسی مصنفات کی فہرست بھی یہاں درج کیے دیتا ہوں:-

(۱۴) لطائف الشاکری المعروف بہ جواب و سوال مُلّا و بیربل از علاء الدین عرف اللہ دیا متخلص بہ شاکر رئیس میرٹھ، چمن ہند میرٹھ۔

(۱۵) سوانح عمری بیربل و مُلّا دوپیازہ۔ منیجر تاریخی کتب خانہ لاہور۔ قیمت ۱۲؍ عــہ ۵

(۱۶) سوانح عمری مُلّا دوپیازہ و بیربر۔ کرزن گزٹ۔ دہلی۔ قیمت ۴؍

(۱۷) سوال و جواب مُلّا و بیربل حصہ اوّل از منشی عبدالعزیز خاں منیجر کریمی لائبریری

(۱۸) " " " " " " دوم " " " "

(۱۹) " " " " " " سوم " " " "

(۲۰) " " " " " " چہارم " " " "

(۲۱) سوانح عمری بیربل وہ مُلّا دوپیازہ۔ حسب الایمائے منشی بلاقی داس اہالیان مطبع نے کتبِ انگریزی و اردو و فارسی سے انتخاب اور ترجمہ کر کے تالیف کیا۔ میور پریس دہلی واقع پیپل مہادیو۔

(۲۲) لطائف بیربل و مُلّاں دوپیازہ مکمل ہر چہار حصہ۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز تاجرانِ کتب و پبلشرز کشمیری بازار لاہور نے اپنے مطبع علمی پرنٹنگ پریس لاہور میں چھاپا۔

عــہ ۵ الفہرست محمد سجاد مرزا بیگ ص ۲۵۹، ۵۶،

اسی طرح بیربر کے حالات میں بھی مُلّا صاحب کا تذکرہ بسلسلۂ لطائف آجاتا ہے۔ اِس لیے ایسی تصانیف بھی اس فہرست میں شمار ہونے کے قابل ہیں۔

(۲۳) سوانح عمری راجہ بیربل مصنّفہ منشی ہادی حسین صاحب ہادی بنارسی جس کو پیارے بابو لال بھارگو مینجر سلیمانی پریس بنارس نے مطبع سلیمانی محلہ کاٹ گھاٹ شہر بنارس میں چھپوا کے شائع کیا۔ ۱۹۲۴ء

(۲۴) حیاتِ بیربر مصنفہ ایم عبدالعلی برلاس۔ خادم التعلیم پنجاب لاہور۔ باراوّل ۱۹۱۰ء۔ قیمت ۷ر

یہ مصنّف رسالہ ہذا کے صفحہ ۴۰ پر" عالی جناب ابوالمذاق سرتاج ظرفا ابوالحسن مُلّا دوپیازہ" کے مختصر حالات دیتا ہوا کہتا ہے کہ ہم مُلّا صاحب کی صرف الف با ناظرین کو سنائیں گے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر تا ثا جا تک نہیں لکھیں گے۔ وہ اس کے پورے نظارے کے مشتاق ہوں گے تو ان کے واسطے علیحدہ فوٹو جو ہمارا اپنا لکھا ہوا ہے موجود ہے۔ دیکھ لیں گے۔ اس سے ظاہر ہے کہ عبدالعلی برلاس نے ایک علیحدہ رسالہ مُلّا دوپیازہ کے حالات میں سپردِ قلم کیا ہے۔ جس کو ہم (۲۵) شمار کرتے ہیں۔

(۲۶) سوانح عمری راجہ بیربر مصنّفہ مرزا محمد الدین موج خلف الصدق شمس العلما حکیم سلطان علی۔ حسب فرمائش شیخ گلزار محمد احمد علی تاجرانِ کتب

مطبع گلزار محمدی لاہور۔ کشمیری بازار۔ بار چہارم۔ قیمت ۴ر۔

(۲۷) لطائف بیربل حصہ اوّل۔ حسب فرمائش جناب محمد اسمٰعیل صاحب تاجر کتب لاہور۔ بنگلہ ایوب شاہ صاحب مطبع الوالعلائی آگرہ۔ صفحات ۲۸۔

(۲۸) لطائف بیربل حصہ دوم در مطبع کاشی پریس آگرہ طبع شدہ۔ قیمت ۲ر دونوں حصّوں میں مُلّا کے لطیفے بھی شامل ہیں۔

(۲۹) عقل کی کان چٹکلوں کی جان معروف بہ سوانح عمری مُلاں دوپیازہ و بیربل از تصانیف آغا محمد طاہر۔ بنیرۂ حضرت محمد حسین آزاد۔ ملنے کا پتہ۔ میراںبخش اینڈ سنز۔ تاجرانِ کتب کشمیری بازار لاہور۔ صفحات ۷۴ قیمت ۴ر

یہ مصنّفین جن میں سے اکثر کے نام ہمیں معلوم نہیں۔ اپنی اپنی باری میں ایک دوسرے سے نقل کر رہے ہیں۔ اور سوائے جزویات کے روایتی واقعات کے بیان کرنے میں بہت کم اختلاف کرتے ہیں۔ ان میں سب سے قدیم ہندوستانی سپیکولیٹر ہے۔ جس کی سوانح عمری مُلّا دوپیازہ ۱۸۹۰ء میں شائع ہوئی اور اس کی طبع ثانی ۱۸۹۱ء میں جیسا کہ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں، اشاعت پاتی ہے۔ یہ کتاب بعد کے اہلِ قلم کے لیے ایک ضروری ماخذ اور ذریعۂ اطلاع ہے۔ جس میں گویا دوپیازہ کے متعلق تمام روایات کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ پچھلے اہلِ قلم انہی اطلاعات کو دُہراتے رہے ہیں۔ ہندوستانی

سپیکولیٹر جو دیگر تصنیفات میں 'محمد کامل' اپنا نام اختیار کرلیتا ہے۔ دیباچہ میں رقم طراز ہے:۔

"ملا دوپیازہ جس کی سوانح عمری ہم لکھنا چاہتے ہیں۔ ایک ایسا شخص ہے جس کا کسی تاریخ میں حال نہیں پایا جاتا۔ وہ کسی فوج کا کمانڈر نہ تھا۔ وہ کوئی بہادر سپاہی نہ تھا۔ وہ کسی بادشاہ کا وزیر نہ تھا۔ وہ کسی شاہنشاہ کا پیر نہ تھا۔ غرض یہ کہ وہ کسی ایسے عہدے پر ممتاز نہ تھا جس کے سبب سے اس کا حال ہم کسی تاریخ میں دیکھ سکیں۔ وہ اپنی لطیفہ گوئی اور تمسخر کے سبب سے مشہور تھا۔ اس کا چرچا جس قدر تھا یا تو نغز گوئی اور مسخروں میں تھا یا ایسے لوگوں میں تھا جو اس قسم کے آدمیوں کو پسند کرتے ہیں۔ اب ناظرین کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ ایسے شخص کی سوانح عمری لکھنی کس قدر دشوار ہے۔ ہم نے اس کا حال کچھ عربی اور کچھ فارسی کتابوں سے لیا ہے اور کچھ اس کے مقلدوں سے پوچھ کر لکھا ہے حقیقت یہ ہے کہ اس کا حال لکھنے میں ہم نے بہت تکلیف اور خرچ گوارا کیا ہے۔ اور اس کا صلہ ہم صرف پبلک پر چھوڑتے ہیں" (ص۲ طبع ثانی ۱۸۹۱ء)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دوپیازہ کی زندگی کے ضروری خط و خال میں اپنے سامعین کی آگاہی کے واسطے ہندوستانی سپیکولیٹر کی تالیف سے مختصراً یہاں عرض کردوں۔ اس کا بیان ہے:۔

"ملا عرب کے شہر طائف میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ ابوالمحاسن تقریباً

نو برس کا تھا جب اس کا باپ ابوالمکارم خدا گنج کو سدھارا۔ متوفی روپیہ والا آدمی تھا۔ مگر اس کی جائداد جو جس کے ہاتھ لگی دبا بیٹھا۔ اور اس کی بیوہ کے پاس صرف ایک مکان رہ گیا۔ ابوالمحاسن جب بیس برس کا ہوُا۔ قبیلہ فاروقی کے ایک سردار عبدالجبّار کی بیٹی سراج النسار سے اس کی شادی ہوگئی۔ جو معقول جہیز اپنے ساتھ لائی۔ شادی سے چھ ماہ پانچ روز بعد ابوالمحاسن کی والدہ نے انتقال کیا۔ اب ابوالمحاسن نے بیوی کے مشورے سے تجارت کی۔ ایک دُکان کھول لی۔ دُکان کا حساب سراج النسار خود لکھا کرتی۔ اس کی محنت اور نیک نیتی سے تجارت دن بدن چمکنے لگی۔ شادی کے تین سال بعد ان کے ایک چاند سا بچہ پیدا ہوُا۔ محلّہ کی مسجد کے امام کی رائے سے اس کا نام ابوالحسن رکھا۔ جب وہ چھٹے برس میں لگا۔ باپ نے اسے محلّے کے مکتب میں داخل کر دیا۔ مکتب کے معلّم ایک بزرگ عبدالرحمٰن نامی تھے۔ جن کی عمر پچاس برس کی تھی۔ ابوالحسن خوشی خوشی مکتب جاتا اور لکھتا پڑھتا۔ ساتھ ہی اس کو تمسخر کی لت تھی۔ کبھی زید کی جوتی چھپاتا اور کبھی عمر کی ٹوپی۔

ایک دن بچّے اپنے اپنے گھر کھانا کھانے گئے تھے۔ ابوالحسن گھر سے کھانا کھا کر سب سے پہلے مکتب آپہنچا۔ حسن اتفاق سے استاد صاحب بھی موجود نہ تھے۔ اس نے موقع غنیمت سمجھ کر ایک لڑکے کا سیپارہ اُستاد کے بستے میں رکھ دیا۔ جب لڑکے مکتب میں آگئے اور پڑھائی شروع ہوگئی۔ اس

لڑکے نے اپنا سیپارہ تلاش کیا۔ مگر نہیں ملا۔ ناچار جا کر مُلّا جی سے رپورٹ کی۔ وہ بہت خفا ہوئے۔ بولے کیسے نامعقول بچے ہیں۔ سیپارہ چُرا لیتے ہیں۔ اچھا ان کے بستوں کی تلاشی لو اور جس کے پاس سے سیپارہ نکلے اُس کا مُنہ کالا کرو۔ حکم کی دیر تھی۔ توے کی سیاہی گھروں سے آئی اور ایک چراغ میں اس کو گھولا گیا۔ ابوالحسن نے لڑکوں کے بستوں کی تلاشی لی جب کسی بستے سے وہ سیپارہ برآمد نہیں ہوا۔ تو اس نے ہاتھ جوڑ کر اُستاد سے عرض کی۔ تمام بستے دیکھ لیے۔ سیپارہ کا کہیں پتہ نہیں اور اُستاد کے بستے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ اب یہی ایک بستہ باقی رہ گیا ہے۔ حکم ہو تو اس کو بھی دیکھ لیا جائے۔ استاد نے اجازت دی۔ انھوں نے بڑھ کر اس بستے کو ٹٹولا اور سیپارہ نکال کر سامنے ڈال دیا۔ ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے اور عرض کی کہ یہ سیاہی حاضر ہے۔ بندہ کو تعمیلِ ارشاد کر لینے دیجیے۔ غرض مُلّا جی خفیف ہو گئے اور لڑکے کِھل کِھلا کر ہنس پڑے۔

ابوالحسن ابھی نو سال اور چھ ماہ کا ہؤا تھا کہ اس کی والدہ نے انتقال کیا جس کا قدرتاً اس کو بہت رنج ہؤا۔ ادھر اس کے باپ ابوالمحاسن کے کاروبارِ تجارت کو بڑا دھکا لگا۔ سراج النساء رتی رتی کی خبر رکھتی تھی۔ اس کی آنکھ بند ہوتے ہی نوکروں نے ہاتھ پاؤں نکالے اور دونوں ہاتھوں سے لوٹنا شروع کیا۔ آٹھ نوکروں میں سے چھ بہت سا مال و اسباب لے کر رفوچکر ہو گئے۔

تباہی سے بچنے کے لیے ابوالمحاسن نے دوسری شادی کرلی۔ نئی بیوی جس کا نام خصیمہ تھا۔ پرلے درجے کی خودسر، بدمزاج اور پھوہڑ تھی۔ اور اس پرطرہ یہ کہ جاہلِ مطلق۔ غصّہ ناک پر رکھا رہتا۔ اس کے آتے ہی ابوالمحاسن کا رہا سہا کاروبار بھی بیٹھ گیا۔ سراج النساء کی موت نے اسے دردمند بنادیا تھا۔ مگر خصیمہ کی تشریف آوری نے اس کی خانہ بربادی کو آخری مراحل تک پہنچادیا۔

ادھر خصیمہ اپنے سوتیلے فرزند ابوالحسن کے ساتھ انتہا درجے کی بدسلوکی کرتی۔ بات بات پر غصّہ ہوتی۔ آنکھیں نکالتی اور مارتی۔ کھانا کھانے کو نہ دیتی۔ کپڑا پھٹ جاتا تو سی کر نہ دیتی۔ الغرض اس کا ایسا دہاڑا کر رکھا تھا کہ ناقابلِ بیان ہے۔ ابوالمحاسن خصیمہ کو بہت سمجھاتا کہ یہ بے ماں کا بچّہ ہے اس پر رحم کرو۔ لیکن اس عورت کے ایک نہ لگتی۔ اُلٹی صلواتیں سناتی اور کہتی کہ اسے اپنی جیب میں رکھا کرو۔ تو چاہتا ہے کہ لڑکا نازونعمت میں پل کر خراب ہوجائے۔ ملّا دوپیازہ اپنی عمر کا بارھواں سال ختم کرنے تک خصیمہ کے جور وتشدّد سے پورا پورا تنگ آچکا تھا۔ آخر تنگ آمد بجنگ آمد۔ اس نے یہی تجویز کی کہ جس طرح خصیمہ اس کو دق کرتی رہتی ہے۔ وہ بھی اس کا ناک میں دم کرے۔ چنانچہ ایک دن موقع پاکر اس نے خصیمہ کے کپڑوں کو چوہے کی طرح کتر ڈالا اور استادی یہ کی کہ کوئی جوڑ سلامت نہیں چھوڑا۔ کچھ روز بعد

خصیمہ کو شادی کی تقریب میں جانے کے لیے کپڑوں کی ضرورت ہوئی۔ گٹھڑی کھول کر کیا دیکھتی ہے کہ تمام جوڑے کٹے پڑے ہیں۔ حیران رہ گئی۔ اپنا منہ لپیٹ لیا اور ابوالحسن کو ساتھ لے کر چوہوں کو کوستی اپنے میکے چلی گئی اور مُلّاؔ کی شرارت پر پردہ پڑا رہا۔ خصیمہ یہاں بھی ابوالحسن کے ساتھ اچھی طرح پیش نہ آئی۔ بلکہ پہلے سے بھی زیادہ اس پر ستم توڑتی رہی۔ مُلّاؔ کو ناگوار گزرا اور وہ کہے بغیر اپنے باپ کے پاس چلا آیا۔ اور یہاں آکر ایک ایسی شرارت کی جس کے خمیازہ میں دونوں باپ بیٹوں کو علیحدہ علیحدہ بے وطن بننا پڑا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ طائف کے گلی کوچوں میں ایک نیم پاگل عورت پھرا کرتی تھی۔ جو فربہ اور جسیم تھی۔ اس بنا پر لوگ اسے ثمینہ کہتے تھے۔ ابوالحسن اسے کھانے کا لالچ دے کر ایک روز اپنے گھر لے آیا اور حویلی کا دروازہ باہر سے بند کر کے سیدھا خصیمہ کے پاس پہنچا اور اس کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا اور درد بھری آواز میں کہنے لگا کہ ابّا جان ایک اور عورت گھر میں لے آئے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ بڑی خاندانی ہے۔ وہ لوگوں سے اس کی خوبصورتی کی بھی تعریف کرتے ہیں۔ مگر اماں جان خدا گواہ ہے وہ آپ کی پاپوش کی بھی برابری نہیں کرتی۔ چنانچہ میں نے انہیں یہ بات سنا بھی دی۔ بہت خفا ہوئی۔ جب کچھ دیر بعد میں نے کھانا مانگا تو مجھے مار کر نکال دیا اور کہا کہ اپنی خوبصورت اماں کے پاس جا کر مانگ۔ یہ کہہ کر ابوالحسن اور بھی ڈاڑھ مار کر رویا۔

خصیمہ مارے غصے کے لال پیلی ہو رہی تھی۔ وہ ابوالمحاسن اور ثمینہ کو کوستی سیدھی گھر پہنچی۔ یہاں ثمینہ موجود تھی۔ خصیمہ کے بدن میں آگ لگ گئی۔ جوتی اتار تڑ تڑ مارنا شروع کیا۔ ثمینہ پہلے تو اس ناگہانی حملے پر جھجکی۔ آخر سنبھلی اور پھکنی ہاتھ میں لے کر مقابلہ پر اتر آئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو مار مار کر لہولہان کر دیا۔ ان کی چیخوں سے محلے میں اُدھم مچ گیا۔ کئی آدمی ابوالمحاسن کے پاس پہنچے اور بولے کہ تمھارے ہاں عجب قیامت برپا ہے۔ وہ دوڑا دوڑا آیا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ دیوار پھاند کر اندر پہنچا۔ کیا دیکھتا ہے کہ دونوں عورتیں گتھم گتھا ہیں۔ خصیمہ نے اسے دیکھ کر ثمینہ کو چھوڑ اس پر حملہ کر دیا۔ ادھر ثمینہ نے بھی اس پر وار کیا۔ غریب ابوالمحاسن اس دوہری مار سے بہت زچ ہوا۔ پیٹھ دکھائی اور بھاگا۔ گھر بار اور بیوی بچہ کو چھوڑ ایسا غائب ہوا کہ نہ مرے کی خبر آئی نہ جیتے کی۔ خصیمہ نے چار روز کے انتظار کے بعد گھر کے مال واسباب پر قبضہ کیا اور سب کچھ لے کر اپنی ماں کے گھر چلی گئی اور ابوالحسن اپنے باپ کی تلاش میں حاجیوں کے قافلے کے ساتھ مکے روانہ ہو گیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے تمام قافلے اور سرائیں ڈھونڈھ ماریں۔ مگر ابوالمحاسن کا پتہ نہ لگا پر نہ لگا۔ مایوس ہو کر ایک قافلہ کے ساتھ جو ایران جا رہا تھا ہو گیا۔ جرنیل اکبر علی جو ایرانی فوج میں جرنیل کا منصب رکھتا تھا، اس قافلے کا سردار تھا۔ اس نے ابوالحسن میں دلچسپی لی اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ اس کو عزت کے ساتھ رکھو۔ الغرض

اس طرح ابوالحسن ایرانی قافلے کے ساتھ مع الخیر ایران پہنچ گیا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب ہمایوں شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر اور سلطنتِ ہندوستان کھو کر ایران میں پناہ گزین ہو گیا تھا۔ شاہِ ایران نے اس تاجدار بے ملک کی بڑی آؤ بھگت کی۔ ہمایوں کے ساتھ ایک شخص مرزا بخش اللہ خاں تھے۔ جو فوج ہمایوں میں کرنیل رہے تھے۔ جرنیل اکبر علی خاں سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ مرزا جب ہمایوں کے ساتھ واپس لوٹے۔ انھوں نے ابوالحسن کو جرنیل سے مانگ لیا اور اپنے ساتھ کابل لے آئے۔ کابل کے محاصرے میں کرنیل بخش اللہ خاں مارا گیا۔ جس کا مُلّا کو ازحد رنج ہوا۔ مگر اس نے شاہی فوج کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اور ۱۵۵۶ء میں ماچھیواڑہ کی جنگ کے بعد جب کہ مغلوں کی حکومت ہند میں بار دیگر مستقل ہو گئی۔ اس نے دہلی میں رہنا اختیار کیا۔ اس وقت اس کی عمر پندرہ سولہ سال کے قریب تھی۔ دنیا کے حوادث اور انقلابات دیکھ دیکھ کر وہ اس قدر افسردہ خاطر ہو رہا تھا کہ اس نے دنیا ترک کر دینے کا مستحکم ارادہ کر لیا۔ اس نیت سے وہ شمس الامراء محمد خاں لودھی کی مسجد میں مقیم ہو گیا۔ ایک شریف خاندانی عرب ہونے اور خوش الحانی کے ساتھ قرآن پڑھنے کی بنا پر ہندوستان کے لوگ اس کی بڑی عزت کرتے اور اس کو مُلّا جی کہا کرتے۔ اس کی شہرت دہلی میں بہت جلد پھیل گئی اور امراء و رؤساء اسے دعوتوں میں بلانے لگے۔

ایک روز کسی کے ہاں ضیافت تھی۔ ان کو ایک خاص قسم کا پلاؤ بہت پسند آیا۔ پاس والے ساتھی سے دریافت کیا کہ "ایں طعام از کدام قسم است" اس نے جواب دیا "از قسم پلاؤ"۔ پھر پوچھا "ایں راچہ می گویند" اس نے کہا "دو پیازہ"۔ آپ بہت خوش ہوئے اور کہا سبحان اللہ کیا عمدہ کھانا ہے۔ اور اضافہ کیا کہ جب تک دو پیازہ دستر خوان پر نہ ہو گا، میں کسی کی دعوت منظور نہ کروں گا۔ اس روز سے ان کا نام دو پیازہ پڑ گیا۔

مُلّا کی اکبر تک رسائی کے بارے میں تین مختلف روایتیں ہیں۔ مگر ہم صرف ایک روایت پر قناعت کریں گے۔ جو یہ ہے کہ فیضی نے دو معتمد بھیج کر اسے دہلی سے اپنے پاس بلوالیا اور عبادت خانۂ دینِ الٰہی کا کام اس کے سپرد کیا۔ اوّل اوّل مُلّا نے اس کام کو ناپسند کیا۔ مگر جب فیضی اور ابوالفضل نے اسے اکبر کی مصالح ملکی سمجھادیں تو وہ رضامند ہو گیا۔

اب مُلّا صاحب کے کچھ لطیفے دیے ہیں۔ جن میں کئی ایسے ہیں جن میں مُلّا اور بیربل ایک دوسرے کے حریف بنتے ہیں۔ مثلاً ایک یہ ہے کہ بیربل اکبر کے پاس بیٹھا تھا۔ مُلّا دو پیازہ کسی دھن میں مستغرق جھکا ہوا زمین کی طرف دیکھتا آرہا تھا۔ بیربل نے پوچھا مُلّا جی کیا ڈھونڈتے ہو؟ مُلّا نے جواب دیا۔ مدّت سے میرا باپ گم ہو گیا ہے۔ اسے دیکھتا ہوں۔ بیربل نے کہا۔ اگر میں بتادوں تو کیا دو۔ مُلّا نے کہا سارا آپ کا۔

دوسرا لطیفہ یہ ہے کہ بیربل ایک مرتبہ دہلی گئے۔ راستے میں فیل بان سے کسی بنا پر خفا ہو گئے۔ واپسی پر بادشاہ سے اپنے سفر کا حال بیان کرنے لگے۔ اور بولے کہ جس نام کے اخیر میں بان ہوتا ہے وہ نہایت شریر اور نٹ کھٹ ہوتا ہے۔ مثلاً فیل بان، گاڑی بان، ساربان۔ ملّا یہ سن کر مسکرائے اور بولے سچ کہتے ہو مہربان۔

ایک لطیفہ یہ ہے کہ ایک گنوان پنڈت اکبر بادشاہ سے کہہ رہے تھے کہ صبح کے وقت دو کوّے ایک جگہ ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھنا بڑا نیک شگون ہے۔ بیربل پاس بیٹھے تائید کرتے رہے۔ ملّا نے چپکے سے کان میں کہا۔ قبلۂ عالم اس بات کو آزمانا چاہیئے۔ بادشاہ نے بیربل کو حکم دیا کہ جب کبھی صبح کو دو کوّے ایک جگہ بیٹھے دیکھو مجھے اطلاع دو۔ بیربل موقعہ کے منتظر رہے۔ ایک دن انھوں نے صبح ہی صبح دو کوّے ایک جگہ دیکھے۔ بھاگے ہوئے گئے اور بادشاہ کو نیند سے بیدار کیا۔ جاڑے کا موسم تھا۔ بادشاہ اٹھے۔ مگر نہایت بدمزہ ہوئے۔ موقع پر پہنچ کر دیکھا تو ایک کوّا نظر آیا۔ برہم ہو کر بیربل کے دو چار رسید کیے۔ اسی روز بادشاہ کی خدمت میں جے پور کے ایک ٹھاکر نے ڈولا نذر کیا۔ ملّا صاحب نے ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ قبلۂ عالم۔ اگر حضور بھی دو کوّے دیکھتے تو یہ ڈولا نہ ملتا۔ اور جنھوں نے دو کوّے دیکھے۔ ان کا حال تو حضور سے

پوشیدہ نہیں۔ بیربل بہت شرمندہ ہوئے۔

ایک لطیفہ یوں ہے کہ بیربل ایک روز نہایت عمدہ پگڑی باندھ کر دربار میں آئے۔ بادشاہ نے دیکھ کر مُلّا دو پیازہ سے کہا۔ بیربل کی دستار تمھاری پگڑی سے عمدہ بندھی ہے۔ مُلّا نے فوراً جواب دیا:۔ حضور عالی! بجا درست۔ لیکن یہ تو انھوں نے اپنی بیوی سے بندھوائی ہے۔ بادشاہ نے کہا۔ اس کا ثبوت۔ مُلّا نے فوراً اپنی پگڑی اُتار لی۔ اور کہا کہ بیربل بھی اپنی پگڑی اتاریں۔ پھر دونوں نے باندھنا شروع کی۔ مُلّا نے حسب وضع قدیم پگڑی باندھ لی۔ لیکن بیربل کوشش کے باوجود ویسی نہ باندھ سکے۔ تب بادشاہ مسکرائے۔ اور فرمایا۔ بیربل معلوم ہوا کہ ہر کام جو تم سے نہیں ہو سکتا اپنی بیوی سے کراتے ہو۔ بیربل شرمندہ ہو کر رہ گئے۔

اب ہم لطائف کو چھوڑ کر مُلّا کی وفات کا ذکر کرتے ہیں۔ سنہ ۱۵۹۹ء میں اکبر نے احمد نگر کو فتح کرنا چاہا۔ اور جہانگیر کو فوج کا سپہ سالار بنا کر بھیجا۔ مگر شہزادہ ناکام رہا اور بادشاہ بذاتِ خود روانہ ہوئے۔ اس زمانے میں احمد نگر کی حکومت چاند بی بی سے متعلق تھی۔ اکبر کو مُلّا دو پیازہ سے اس قدر محبت تھی کہ ہمیشہ اس کو اپنے ساتھ رکھتا۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ احمد نگر کا محاصرہ ہو رہا تھا۔ بادشاہ سلامت سپہ سالاری کر رہے تھے۔

دن بھر کی تگ و دو اور گولہ باری سے یہ امید ہو چلی تھی کہ قلعہ جلد فتح ہو جائے گا رات کو ارکان دولت شاہی خیمے میں جمع ہوئے۔ اور اس دن کے واقعات پر تبصرہ ہونے لگا۔ ایک نے کہا۔ اُمید ہے کہ قلعہ کل فتح ہو جائے گا۔ دوسرے نے کہا۔ حضور کا اقبال بلند ہے۔ تیسرے نے کہا۔ اس عورت کی کیا حقیقت ہے جو حضور کا مقابلہ کر سکے۔ ملاّ نے ظریفانہ ترنگ میں کہا۔ کہ یہ حضور کی بلند اقبالی اور اولوالعزمی ہے کہ اس عورت کا مقابلہ کرنے آئے ہیں۔ ورنہ اس کا مقابلہ ساری دنیا کے بادشاہ نہیں کر سکتے۔ مُلاّ کا یہ چُبھتا فقرہ سب سمجھ گئے اور خاموش ہو گئے۔ بادشاہ نے بھی سوچا کہ اگر ملک فتح کر لیا تو عورت کو شکست دی۔ کیا بہادری کی اور اگر شکست کھائی تو رسوائے عالم ہوئے۔ آخر ملک بخش کر آگرہ کا رُخ کیا۔

اس وقت ملاّ کی عمر ۷۰ برس کے قریب تھی۔ جنگ و سفر اور آب و ہوا کی تبدیلی سے اسے بخار آنے لگا۔ یہ بخار اس کے ایسا پیچھے پڑا کہ دن بہ دن زیادہ ہوتا گیا۔ شاہی لشکر تیزی کے ساتھ کوچ کر رہا تھا۔ اور مُلاّ کو ایک سکھپال میں ڈال رکھا تھا۔ ایک دن بادشاہ خود دیکھنے گئے اور آخر لشکر کو ٹھہرنے کا حکم دیا۔ لیکن جب سے مُلاّ بیمار ہوا تھا۔ بادشاہ نے اس کے علاج کا کچھ خیال نہیں کیا۔ وہ کامل ایک مہینہ بیمار رہا۔ آخر ۱۵ ر رمضان کی صبح لشکر میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ مُلاّ کا انتقال ہو گیا ہے۔ سب کو رنج ہوا۔ بادشاہ مع

درباریوں کے جنازے میں گیے۔ تمام لشکر اور بادشاہ نے جنگل میں نماز پڑھی اور ایک نزدیک قصبہ میں جس کو ہنڈیا کہتے ہیں۔ اسے سپردِ خاک کر دیا۔ ایک ظریف نے کہا۔ واہ بھئی دو پیازے مر کر بھی ہنڈیا میں رہے۔ وفات کے وقت اس کی عمر پورے ساٹھ برس کی تھی۔ وہ سنہ ۱۵۴۰ء میں پیدا ہوا تھا۔ اور سنہ ۱۶۰۰ء میں اس دنیا سے رخصت ہؤا۔

دو پیازہ کے متعلق ہندوستانی سپیکولیٹر کا یہ بیان ہے۔ جسے میں نے مختصراً اوپر بیان کیا ہے۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ وہ ہمیں اپنے ذرائع معلومات سے مطلق اطلاع نہیں دیتا۔ اگرچہ اس کا دعوےٰ ہے کہ اس نے عربی و فارسی کتابوں سے اس کا حال لکھا ہے۔ مگر ان کتابوں کا وہ نام تک نہیں لیتا۔ وہ تسلیم کرتا ہے کہ ملّا کسی بادشاہ کا وزیر نہیں تھا اور نہ کسی شہنشاہ کا پیر تھا۔ پھر اس کے پاس ایسے کون سے پراسرار ماخذ ہیں جن سے اس کو ملا کے خاندانی حالات، نانا دادا کے نام، ماں باپ کے نام، ان کا پیشہ، خود ملّا کے بچپنے کے حالات، اس کی طفلانہ شوخیاں اور شرارتیں اس تفصیل کے ساتھ جو صرف ایک معاصر یا عینی شاہد دے سکتا ہے، دستیاب ہو گئے[1]۔ حالانکہ اس توضیح کے ساتھ اکثر سلاطین کے حالات بھی میسّر نہیں۔

---

[1] یہاں مقابلہ کی غرض سے ہم مسٹر ایف جی ڈیرک کے استفسار کی ایک عبارت جو پنجاب نوٹس اینڈ کوئریز میں ملتی ہے۔ نقل کرنی مناسب سمجھتے ہیں جو ہندوستانی سپیکولیٹر کے زرجعفر بی

(باقی حاشیہ بر صفحہ ۷۸)

یہ تفصیل ہمارے شبہات کو قوی کرتی ہے کہ کہیں یہ تمام قصّہ ایک من گھڑت افسانہ نہ ثابت ہو۔ دو پیازہ کے ذکر میں عربی کتب کا ذکر کرنا بالکل بے سود ہے۔ کیونکہ عربی میں اس کے متعلق کوئی چیز موجود نہیں۔ اور نہ مُلّا طائف میں پیدا ہوا اور نہ عرب کا رہنے والا ہے۔ وہ ہندی محض ہے اور بس۔ فارسی میں جہاں کہیں اس کا ذکر آیا ہے اسے ہندی ہی لکھا ہے ہمیں اس کے تاریخی بیانات کا حصّہ بھی معتبر نہیں معلوم ہوتا۔ باچھیواڑہ کی مہم کا سال وہ ۱۵۵۶ء

(بقیہ حاشیہ صـ۷۷) ہے سے صرف پانچ سال قبل مرقوم ہوئی اور جس میں عام شکایت ہے کہ باوجود تلاش دو پیازہ کے حالات کچھ بھی نہیں ملتے۔ عبارت حسب ذیل ہے:-

"مجھ کو مُلّا دو پیازہ کے صحیح حالات کن ذرائع سے معلوم ہو سکتے ہیں؟ مجھے تمام سلمانی تاریخوں اور تذکروں سے جن تک میری رسائی ہو سکی اس کے تھوڑے سے حالات بھی تو نہیں مل سکے۔ قصوں کی کتابوں میں جو بازاروں میں بکتی ہیں اس کو ایک مشہور ظریف بلکہ مسخرہ اور بیربل کا ہمعصر بتایا گیا ہے جو بیربل کی طرح اکبر کے مقربوں میں شامل تھا۔ یہ بیان میرے نزدیک قابل اعتبار نہیں کیونکہ مُلّا اگر اس عہد میں ہوتا تو ابوالفضل آئین اکبری میں ضرور اس کا ذکر کرتا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہنڈیا جو صوبجات متوسط میں واقع ہے اس کا وطن ہے اور مزار بھی وہیں ہے۔ یہ علاقہ بادشاہ نے اس کی جاگیر میں بھی دے رکھا تھا۔ ایک شخص نے اس سے دریافت کیا کہ تم نے آگرہ کے قریب کے دوسرے علاقوں پر ہنڈیا کو کیوں ترجیح دی۔ اس نے جواب دیا کہ ہنڈیا دو پیازہ کے لیے مناسب ہے۔ دو پیازہ کو اس نے اپنے النامہ میں سید الطعام کے

(باقی حاشیہ بر صفحہ ۷۹)

بتا تا ہے۔ حالانکہ وہ اس سن سے ایک یا دو سال قبل واقع ہوئی ہے۔ اکبر علی اور بخش اللہ خاں اس عہد کے سے نام معلوم نہیں ہوتے۔ اسی طرح شمس الامرأ خطاب بھی جدید انداز کا ہے۔ اور ان ایام میں رائج نہیں تھا۔

ہندوستانی سپیکولیٹر کا بیان ہے کہ ملاّ ۱۵۴۰ء (۹۴۷ھ) میں پیدا ہوا۔ اور ۱۶۰۰ء (۱۰۰۹ھ) میں وفات پا گیا۔ ہمارے پاس اس کی تاریخ ولادت کے جانچنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ اگرچہ یہ بہت ممکن ہے کہ وہ غلط ہو۔ لیکن اس کا سالِ وفات جو اُوپر دیا گیا ہے یقیناً غلط ہے۔ کیونکہ اس تاریخ سے بیس اکیس سال بعد تک وہ زندہ تھا۔ اس کے عیسوی سنین دینا بھی خالی از اعتراض نہیں۔ کیونکہ اس کے سامنے اگر کوئی اصل ماخذ ہوتا تو اس میں سنہ ہجری مذکور ہوتا۔

(بقیہ حاشیہ صہ ۷۸):۔ معزز خطاب سے یاد کیا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کی قبر پر جو تا حال ہنڈیا میں موجود ہے دو کتبے موجود ہیں۔ پہلا کتبہ نیچے ٹھیک دروازے کے اوپر۔ دوسرا بلندی پر گنبد کے قریب۔ نچلے کتبے کی عبارت یہ ہے۔ "اے جوان برای خدا بالا نگر"۔ اور جب دیکھنے والا اوپر جھانکتا ہے تو ان مضحک الفاظ سے دوچار ہوتا ہے۔ "چہ می بینی گیدی خر"۔

(پنجاب نوٹس اینڈ کوئریز جلد دوم صفحہ ۱۹ بذیل ۳۰۲ بابت مارچ ۱۸۸۵ء)

پانچ سال کے بعد اس تفصیل کے ساتھ دوپیازہ کے حالات کا معلوم ہو جانا استعجاب انگیز ہے اور کوئی تعجب نہیں اگر ہندوستانی سپیکولیٹر نے ڈیلمرک کے استفسار کے جواب میں یہ داستان تراشی ہو۔

ہندوستانی سپیکولیٹر کا یہ قول کہ فیضی نے ملّا دو پیازہ کو بلوا کر عبادت خانہ دینِ الٰہی کا کام اس کے سپرد کر دیا قرینِ صحت نہیں۔ کیونکہ اگر ایسی اہم خدمت ملّا دو پیازہ کے سپرد ہوتی تو اکبری عہد کی تاریخوں میں یقیناً اس کا ذکر ملتا۔

وہ احمد نگر کے خلاف شاہزادۂ جہانگیر کی ایک ناکام مہم کا سنہ ۱۵۹۹ء (سنہ ۱۰۰۸ھ) بتاتا ہے۔ لیکن شہزادگی کے ایام میں جہانگیر کبھی جہانگیر نہیں کہلایا۔ بلکہ اس کا نام سلیم تھا۔ تخت نشینی کے وقت وہ جہانگیر نام اختیار کرتا ہے۔ اسی طرح مؤلف کا یہ بیان کہ جہانگیر کو سنہ ۱۸۹۹ء میں احمد نگر کی تسخیر کے لیے بھیجا گیا بالکل غلط ہے۔ جہانگیر کو دکن کی مہم پر کبھی نہیں بھیجا۔ بلکہ یہ شہزادہ مراد تھا جو سنہ ۱۰۰۳ھ ۶۳۹ مطابق سنہ ۱۵۹۴ء کو بہ غرض تسخیر احمد نگر روانہ ہوتا ہے۔ مگر امرا کے نفاق اور سوءِ تدبیری سے مہم ناکام رہی۔ مراد سنہ ۱۵۹۸ء (سنہ ۱۰۰۷ھ) میں فوت ہوتا ہے۔ اس کی جگہ شہزادہ دانیال کی تقرری عمل میں آتی ہے۔ اور قلعہ احمد نگر سنہ ۱۶۰۰ء (سنہ ۱۰۰۹ھ) میں فتح ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اس کا یہ کہنا کہ خود اکبر سنہ ۱۵۹۹ء (سنہ ۱۰۰۸ھ) یا اس کے قریب احمد نگر کے محاصرے کے واسطے پہنچا صحیح نہیں۔ اکبر کا ارادہ ضرور دکن جانے کا تھا مگر وہ آسیر سے آگے نہ بڑھ سکا اور سنہ ۱۰۰۹ھ (م سنہ ۱۶۰۰ء) میں اس قلعہ کی فتح کے بعد وہ واپس آگرہ آ گیا۔

اس کا یہ بیان کہ "دوپیازہ ایک خاص قسم کا پلاؤ ہے۔ صحت سے بعید ہے۔ کیونکہ ابوالفضل آئینِ اکبری میں دوپیازہ کی تشریح بالفاظِ ذیل کرتا ہے:۔

"دوپیازہ، دہ سیر گوشت میانہ فربہ دو دو سیر روغن زرد و پیاز ربع سیر نمک، ثمن سیر زنجبیل تر، یک یک دام از زیرہ و کشنیز و قاقلہ و قرنفل، دو دام فلفل، پنج قاب شود۔" (آئینِ اکبری، صفحہ ۳۷، جلد اوّل طبع نول کشور ۱۳۱۰ھ) اس سے ظاہر ہے کہ وہ ایک قسم کا قلیہ ہے نہ کہ پلاؤ۔

فارسی میں ملّا کے متعلق جو کچھ ملتا یا مل سکتا ہے۔ ہندوستانی سپیکولیٹر اس سے بالکل بے خبر ہے۔ اس کا یہ رسالہ درحقیقت کسی قدیم ماخذ پر مبنی نہیں ہے۔ بلکہ خیالی واقعات کا طومار ہے۔ جس کے واسطے اس کا دماغ اور قلم ذمّہ دار مانا جا سکتا ہے۔ رہے لطیفے یہ یقیناً محمد کامل کے عہد سے قبل کے ہیں اور دیگر اشخاص کی طرف بھی منسوب ہیں۔ اس کا مزار قصبۂ ہنڈیا میں ہے۔ یہ حصہ ہندوستانی سپیکولیٹر کے بیان کا البتہ صحیح ہے۔

بعض اردو نگاروں نے اسے مُلّا عبدالقادر بدایونی کے ساتھ شناخت کیا ہے۔ مثلاً سوانح عمری بیربل و ملّا دوپیازہ میں جن کو حسب ایمائے منشی

بلاقی داس مالک مطبع، اہالیان مطبع نے کتب انگریزی و اُردو فارسی سے انتخاب اور ترجمہ کر کے تالیف کیا۔[۱] (میور پریس دہلی)

اس تالیف میں لکھا ہے :-

بعضوں نے اس کا نام ابوالحسن بھی دیا ہے۔ منجملہ نورتنوں کے اکبر کا ساتواں رتن تھا۔ اصل میں گیلان کا رہنے والا تھا۔ بعض طائف کا رہنے والا اور بعض نجد کا بتلاتے ہیں)۔ سنہ ۱۸۴۲ء (کذا) میں پیدا ہوا۔ اکبر کی پیدائش بھی اسی سن میں ہوئی۔ دوسرا حُسنِ اتفاق یہ ہوا کہ تاریخ ۱۴ ماہ اکتوبر سنہ مذکور میں جب اکبر پیدا ہوا تو اسی تاریخ عبدالقادر[۲] بھی بمقام گیلان پیدا ہوا۔ اس کے باپ دادا گیلان کے بادشاہوں کے ہاں بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز چلے آتے تھے۔ ہند میں ان کا باپ عبدالرزاق (المخاطب بہ ابوالحسن) آیا اور مظفر شاہ کا اتالیق مقرر ہوا۔ جب مظفر شاہ جوان اور خود مختار ہوا تو عبدالرزاق کو عہدہ قاضی القضاۃ کا عطا کیا۔ عبدالرزاق صلح کن انسان تھا۔

---

[۱] یہ سوانح عمری اگرچہ بعد میں گمنام چھپتی رہی۔ مگر اصل میں مرزا حیرت دہلوی کی تالیف ہے، جیسا کہ رسالہ ذیل سے ثابت ہے۔ "سوانح عمری بیربل وملّاں دوپیازہ مصنفہ مرزا حیرت صاحب دہلوی۔ حسب ارشاد منشی بلاقی داس، مالک کتب خانہ میور پریس دہلی سنہ ۱۹۱۶ء مطبع انتخار دہلی میں منشی محمد ابراہیم کے اہتمام سے چھپا"۔

[۲] گویا عبدالقادر بدایونی اور مُلّا دوپیازہ کو ایک شخص قرار دینے میں مرزا حیرت کی ذہنی اپج ذمہ دار ہے۔

جب عبدالقادر سولہ برس کا ہوا تو باپ بیٹوں میں ناچاقی ہو گئی۔ بیٹا کٹ مُلّا اور باپ دنیادار۔ یہی باعث نااتفاقی ہوا۔ عبدالقادر مکہ معظمہ چلا گیا۔ عبدالرزاق اس کی تلاش میں نکلا اور مکہ پہنچا۔ بدقسمتی سے جاتے ہی دو تین دن کے بعد دنیا سے کوچ کر گیا۔ اور بیٹے سے ملنے کی حسرت دل میں لے گیا۔ عبدالقادر نے مکہ میں رہ کر دینوی علوم تحصیل کیے اور بڑی شہرت حاصل کی۔ اب اس کو یہ شوق پیدا ہوا کہ دولت کمائے۔ اس خیال سے وہ ہندوستان پہنچا۔ عبدالقادر کے استاد کا نام بھی عبدالقادر تھا۔ اس نے اپنی لڑکی عائشہ نامی اسے بیاہ دی۔ قصہ مختصر عبدالقادر اکبرآباد پہنچا اور مرزا عبدالرحیم اور زین خاں کی معرفت دربار اکبری میں پہنچا۔ اور رفتہ رفتہ اکبر کا پرائیویٹ سکریٹری بن گیا۔ ابوالفضل اور فیضی سے عبدالقادر کی نوک جھونک رہتی تھی۔ اس کے بعد سر ہنری ایلیٹ کی رائے کا خلاصہ اور ایک مختصر نوٹ کرنل کنیڈی کی کتاب سے عبدالقادر کے متعلق دیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ فاضل اکبر کے تین سال پہلے ۱۶۰۲ء میں عالم بقا کو سدھارا۔" ہمیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ تمام حالات فرضی ہیں)

اسی عقیدے کی صدائے بازگشت سوانح عمری ملّاں دوپیازہ و بیربل از تصنیف آغا محمد طاہر نبیرۂ مولینا محمد حسین آزاد میں ملتی ہے۔ (آغا طاہر ہمیں مُلّا عبدالقادر کے صحیح حالات سے روشناس کراتے ہیں۔ لیکن عبدالقادر

کے ملا دو پیازہ کہلائے جانے کی وجہ آغا طاہر یہ دیتے ہیں کہ " بیر برنے باتوں باتوں میں ملا دو پیازہ کی پھبتی کہہ دی ہوگی ۔ پھر کیا تھا ۔ منہ سے نکلی اور کوٹھے پر چڑھی ۔ ذرا سی دیر میں تمام شہر میں مشہور ہوگیا ۔ یہ بیچارے مولوی سے خاصے ملا دو پیازے بن گئے ۔ اور ایسے بنے کہ آج تک وہ ہی نام مشہور ہوا ") مگر عبدالقادر اور ملا دو پیازہ دو مختلف اشخاص ہیں ۔ اور ان میں خلط کرنا سراسر دیوانگی ہے ۔

ملا دو پیازہ درحقیقت ایک تاریخی شخص ہے ۔ اگرچہ اس کے حالات ہمیں معلوم نہیں ۔ اس کی تصویر مصوروں میں بہت مقبول رہی ہے ۔ وہ ایک ڈبلے پتلے گھوڑے پر جس کی ہڈی ہڈی اور رگ رگ گنی جاسکتی ہے سوار دکھایا گیا ہے ۔ اس کی پگڑی نہایت بھاری ہے ۔ موٹے جسم بڑے کلے جبڑے اور بھری ڈاڑھی کا شخص ہے ۔ جبّے کے پلّو نہایت نیچے اور آستینیں نہایت ڈھیلی ہیں ۔ یہ تصویر شاہ جہاں کے عہد سے ملنے لگتی ہے ۔ اس کی کافی نقلیں موجود ہیں ۔ انڈیا آفس لندن میں تصاویر کے متعدّد مرقعے موجود ہیں جو جانسن کلکشن یعنی مجموعہ جانسن کے نام سے مشہور ہیں ان مرقعوں میں ملا دو پیازہ کی کئی قدیم تصویریں موجود ہیں ۔

محمد صادق شاہ جہاں کے عہد کا ایک نہایت ممتاز مصنّف اور مورّخ ہے ۔ اس کی تاریخ صبح صادق اور طبقات شاہ جہانی جو مشاہیر کے حالات پر

ایک نادر تالیف ہے، نہایت مشہور ہیں۔ یہی مصنف ایک اور ضخیم کتاب شاہد صادق نامی کا مصنف ہے۔ شاہد صادق ہیں متعدد موقعوں پر ملا دوپیازہ کے النامہ کے حوالے اور اقوال ملتے ہیں۔

میرے پاس جمیل تھار کی ایک بیاض ہے۔ جو ۱۰۶۲ سنہ و ۱۰۶۷ سنہ ھ میں نقل ہوئی ہے۔ اس بیاض میں دوپیازہ کا النامہ موجود ہے۔ جو خود جمیل کا نقل کردہ ہے۔

میرے ہاں ایک اور بیاض ہے جو گزشتہ صدی کے پہلے ربع کی نوشتہ معلوم ہوتی ہے۔ اس میں النامہ کا مکمل نسخہ موجود ہے جو پورے سو صفحوں پر آیا ہے۔ خاتمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل النامہ کا نام مرأت المضحکین ہے۔ چنانچہ خاتمہ کی عبارت ہے:-

"تمام شد نسخہ، مرأت المضحکین تصنیف ملّا دو پیازہ۔ صاحب تاریخ "خیر لک من الاولیٰ"؛ خیر لک من الاولیٰ سے ۱۰۲۹ سنہ ھ برآمد ہوتے ہیں۔

یہ بیاض جو مختلف خطوط و حکایات و لطائف پر مشتمل ہے۔ مُلّا دوپیازہ کی دو حکایتوں کی حامل ہے۔ جس سے خیال ہوتا ہے کہ دوپیازہ کے حالات پر کوئی رسالہ ضرور موجود تھا۔ اور یہ حکایتیں اسی رسالہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان حکایتوں کا مصنف ایک نامعلوم شخص ہے۔ جس کا تخلص اشلغی ہے۔ وہ اپنے آپ کو دوپیازہ کا فرزند اور شاگرد بتاتا ہے اور اس کے نقشِ قدم پر

چل کر اسی کی شہرت کا طالب ہے۔ انشلغی پہلی حکایت میں مُلّا کے قیام ایران کے بعض حالات فارسی میں دیتا ہے ۔جن کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

سنہ ۹۹۰ھ میں ہندوستان سے برداشتہ خاطر ہو کر بکر ٹھٹہ کے دریا سے گزر کر براہ کیچ و مکران مُلّا ہرات پہنچا۔ شیعہ آ کر اس سے پوچھنے لگے کہ تیرا دین کیا ہے؟ ملّا بولا میں ہندی ہوں۔ ہمارے ہاں دن یوم کو کہتے ہیں۔ انھوں نے الفاظ بدل کر پوچھا تو دوست کس کو رکھتا ہے۔ ملّا نے جواب دیا کہ یہ بات تو اپنی اپنی ضرورت اور مقدارِ ضرورت پر ہوتی ہے۔ میرے پاس یہ دو گدھے ہیں۔ جو میرا سامان اٹھاتے ہیں اور یہ دو مخدوم زادے رفیقِ سفر ہیں۔ ان چاروں سے مجھے محبّت ہے۔ شیعہ بولے عجیب بے ڈھب انسان ہے۔ سوال از آسمان، جواب از ریسمان۔ کچھ دنوں کے بعد مشہور ہو گیا کہ ملّا دوپیازہ ہندی ہرات آ گیا ہے۔ اس وقت حسین خان شاملو نے جو اس علاقے کا سپہ سالار تھا اسے بلایا اور مجلس لگی۔ جس میں مرزا فصیحی[۱] اور دیگر شعرائے پایۂ تخت شامل تھے۔ مولینا نے اپنے کلام کے فقرات سنانے شروع کیے۔ کہ "الیار مرزا و میرک ریش دار"۔ اس پر ایسے لوگ جن کے نام میں الفاظ میرزا و میرک پائے جاتے تھے برہم ہوئے۔ حسین خاں نے سمجھایا کہ مُلّا تمھارا مہمان ہے۔

---

[۱] فصیحی ہروی اس عہد کا مشہور شاعر ہے۔ سنہ ۱۰۴۶ھ میں وفات پاتا ہے۔

اس سے مت جھگڑو۔ دوسرے دن میرزا فصیحی نے مولینا دو پیازہ کو مہمان بلایا۔ مُلّا گئے اور کچھ دیر ٹھہر کر رخصت ہوئے۔ فصیحی نے معذرت کے طور پر کہا مولینا معاف کرنا۔ میرے گھر کے لوگ حمّام گئے ہیں۔ مُلّا نے کہا :۔
" مہمان نان می طلبد نہ ......" یہ قصّہ حسین خان تک پہنچا۔ اس نے اپنے لوگوں سے کہا کہ ہر شخص کو ملّا کی دعوت علیحدہ علیٰحدہ کرنی چاہیے۔ الغرض مُلّا نے دو سردیاں ہرات میں گزار دیں۔ اس وقت بعض مفسدوں نے اس پر یہ تہمت دھری کہ وہ بد مذہب ہے۔ چنانچہ اس بنا پر پورے ایک مہینے اسے قید رکھا گیا۔ شیخ عبد الصمد اور دیگر ہوا خواہوں نے مشورہ دیا کہ ملّا لوگ تمھارے دشمن ہو چکے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ تمھیں کوئی آزار پہنچائیں اس لیے بہتر ہے کہ تم یہاں سے رخصت ہو جاؤ۔ مُلّا ہرات سے روانہ ہو کر بلخ میں آگیا۔ اور نذر محمد خاں اور ولی محمد سلطان کے ساتھ تعلقات قائم کر لیے۔ یہاں ملّا ملتانیوں کی کاروان سرائے میں قیام پذیر تھا جس کے حجرے طالب علموں کے لیے وقف تھے۔ چھ ماہ گزر جانے پر کمرے کا کرایہ ملّا سے طلب کیا گیا۔ اس نے جواب دیا۔ سرائے طالب علموں کے لیے وقف ہے۔ میں بھی تو طالب علم ہوں۔ کرایہ کیسے مانگتے ہو۔ آخر متولّی سے رپورٹ ہوئی۔ اس نے کہا۔ اگر ملّا واقعی صاحبِ فضیلت ہے تو اس سے کرایہ وصول نہیں کیا جائیگا بصورتِ دیگر اس کو دینا پڑے گا۔ چنانچہ مُلّا بلوائے گئے۔ یہ تو چلتی رقم تھے۔

جاتے ہی ایسی ظریفانہ باتیں کیں کہ لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ سب نے مولانا
سے درخواست کی کہ آپ کی فضیلت سب پر عیاں ہے۔ لیکن یہ شخص جو
آپ کو بلانے گیا تھا، اس کا نام محمد صالح ہے اور سمرقند کا رئیس زادہ ہے۔
آج کل نہایت پریشان حال ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ چند کلمے اس کے متعلق
لکھ دیں جن سے آپ کی ادبی قابلیت کا سکّہ دلوں پر بیٹھ جائے۔ مولانا نے
قلم برداشتہ اس کے ذکر میں چار ورق تحریر کر دیئے۔ جو اپنے موقعہ پر درج
کیے جائیں گے۔ یہاں اصل فارسی عبارت بھی نقل کر دی جاتی ہے:۔

"در سنہ نہصد و نود از خاک پاک ہند دل برداشتہ از دریائے بکر تھتہ
گزشتہ براہ کیچ مکران سیّار دیار ایران شدہ داخل ہرات گشت۔ بکاروان سرائے
آمدہ ماوی گرفت۔ 'التبرائی فوارہ لعن' چندی جمع شدہ ملا را اجنبی دانستہ
گرد آمدہ سوال نمودند کہ ای مرد غریب درین دیار بس عجیب چہ دین داری؟
بجواب گفت کہ ما مردم ہندی، ہستیم در روزمرہٗ اہل ہندوان روزرا می گویند
حیران شدہ ہمہ گفتند کہ کدام کس را دوست می داری۔ گفت دوست داشتن
بقدر ضرورت و در خور احتیاج می باشد۔ ایں دو مادہ خراست کہ کاغذ و آذقہ
سفر بر میدارد و ایں دو مخدوم زادہ رفیق سفر است ہر چہار را دوست میدارم
تبرائیان گفتند طرفہ مردمی است۔ سوال از آسمان می کنیم جواب از ریسمان میگوید
از سرکوی پرسش و اشلغ در گزشتند بعد از چند روز اشتہار یافت کہ ملّا دوپیازہ

ہندی داخل ہرات است۔ درآں زمان حسین خان لو سپہ سالار آں الکہ بود طلبیدہ بروی مولانا مجلسے آراستند۔ مرزا فصیحی و شعرای پایۂ تخت ہرات را طلبداشتند و مولانا از فقرات کلام خویش میخواند کہ مطلق "الیار میرزا و بیرک ریش دارد" تمام اہلِ مجلس (کہ) مسمّیٰ بہ اسم میرزا و بیرک بود (ند) بہم برآمدند و بشوریدند حسین خان فرمود کہ یاران مُلّا دو پیازہ مرد نامور روشناس عالم است با ایں مرد بسیار نہ پیچیدہ کہ مہمان دیار شماست۔ روز دیگر مرزا فصیحی مولانا را مہمان خود کرد و نشستہ روانۂ زاویۂ خود شد۔ مرزا فصیحی عذر آورد کہ مولانا معذور دارید مردم خانہ بہ حمام رفتہ اند۔ مُلّا جواب داد کہ مہمان نان می طلبد نہ ۔ ۔ ۔ ۔ مارا بمردم خانہ خود چکار است۔ ایں لطیفہ بسمع حسین خاں رسید فرمود کہ بر اہلِ ایں دیار لازم است کہ یگان یگان بار مُلّا را مہمان خانۂ خود نمایند۔ دو زمستاں در ہرات بسر بروند۔ جماعۂ مفسدان بر ملّا تہمت بستند کہ ملّا مذہب ندارد۔ یک ماہ در قید بود۔ شیخ عبد الصمد برادر شیخ بہاء الدین ولد شیخ حسین عبد الصمد د آ ملی قاضی ہرات ملا را طلب داشتہ گفت کہ مُلّا در پئے آزار شما شدند نباشد کہ ایں ماورء بحطایان دست آزار بر شما دراز کنند زود از ایں دیار بدر روید۔ ازاں جا گریختہ بقبۃ الاسلام بلخ آمد بہ نذر محمد خاں و ولی محمد سلطان آشنا شد و پیوستہ در محافل فیض مماثلِ ایشان بار داشتند و در کارواں سرائے ملتانیاں می بودند۔ چوں حجرہائے

سرائے وقف طالب علمان بود بعد ششماہ اجرۂ آں حجرہ از ملا طلب نمودند۔ ملا گفت اگر ایں سرائے وقف طالب علمان ست ما ہم طالب علیم ومنشی ...... اجرہ از ما گرفتن از مروّت بعید واز جادۂ انصاف بس دُور است۔ بمتولی خبر کردند کہ دریک حجرہ مردی بچندیں فضیلت دعوئے می کند و در اداے اجرۂ حجرہ توقف می نماید متولی فرمود۔ مردے کہ ایں ہمہ دعویٰ می کند خالی از حالت نخواہد بود۔ طلبیدہ باید اگر شائستہ اجرہ گزاشتن باشد نگریم ورنہ بستانیم۔ طلبیدہ مجلس داشتند۔ اہلِ مجلس از کلمات نشاط آمیز ومحاورات طرب انگیز مولانا خوش دل گردیدہ گفتند کہ اخوندی حقیقت فضیلت شما بر دوستاں نیک روشن شدہ وایں مردے کہ بہ طلب شما رفتہ بود میر محمد صالح نام دارد ویکی از اکابر زادہائے سمرقند است ودریں روزہا پریشان حال میخواہم کلمۂ چند بر حقیقت ایشاں مرقوم سازند تا در ضمن آن گویائی شما ظاہر گردد۔ در صفت آں چہار ورق املا نمودند۔ بجائے خود نوشتہ خواہد شد انشاء اللہ تعالےٰ[1]

---

[1] اس قصّہ کے اشخاص و واقعات پر نظر ڈالتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ دوپیازہ ۹۰۹ھ سے بہت بعد ہرات وبلخ گیا ہوگا۔ یعنی قرن یازدہم کے عشرہ اوّل یا عشرہ دوم میں ۹۹۰ھ میں ہرات اگرچہ صفویوں کے قبضے میں ہے مگر حسین خاں شاملو اس وقت ہرات کا بیگلر بیگی نہیں ہے۔ بلکہ علی قلی خاں شاملو (صفحہ ۲۵۱ عالم آرای عباسی) اور نہ ولی محمد خاں ونذر محمد خاں بلخ میں مقیم ہیں۔ واقعات اس طرح ہیں کہ عبداللہ خان اوزبک والی توران (۹۹۱ھ و ۱۰۰۶ھ) ہرات

(باقی حاشیہ بر صفحہ ۹۱)

دوسری حکایت اس کی وفات کے ذکر میں ہے۔ جو حسب ذیل ہے ا۔

سنہ ۱۰۲۶ھ میں مولوی المعنوی ملا دوپیازہ نے دارالسلطنت فتح پور[1] میں آکر نورالدین محمد جہانگیر بادشاہ کی ملازمت کی اور چند روز شرف حضوری میں رہے۔ بعد میں اجازت لے کر برہان پور پہنچے اور خان خانان ولد بیرم خاں کے پاس ٹھہرے۔ خان خانان ایک روز مولوی کی تصنیف "علم اللہ" کا سرسری مطالعہ کر کے کہنے لگے۔ مولنا ہم تو تمھاری اس کتاب کا مقصد و موضوع نہیں سمجھ سکے۔ انھوں نے جواب دیا۔ نواب سلامت! یہ موسیٰ اعلیٰ کی

(بقیہ حاشیہ ص ۹۰) :۔ و دیگر امصار خراسان سنہ ۹۹۴ھ میں فتح کر لیتا ہے۔ سنہ ۱۰۰۷ھ تک ہرات پر اوزبکوں کا قبضہ رہتا ہے جبکہ اوزبکوں کی طاقت آپس کی رقابتوں سے پاش پاش ہوجاتی ہے۔ عباس اپنے جلوس کے بارھویں سال میں ہرات پر قابض ہوجاتا ہے اور عنقریب بعد حسین خاں شاملو بیگلربیگی خراسان بنا دیا جاتا ہے۔ عالم آرای عباسی میں مذکور ہے کہ جب شاہ عباس سنہ ۱۰۰۹ھ میں ہرات آتا ہے حسین خان شاملو بیگلربیگی ہرات مراسم استقبال بجالاتا ہے (ص ۱۲۱۴ عالم آرائی عباسی طبع طہران) اسی طرح ولی محمد جو سنہ ۱۰۱۴ھ میں والی توران ہے اپنی تخت نشینی سے پیشتر دیر تک والی بلخ رہا تھا اور نذر محمد ولی محمد کے عہد سلطنت میں والی بلخ تھا۔ ہمارے نزدیک دوپیازہ کی تاریخ سفر ایران سنہ ۱۰۱۰ھ کے بعد ہونی چاہیے۔ جب ہرات میں حسین خان شاملو موجود ہے اور بلخ میں ولی محمد و نذر محمد یا ان دونوں میں سے ایک موجود ہے۔

[1] جہانگیر فتح پور سنہ ۱۰۲۸ھ میں پہنچتا ہے۔ متن میں سنہ ۱۰۲۶ھ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے ؎

کتاب تو ہے نہیں کہ ہر گبرو یہودی اسے پڑھ لے - حاضرین یہ جھک سُن کر بہت بگڑے اور بولے کہ ایسی باتیں تمھارے حوصلے سے بلند ہیں۔ خانخانان نے کہا کہ مُلّا کی باتوں کو ساری دُنیا برداشت کرتی ہے ۔ اس سے جھگڑنا ہماری لیاقت کے خلاف ہے ۔ مُلّا تین سال تک وہاں رہے اور خانخانان کے حق میں کہا "الخانخانان ہچو کعبہ کہ بعد از سالے دروازۂ آن باز شود" ۱۰۲۹ھ میں خاندیس روانہ ہو گئے اور پورے سال بھر ملک عنبر سپہ سالار خاندیس کے پاس ٹھہرے رہے ۔ یہاں پانی کی خرابی سے بیمار پڑے اور وطن پہنچنے کے خیال سے روانہ ہوئے ۔ مانڈو کے راستے میں موضع پالکھری پہنچنے پائے تھے کہ اس دارفانی سے رحلت کی ۔

اشلغی کا قطعہ اور مرثیہ مع اصل فارسی کے ذیل میں درج ہیں :-

(در سنۂ ہزار و بیست و شش مولوی المعنوی ملا دو پیازہ در دارالسلطنۃ فتح پور آمدہ بادشاہ عادل باذل نور الدین محمد جہانگیر بادشاہ ہندوستان را ملازمت نمودند۔ چند گاہ بہ شرف حضور معزز گشتہ بکرم عمیم ممتاز شدند)

شاہ دو پیازہ مفخر دانش ۔۔۔ اوج صیتش بمہر و ماہ رسید
از لطائف فریبی سخنش ۔۔۔ عیش را بر فلک کلاہ رسید
از بحار فضائل کرمش ۔۔۔ در معنی بگوش شاہ رسید

از نہاں خانۂ حصول امل   فوج قدرش بشاہ راہ رسید
نیست بزمی کہ ذکر موعظاش   نہ بگوش گداؤ شاہ رسید
شاعران زمانہ را بسخن   گر بیک گونہ دستگاہ رسید
این بگو فضل راز فیض ابد   تازہ بابی بصد گواہ رسید
اشلغی پور کمتر بینۂ اوست   کہ سخنہاش خصم کاہ رسید

(داز حضرت پادشاہ پناہ رخصت گرفتہ بان پور نزد خانخانان ولد
بیرم خان آمدند۔ روزی جلد "علم اللہ" مولوی مطالعۂ می فرمودند۔ بغور
کتاب نرسیدہ پرسیدند کہ مولانا این کتاب شما را متشاد معاد نفہمیدیم۔
در جواب گفتند کہ نواب سلامت این کتاب موسیٰ و عیسیٰ نیست کہ ہر گبرو
یہود بخواند۔ اہل مجلس بہم بر آمدہ گفتند کہ این سخن شما بغایت از حوصلۂ
روزگار بلند است خانخانان رو باحباب مجلس و اصحاب فضل کردہ فرمودند
کہ تمام اہل عالم و بزرگان عدیم المثال سخن ملا برداشتہ و مادر ہیچیم لائق شان
قابلیت ما نیست، سہ سال در انجا بسر بردند۔ چنانچہ در باب ایشان
فرماید "۔ الخانخانان، ہمچو کعبہ کہ بعد از سالے دروازۂ آن باز شود"۔ در سنہ
ہزار و بیست و نہم روانہ ملک خاندیش گردیدند۔ یک سال کامل در پیش ملک
عنبر سپہ سالار خاندیس گزرانیدند۔ در انجا از گردش آب بیماری پیدا نمودہ
خواستند (خود را) بخاک مالوف رسانند۔ براہ ماندو در قریۂ پالکھیری

آواز ارجعی الی ربک بگوش رحلت نیوش شنیده بحضرت حق شتافتند. آه ازین فلک غدّار هر آفتاب دلی که از مشرق ایجاد سر بر کرده بظلمت کدهٔ مغرب فنایش چون شب چراغ بزیر خاک بخاکستر برابر ساخت و هر طوبیٰ ظلالی که از روضهٔ ازل بآبیاری (قدرت) نشو و نما یافته سرسبز و خورم گردید بدم تیشهٔ اجل (آنرا) در انداخت چنانچه در مرثیهٔ ایشان گوید)

هر کس که شد بعالم مرگیست در قفایش — خورم دلی که ننهد دل در پے هوایش
دل بستگی نجوید دل دادهٔ توکل — بر کار دهر کا دل بر آب شد بنایش
از ابتدای هستی کس نیست واقف از خود — وندر نهایتش گم ز انسان کرا ابتدایش
گشت از عدم مهیا اشخاص نوع عالم — کزو بدو کرد موجود ایزدی فنایش
از مکر دهر ایمن نتوان بزیست یکدم — کاندر دعاش مضمر صد گونه ادغایش
بکشای چشم عبرت بر نفس کز خجالت — افگنده سر ببالین در معرض رجایش
محنت سرای گیتی جای طرب نیاید — کز عیش او مهیا آمد همه جفایش
کو بر نه بست طرفی از دهر جز ندامت — بر خود بدار ماتم بگذر ز ماجرایش
مرد آن جهان دانش کز فوت او جهانرا — بے نور مانده دیده از مهر و از ضیایش
گردون چو او نیارد در دور خویش یکتا — گر عمر جاودانرا بخشد بخون بهایش
خالی بماند عالم از اهل فضل و دانش — چون رخت خویش بربست از دار بے صفایش
شاهان شرق و غربش بودند آرزومند — تا بشنوند حرفی از طبع نکته زایش

در درس علم سنجش کردم سواد روشن ‏ ‏ ‏ از ماضی و مضارع فارغ شدم برایش
مومن نہاد نامش نام و پدر ز اوّل ‏ ‏ ‏ دو پیازہ کرد مشہور از فضل خود خدایش
چوں شد ز دہر فانی ہنگام ماتم او ‏ ‏ ‏ تاریخ فوتش آمد "بہشت باد جایش"
یارب چراغ من ہم روشن بکن چو نامش ‏ ‏ ‏ تا بر زبان دہر است از مدحت و ہجایش

از فضل خویش یارب بر اشلغی بہ بخشا
بر عفو خویش بنگر منگر سوے خطایش

دو پیازہ کے متعلق یہ بیان جو اوپر درج ہوا ہے۔ اُردو خوانوں کے بیان سے بالکل مختلف ہے اور یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے کہ ان کے پاس مُلّا کے صحیح حالات کا بہت کم سرمایہ موجود ہے۔ اُردو والے اس کی وفات سنہ ۱۶۰۰ء م سنہ ۱۰۰۹ھ میں بیان کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ سنہ ۱۰۳۰ء م سنہ ۱۶۲۰ھ میں رحلت کرتا ہے۔ جیسا کہ مادہ "بہشت باد جایش" سے ثابت ہوتا ہے۔ اُردو والے اس کا نام ابوالحسن یا عبدالقادر بتاتے ہیں۔ لیکن اصلی نام جو اس کے ماں باپ نے رکھا تھا مومن بلکہ عبدالمومن تھا اور دو پیازہ عرف تھا۔ سلاطین و امرا اس کی عزّت و توقیر کرتے۔ وہ اپنے زمانے میں خاصہ ہر دلعزیز تھا۔ کہ حسین خان شاملو اور خانخانان تک اس کی باتوں کا بُرا نہ مانتے۔ دنیا اس کے لطائف و نکات سننے کی شایق تھی۔ اس کی مدح و ہجو مشہور تھی۔ اشلغی اس کو جہانِ دانش کہتا ہے۔ جس کی رحلت سے عالم ایک دیدۂ بے نور بن گیا ہے۔

اور آسمان کے لیے ایسا مستجمع کمالات شخص پیدا کرنا بہت دشوار ہے۔ وہ اپنی نظم و نثر کے لیے مشہور تھا۔ یہی اشلغی غالباً ملاّ کی ایک اور تالیف (ملستان) سے بعض لطیفے نقل کرتا ہے۔ جن سے میں یہاں صاف سے دو لطیفے جو بعنوانِ ذیل آتے ہیں۔ حوالۂ قلم کرتا ہوں :۔

"ثانیاً فقرۂ چند از دیباچہ و حکایات" ملستان " الہام نشان در جواب گلستان مصلح الدین شیخ سعدی شیرازی رحمتہ اللہ علیہ تصنیف نمودہ اند در رقم آوردہ ":

" الگدائے کوچہ گرد کاسۂ گدائی پر از لقمہ ہائے رنگا رنگ، گدائیدہ در کنج حجرۂ نشستگاہ چوں نکبتیان ساختہ بہ کیفیت گز رخشک و تر خائیدہ آب نوشیدہ " الفاتحہ آلت گدائے " مع " الاخلاص ریش خند بزرگان " بتکبیر دراز بخواندہ۔ یکبارگی " السپاہی زبون بین " گدائے را بچند لگد خاطر خواہ نواختہ اعتراضید کہ ایں گیدیانِ چند رزاق علی الاطلاق خدائے را بدآموز ساختہ جائے کہ پارچۂ گدائی خوردہ قانع بریں شکر باشند ما یا نرا شراب و کباب چہ نوع سرانجام آید ":

" روزے فرعون لعین خوشۂ انگور در دست داشت و در بزرگی و برّاقی او ملاحظہ می نمود۔ اندراں حالت ابلیس در رسید فرعون از روئے تعجّب پرسید کہ کسے ایں خوشہ را مروارید تواند کرد۔ ابلیس یکے از اسمائے رب العزّت

براں دمید۔ فی الحال مروارید شد۔ فرعون بحیرت ماندہ گفت کہ تو دریں کار بسیار اوستادی۔ گفت مرا بایں استادی بہ بندگی قبول نکردند تو می خواہی باین جماعت دعوائے خدائی بکنی۔"

ملاحت مقال میں ملاّ کے بعض لطائف درج ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک بھی محمد کامل کی تالیف میں نہیں ملتا۔ ان لطائف میں ایک یہ ہے کہ شاہِ عرب نے مُلاّ کا نام پوچھا۔ اس نے کہا دوپیازہ۔ بادشاہ نے ایک مُرغا منگوایا اور کہا کہ اس مُرغ سے بھی تو دوپیازہ تیار ہُوا کرتا ہے۔ مُلاّ نے جواب دیا ؎

نسبت ایں مرغ بہ من کے رسد
تاج بر سر دارد وگُہ مے خورد

شاہِ ایران مُلاّ سے پوچھتا ہے کہ تم کون ہو؟ وہ جواب دیتا ہے۔ 'پسر خدایم' بادشاہ نے کہا اگر ایسا ہے تو تم اس قلماقنی کی آنکھیں بڑی کر دو۔ ملاّ نے جواب دیا کہ فراخی چشم اختیار پدرم و فراخی .... باختیار من۔

شاہِ ایران ایک روز مُلاّ دوپیازہ کو شکار پر لے گیا اور ایسا گھوڑا چڑھنے کو دیا جو پچھلی طرف سے آواز کرتا۔ مُلاّ بار بار مُنہ موڑ کر کہتا ہاں ہاں۔ بادشاہ نے پوچھا کہ گھوڑا کیا کہتا ہے؟ مُلاّ نے جواب دیا۔ پوچھتا ہے کہ شاہِ ایران انھیں کا نام ہے؟ میں کہتا ہوں ہاں ہاں۔

ایک دن مُلاّ اپنا گھوڑا داغ کرانے کچہری لے گیا۔ شنکر داس نامی مشرف نے کہا کہ اسپ ہیچو خر داغ نمی شود۔ اسے واپس لے جاکر مُلاّ نے فی البدیہ یہ بیت کہا ؎

اسپ من اسپی است اسپ دیگران چوں خر است .. ..

ہندوستانی سپیکولیٹر نے جو بعض لطیفے ملاّ کے نام پر دے ہیں۔ ان میں سے کئی ملاحت مقال میں دوسرے اشخاص کے نام پر دئے ہیں۔ مثلاً مُلاّ دو پیازہ کا ایک روز زمین میں جھک کر دیکھنا۔ بیربل کا اس سے پوچھنا۔ زمین میں کیا ڈھونڈ رہے ہو؟ مُلاّ کا جواب دینا کہ اپنا باپ تلاش کر رہا ہوں وغیرہ وغیرہ۔ یہی لطیفہ کسی قدر فرق کے ساتھ ملاحت مقال میں یوں مذکور ہے کہ اکبر نے دریافت کیا کہ بیربل کی اولاد میں سے اگر کوئی لطیفہ گو ہو تو ہمارے پاس لاؤ۔ لوگوں نے کہا ہے تو سہی مگر حضور اس کی باتوں کو برداشت نہیں کریں گے۔ آخر بادشاہ کے اصرار پر ایک کو لایا گیا جو زمین کو دیکھتے ہوئے آیا۔ بادشاہ نے پوچھا۔ زمین میں کیا دیکھتا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ ایک عرصے سے میرا باپ اس میں گم ہو گیا ہے۔ اس کی تلاش کر رہا ہوں۔ بادشاہ نے کہا۔ اگر ہم تیرے باپ کو ڈھونڈ نکالیں تو، جواب دیا۔ آدھا آدھا بانٹ لیں گے۔

ملاحت مقال میں ایک اور قصہ ہے جس میں کوئی شخص ایک عورت کے ساتھ

بدفعلی کا مرتکب ہوتا ہے محمد شاہ بادشاہ کو معلوم ہوتا ہے۔ وہ فولاد خاں کوتوال کو حکم دیتا ہے کہ اس گندے شخص کا پتہ لگاؤ۔ کوتوال کے آدمی تلاش کو جاتے ہیں۔ اور ایک ایسے شخص کو جو موری کے پانی سے انگلیاں تر کر کے پان میں چونا لگا رہا تھا، لے آتے ہیں۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ مجرم یہی شخص تھا۔ یہ قصّہ بھی ہندوستانی سپیکولیٹر نے مُلّا دوپیازہ کے نام پر دیا ہے اور محمد شاہ کی جگہ اکبر کا نام بدل دیا ہے۔

شفیق اورنگ آبادی تذکرۂ گلِ رعنا میں جس کا یہ التزام ہے کہ صرف شعرائے ہند مذکور ہیں۔ مُلّا دوپیازہ کو 'مشاہیر ظرفائے زمان و معاریف خوش طبعان ہندوستان میں شمار کرتا ہے۔ جو جلال الدین محمد اکبر کے عہد میں ہو گزرا ہے۔ شفیق کہتا ہے کہ میں نے مُلّا دوپیازہ کے قبر کی زیارت کی ہے جو قصبۂ ہنڈیا میں ہے یہ قصبہ دریائے نربدا کے ساحل پر آباد ہے اور قبر سنگِ سرخ کی بنی ہوئی ہے۔ اس کا رسالۂ اقوال مشہور ہے جو بطریق رسالۂ اقوال عبید زاکانی ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ گلِ رعنا کا ورق اس مقام سے دیمک خوردہ ہے۔ اس لیے میں مُلّا کے پورے حالات اس مخطوطہ سے نقل نہیں کر سکتا۔

دوپیازہ کے النامہ یا مرآت المضحکین کے دو نسخے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانہ میں ہیں۔ ایک کا نمبر ۹۳۹ (د) فہرست آئیونات بسنہ ۱۹۲۴ء ہے۔ دوسرے کا نمبر ۶۷۶ فہرست آئیوناف (مجموعہ کرزن) بسنہ ۱۹۲۶ء ہے۔

تذکرہ روز روشن میں مظفر علی صبا لکھتے ہیں کہ ان کا نام مُلّا عبدالمومن دہلوی ابن مُلّا ولی محمد عرف مُلّا دوپیازہ ہے۔ ہر قسم کے علم و فضل سے ان کو کافی حصّہ ملا تھا۔ ترکی زبان دانی میں بے نظیر تھے۔ چونکہ طبیعت پر ہزل و مزاح کا رنگ غالب تھا۔ اس لیے ان کی علمی فضیلتوں کو چمکنے کا موقع نہیں ملا۔ ایک عرصے تک نواب آصف جاہ نظام الملک بہادر فتح جنگ کی رفاقت میں رہے اور قصبۂ ہنڈیا[1] میں جو قصبۂ چھپیا نیر سے من مضافات بھوپال ایک روز کے

---

[1] ہنڈیا ضلع ہوشنگ آباد میں ایک قدیم اسلامی قصبہ جو ساحل دریائے نربدا پر دکن کی طرف واقع ہے۔ یہاں ایک مسمار شدہ قلعہ ہے جسے کہتے ہیں ہوشنگ شاہ غوری والی مالوا نے تعمیر کیا تھا یہ قصبہ ہتیول میو سڑک پر اوّل الذکر سے اسّی میل شمال مغرب میں اور آخر الذکر سے نوّے میل مشرق میں ملتا ہے۔ عہد اکبری میں ایک سرکار یا ضلع کا صدر مقام تھا جو آگرہ دکن کی قدیم سڑک پر آتا ہے۔ اس کے کھنڈرات سے جو دُور دُور تک پھیلے ہوتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ میں کثرت سے آباد تھا۔ سنہ ۱۸۴۴ء میں مہاراجہ سیندھیا نے سرکار کمپنی کے حوالے کر دیا۔ سنہ ۱۸۶۱ء میں سرکار انگریزی نے بعض علاقے کے بدلے میں جب پرگنہ نیماور ریاست اندور کے حوالے کیا۔ ہنڈیا بھی جو داخل نیماور تھا اندور میں شامل ہو گیا۔" (امپیریل گزیٹیر جلد پنجم صفحہ ۳۰۹ از ہنڈور یاست ہائے وسطی ہندوستان بسلسلہ گزیٹیر ریاست اندور جلد دوم صفحہ ۲۱۱ از سی ای لارڈ سنہ ۱۹۰۸ء)

ہنڈیا۔ ہردا تحصیل ضلع ہوشنگ آباد میں دریائے نربدا کے کنارے پر ہردا تحصیل سے تیرہ میل شمال میں واقع اور اس کے ساتھ ایک پکّی سڑک سے ملحق ہے۔ مردم شماری انیس سو۔

(باقی حاشیہ بر صفحہ ۱۰۱)

راستہ پر واقع ہے۔ انتقال کیا اور مزار بھی وہیں ہے۔ (اتراک عالمگیری) ترکی لغت
ان کی تصنیف ہے۔ اس میں بادشاہ کی مدح میں لکھا ہے :۔

شعلۂ قہرش بدریا گرفتد　　آب خاکستر بیک دم می شود
روے تیغش کے بود آلودہ زنگ　　دارد از خون مخالف آب و رنگ

(بقیہ حاشیہ ص۱۰۰) ۔ کئی لحاظ سے ضلع بھر میں سب سے دلچسپ مقام ہے۔ اس کی تاریخ اساطیری ایام تک پہنچتی ہے۔ اس کے قریب جمدگنی اور سہسرارجن ہزار ہاتھ والے راجہ کے درمیان ملاقات ہوئی۔ قصبہ کا نام نذیرالدین شاہ بلخ کے نام سے متخرج ہوتا ہے جو فقیر بن کر ادھر یہاں آ کر آباد ہو گیا اور ہنڈیا شاہ ملنگ کے نام سے مشہور ہوا جس غار میں وہ رہتا تھا وہ مکہ جا نکلتا تھا۔ اس مقام کی نشانی اب ایک پتھر ہے جس کے لیے کچھ زمین بھی معافی میں ہے۔ تاریخی زمانے میں ہنڈیا کی اہمیت اس کے دہلی اور دکن کے راستے میں دریائے نربدا کے مقام عبور پر واقع ہونے کی بنا پر تھی۔ مغلوں کے زمانے میں بڑے پیمانہ پر آباد تھا۔ گرد و نواح کی پہاڑیوں میں اس کے آثار اس کی وسعت آبادی کی شہادت دیتے ہیں۔ آس پاس کے دیہات ایک زمانے میں شہر قدیم کے محلوں اور شاملات میں تھے۔ تاریخ میں ہنڈیا کا ذکر پہلی بار شاہ غوری والئ مالوا کے وقائع میں پندرھویں صدی کی ابتدا میں ملتا ہے۔ اس کے متعلق مشہور ہے کہ ہوشنگ آباد، ہنڈیا اور جوگا کے قلعے اس نے ایک ہی دن میں شروع کر کے ختم کر دئے تھے۔ آئینِ اکبری میں ہنڈیا صوبۂ مالوہ کی ایک سرکار ہے جس کے جنگلی ہاتھی مشہور تھے۔ یہاں فوجدار اور دیوان کی نشست تھی جو اس پاس کے علاقے کی نگرانی کرتے زوالِ مغل سے قبل ہی نئے راستے نے جو مئو اور برہان پور میں کھلا تھا۔ ہنڈیا کی اہمیت کو

(باقی حاشیہ بر صفحہ ۱۰۲)

آسمان از طوغ او ترسان شدہ — روز و شب بے خویشتن لرزان شدہ

صبا نے صفحات ۲۱۷-۲۲۲ پر مُلّا کا الناصہ بزعم خود تمام نقل کر دیا ہے۔ جو ہمارے نزدیک نصف بھی نہیں ہے۔ وہ مُلّا کا نام عبد المومن بیان کرنے میں اشلنغی کے بیان کی تائید کرتا ہے۔ مگر ہمیں تعجب ہوتا ہے جب وہ دو پیازہ کا زمانہ عہد عالمگیری بلکہ عہد محمد شاہ ۱۱۳۱ھ و ۱۱۶۱ھ بیان کرتا ہے۔ نواب آصف جاہ سے مراد نظام اوّل متوفی ۱۱۶۱ھ ہیں۔ ان کو آصف جاہ کا خطاب محمد شاہ نے ۱۱۳۳ھ میں دیا۔ جب قلم دانِ وزارت عطا کیا ہے۔ عہد عالمگیر میں ان کا خطاب چین قلیچ خان بہادر تھا۔ اندرومن کی چہار گلشن میں دو پیازہ کا مزار ہنڈیا میں بتایا گیا ہے۔

دو پیازہ کی قبر کا ایک اور زائر سید کریم علی میر منشی ریزیڈنسی اندور ہے۔

(بقیہ حاشیہ صد ۱۰۱)۔ گھٹا دیا تھا۔ اٹھارھویں صدی میں مرہٹوں نے ہروا کو مقام حکومت بنا لیا جس سے ہنڈیا کا تنزل اور بھی سریع ہو گیا۔ اس کے قدیم آثار اب بھی قابلِ دید ہیں۔ ہوشنگ کے قلعہ کی بڑی مقدار توریل کے بھرت میں صرف ہوئی ہے۔ لیکن ہنڈیا شاہ ملنگ کے غار کے علاوہ اکبر کے وزیر عبداللہ حسن مصنّف "ملّا دو پیازہ" کی قبر ابھی تک موجود ہے جس کی شہرت بحیثیت ایک مزاحیہ تالیف کے اب بھی قائم ہے"۔ (صوبہ متوسط کی ڈسٹرکٹ گزیٹر۔ ضلع ہوشنگ آباد صفحہ ۲۹۷ از جی۔ ایل کوربٹ و آر۔ وی۔ رسل طبع ۱۹۰۸ء تھیکر اسپنگ اینڈ کو کلکتہ)

سرکاری گزیٹر کی یہ آخری اطلاع جس میں اکبر کا وزیر عبداللہ حسن "ملّا دو پیازہ" کا مصنّف بتایا گیا ہے کسی غلط اساس پر مبنی ہے۔ صحیح یہ ہے کہ ہنڈیا میں خود ملّا دو پیازہ کی قبر ہے۔

جو اپنی تاریخ مالوہ میں بذیل ہنڈیا پیش کرتا ہے :-

ہنڈیا آگے سرکار تھا بڑا شہر غدار تھا۔ مرہٹوں نے اسے یہاں تک لوٹا بالکل اُجڑ گیا۔ چھوٹا گاتو۔ رہ گیا۔ برلبِ نربدا اس شہر کی آبادی تھی۔ کوسوں تک بستی تھی۔ گرد شہر کے شہر پناہ تھا۔ شہر اُجڑ گیا۔ شہر پناہ جنگل میں کھڑا رہ گیا۔ نربدا کے کنارے شہر پختہ بنا تھا۔ مؤلف نے دیکھا تھا۔ اس قلعہ میں ملاّ دوپیازہ کی قبر اور اس قبر کے پیچھے بی بی چپاتی اور میاں قلیا کی دو قبریں اور مسجدیں درگاہیں و مقبرے بے انتہا جنگل میں عمارتیں ہر جا۔"

(تاریخ مالوہ صفحہ ۲۲۵۔ ۱۲۹۰ھ۔ مطبع رتن پرکاش (تلام)

ان چند امور سے جو تمثیلاً میں نے بیان کیے ہیں۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ فارسی کے تمام ذرائع مُلّا کے سلسلے میں ختم ہو چکے ہیں۔ اگر تلاش جاری رکھی جائے گی تو مجھے یقین ہے کہ اس کے باقی ماندہ حالات بھی دریافت ہو سکیں گے لیکن اس مشتے نمونہ خروارے سے اس قدر ضرور واضح ہوتا ہے کہ اُردو خوان اب تک اس کے متعلق صحیح معلومات بہم پہنچانے سے قاصر رہے ہیں۔ اس تعلق میں انھوں نے صرف ہندوستانی سپیکولیٹر کو اپنا راہبر بنا لیا ہے اور جو اعتراض اس کی اطلاعات کے خلاف پیش کیے جا سکتے ہیں۔ وہی اعتراض دوپیازہ کے باقی سوانح نگاروں پر بھی عائد کیے جا سکتے ہیں ؛

میر جعفر زٹلی

ان کی نسبت میں نے پنجاب میں اُردو لکھتے وقت فہرست مخطوطات ہندوستانی انڈیا آفس کی سند پر عبارت ذیل لکھی تھی :-

میر جعفر اصل میں نارنول کے باشندے تھے۔ اور سید عباس کے فرزند ہیں۔ جن کا پیشہ دُکانداری تھا۔ اورنگ زیب کی تخت نشینی اور میر جعفر کی ولادت ایک ہی سال کے واقعے ہیں۔ ان کے بعد دو بہنیں ہوئی تھیں۔ اور پھر ان کے چھوٹے بھائی صفدر ہوئے۔ میر کی کم عمری میں اُن کے والد کے انتقال کا واقعہ پیش آیا۔ چچا نے جن کا نام میر سرور تھا سرپرستی کی۔ مکتب میں تعلیم پانے کے بعد ملازمت کی تلاش میں نکلے۔

اس کے کئی سال بعد ولیم اردن کا بیان ذیل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے جریدے میں میری نظر سے گزرا۔

"حاشیہ بر مرزا جعفر زٹلی نارنولی"۔

زٹلی جس تخلص سے مرزا جعفر اپنے اشعار لکھتا ہے۔ ہندی لفظ زٹل سے جس کے معنی بکنا، باتیں بنانا اور ہرزہ گوئی ہیں۔ ماخوذ ہیں۔ اس کے کلیات کی کئی اشاعتیں ہیں۔ ایک نسخہ جو ڈاکٹر اسپرنگر کی مِلک تھا۔ اب برلن میں کتب خانہ (KONIGLICHE) میں موجود ہے۔ (دیکھو اس کی

فہرست ص۶ ، ص۱۶۳۸ - بیل ص۱۸۶ پر لکھتا ہے کہ وہ شاہی سکہ کے بیت کے جواب میں مضحک نگاری کی بنا پر فرخ سیر کے حکم سے قتل کیا جاتا ہے مورّخ اس واقعہ کا ذکر نہیں کرتے ۔ مگر اس کے وقوع کا امکان ہے ۔ کیونکہ (میر) عبدالجلیل بلگرامی واقعہ نویس سیوستان کو ایک بے ضرر رپورٹ کی بنا پر بلا کر برخاست کر دیا گیا تھا ۔

زٹلی کے بارے میں مزید تفصیل ایک اُردو رسالہ میں ملتی ہے ۔ جس کا نام زر جعفری یعنی سوانح عمری میر جعفر زٹلی ۔ از ہندوستانی سپیکولیٹر ہے (اشاعت جان محمد و محمد اسمٰعیل کشمیری بازار لاہور ۱۸۹۰ء طبع سنگی ۔ تعداد صفحات ۳۶)

اس رسالہ سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اجداد ہمایوں کے ساتھ ہندوستان میں آئے تھے ۔ جب یہ بادشاہ بار دوم ہندوستان آیا اور ہیمو سے جنگ آزمائی کی ۔ یہاں انھیں جاگیر مل گئی اور جہانگیری عہد تک ان پر شاہی مہربانی ہوتی رہی ۔ مگر شاہ جہاں کے زمانے میں جاگیر چھن گئی اور شاعر کا باپ میر عباس کسب معاش کے واسطے دکان کھولنے پر مجبور ہوا ۔ جعفر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جلوس عالم گیری ۱۶۵۸ء (۱۰۶۷ھ) کے وقت اس کی ولادت ہوئی ۔ میر عباس کی دوسری اولاد میں دو لڑکیاں اور ایک لڑکا صفدر نامی) ہے ۔ یہ خاندان بھر میں سب سے خورد اور بڑے بھائی سے ساڑھے پانچ برس چھوٹا تھا ۔ ان کے بچپنے میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا ۔ میر سرور

نے اپنے فرزند اکبر کے ساتھ جعفر کو مکتب میں بٹھا دیا۔ آخر میں سرور نے ان کی تمام جائداد خورد برد کر دی۔ اور ان کی بسر اوقات عسرت کے ساتھ ہونے لگی۔ انتقال کے وقت جعفر کی عمر ساٹھ برس کی تھی۔ لیکن سال وفات معلوم نہیں۔ کلیات میں وہ اپنی ایک رباعی میں کہتا ہے کہ یہ رباعی لکھتے وقت اس کی عمر ساٹھ برس سے زیادہ ہے۔

ذیل کے فارسی شعر تمباکو کی تعریف میں اس کے قلم سے نکلے ہیں:۔

طرفہ شغلی (است) شغل تمباکو — کہ زآن شغل غم فرو گردد
ہمدمست ایں بوقتِ تنہائیؔ — طبع بادی ازو نکو گردد

لیکن اس کی خصوصی طرز ان غزلیات پر منحصر ہے جن میں فارسی اور ہندی الفاظ بصورتِ ریختہ نظر آتے ہیں۔ (پچھلے مغل صفحہ ۲۸۷۔ ۳۶۱ جریدۂ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال جلد ۷۳ سنہ ۱۹۰۴ء)

دو پیازہ کی طرح میر جعفر کے یہ حالات پڑھ کر مجھ کو تعجب ہوا کہ یہ ابتدائی حالات اتنی تفصیل کے ساتھ کس طرح میسّر آ گئے۔ آخر ایک عرصہ کے بعد زر جعفری[1] کی اشاعتِ دوم کا ایک نسخہ مجھے مل گیا۔ جو جان محمد و اللہ بخش

[1] اس کی طبع اوّل کی صراحت فہرست برٹش میوزیم میں حسب ذیل ہے:۔

"زر جعفری یعنی سوانح عمری میر جعفر زٹلی مصنفہ ہندوستانی پیکولیٹر (میر جعفر زٹلی کے مختصر حالات کا خاکہ جس میں اس کے اشعار بکثرت نقل ہیں (لاہور سنہ ۱۸۹۰ء) صفحات ۳۶"

(باقی حاشیہ بر صفحہ ۱۰۷)

تاجرانِ کتب لاہور۔ بازار کشمیری نے عزیزی پریس لاہور میں غالباً ۱۸۹۸ء میں چھپوایا ہے۔ اس نسخہ کو دیکھ کر میری بدگمانی اور بڑھی اور رفتہ رفتہ یہ خیال میرے ذہن نشین ہو گیا کہ ہندوستانی سپیکولیٹر نے یہ کتاب محض اپنے دماغ سے لکھی ہے۔ البتہ کلیات سے ضرور امداد لی ہے۔ اس میں بھی ایک سے زیادہ موقعہ پر لغزش کی ہے۔ مگر ابتدائی حالات جو زیادہ تر اس کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں محض فرضی ہیں۔ ہندوستانی سپیکولیٹر اپنے دیباچہ میں رقمطراز ہے:۔

"سچ تو یہ ہے کہ مورّخ اپنے ہی مسودوں کی کاٹ چھانٹ سے فرصت نہ پاتے تھے۔ تذکرہ نویس اپنے ہی حال و قال میں مست تھے۔ ان کے خیال میں یہ کس باغ کی مولی تھی۔ اس لیے ذکر تک نہ کیا اور کرتے بھی کیوں۔ ان کے زعم میں ان کا ذکر ہی مناسب نہ تھا۔ مگر یہ نہ سمجھے کہ اگر ان کا ذکر اُن کی کتاب میں نہ ہوگا تو اس سے ان کی قدر کیا کچھ کم ہو جاوے گی۔ بلکہ اس سے یہ فائدہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۶) :۔ "فہرست ضمیمہ کتاب مطبوعۂ ہندوستانی در کتاب خانہ برٹش میوزیم صفحہ ۳۳۱ از بلومہارٹ ایم۔ اے۔ ۱۹۰۹ء" بذیل محمد کامل۔

یہی اشاعت الفہرست محمد سجاد مرزا بیگ میں بھی مذکور ہے۔ جہاں مصنّف کا نام محمد کامل اور مطبع کا نام کانپور اور سال طباعت ۱۸۹۰ء دیا ہے۔ دیکھو ۱۹۳۹ء، صفحہ ۳۳۵۔ ہمارے خیال میں کانپور بجائے لاہور غلط چھپ گیا ہے جس طرح محمد کامل بجائے ہندوستانی سپیکولیٹر قبل از وقت ہے۔

ہوا کہ عوام الناس نے ان کی کتابوں کو تو رکھا طاق پر اور ان کے حالات دل ہیں۔ اب چونکہ تہذیب کا زمانہ ہے۔ ہر ایک قسم کی سوانح عمریاں تیار ہیں۔ اس لیے اسے ناظرین جس طرح ہو سکا، اتر سے، پچھم سے، پورب سے، دکن سے جو کچھ ملا ہم آپ کے لیے لائے ہیں"۔

ہماری رائے میں یہ ایک غیر ذمہ دارانہ بیان ہے۔ غور کرنے کا موقعہ ہے کہ جب نہ مورخوں نے اور نہ تذکرہ نویسوں نے جعفر زٹلی کے حالات قلم بند کیے تو آخر یہ حالات جو جزئیات کی حد تک مفصل ہیں کن ذرائع سے حاصل کیے گئے۔ مشرق، مغرب اور اتر، دکن تو کوئی ماخذ نہیں مانے جاسکتے۔ ہندوستانی سپیکو لیٹر کا یہ کہنا بھی غلط معلوم ہوتا ہے کہ تذکرہ نگاروں نے ان کا ذکر تک نہیں کیا۔ میں کہتا ہوں کہ جو کچھ حالات تذکرہ نگاروں نے دئے ہیں مصنّف نے ان سے واقفیت حاصل کرنے کی بھی تو زحمت گوارا نہیں کی۔ زٹلی کا ذکر میر تقی میر۔ شفیق اورنگ۔ میر حسن دہلوی۔ مظفر حسین صبؔا۔ قایم چاند پوری۔ قدرت اللہ خاں قاسم اور منشی کریم الدین وغیرہ اپنی اپنی تالیفات میں تحریر کرتے ہیں۔ ملاحت مقال میں بھی ان کے لطائف مذکور ہیں۔ مگر ہندوستانی سپیکو لیٹر کو ان کا پتہ تک نہیں۔ اب ہم جعفر کے حالات پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں۔

محمد کامل گویا ہیں کہ جعفر اپنے ددہال اور ننہال کی طرف سے مسلّم ہے۔ (جملۂ معترضہ:۔ ولیم اردن کا اس کو مرزا بیان کرنا میر و مرزا کے صحیح مفہوم سے

بے خبری کی دلیل ہے۔ وہ زٹلی کو مرزا جعفر زٹلی اور اس کے باپ کو میر عباس کہتا ہے۔ ایک یورپین سے ایسی غلطی سرزد ہونا معمولی بات ہے)۔

میر کے اجداد ہندوستان اس وقت آئے جب ہمایوں نے بارثانی آکر سوریوں کی طاقت کو توڑا۔ ان کے مورثِ اعلیٰ نے ہیموں کی جنگ میں بڑی بہادری دکھائی اور صلہ میں معافیاں حاصل کیں۔ جہانگیر کے زمانے تک یہ خاندان عزّت و حرمت کی زندگی بسر کرتا رہا۔ شاہ جہاں کے زمانے میں ادبار کے بادل اس پر چھا گئے۔ معافیاں ضبط ہو گئیں اور خاندان پر کالے دن آ گئے۔ فاقوں پر فاقے ہونے لگے۔ سید عباس کی بیوی کشیدہ نکالتی۔ یہ بازاروں میں جا کر فروخت کرتا۔ پھر سید عباس نے ایک دُکان کھولی۔ جس سے اتنا ہوُا کہ پیٹ بھر کر روٹی ملنے لگی اور چار پیسے بچنے بھی لگے۔ ادھر عباس کے افلاس کی خبر دکن میں اس کے ایک قریبی رشتہ دار کو پہنچی۔ اس نے ایک معقول رقم کی ہنڈوی اس کے نام دہلی بھیج دی۔ اس غیر متوقع امداد سے اس نے اپنے کاروبار کو چمکایا اور خوب نفع کمایا۔ حتیٰ کہ اس کا افلاس ایک قصّۂ پارینہ بن گیا۔ جب عالم گیر تخت نشین ہوئے۔ اس وقت میر عباس کے گھر ایک لڑکا پیدا ہوُا۔ جس کا نام میر جعفر رکھا گیا۔ جعفر کے بعد دو لڑکیاں اور ایک لڑکا صفدر نامی اور ہوئے۔ جعفر سب سے بڑا اور صفدر سب سے چھوٹا تھا۔ ان کی عمروں میں ساڑھے پانچ سال کی چھوٹائی بڑائی تھی۔

کچھ عرصے بعد میر عباس اس دنیائے فانی سے عالمِ باقی کو سدھارا اور خاندان کی کفالت اس کے بھائی میر سرور نے سنبھالی۔ اس نے اپنے فرزند اکبر اور جعفر کو مکتب میں بٹھایا اور اکبر کی نسبت جعفر کی بہن کے ساتھ ٹھہرا دی۔ اب میر سرور نے ہاتھ پاؤں نکالے اور بھائی کی جائداد کو ہضم کرنا شروع کر دیا۔ آخر وہ دن جلد آ گیا۔ جب خاندان کو افلاس کا منہ دیکھنا پڑا۔"

ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ میر جعفر کے ان ابتدائی حالات کے لیے ہندوستانی سپیکولیٹر کے پاس کوئی ذریعۂ معلومات موجود نہیں ہے۔ ان کے لیے صرف اس کا تخیّل ذمّہ دار مانا جا سکتا ہے۔

اب ہم زرِ جعفری کے اس حصّہ سے بحث کرتے ہیں۔ جس میں کلیات جعفر زٹلی کے اقتباسات دئے گئے ہیں۔ مگر یاد رہے کہ ان کی شانِ نزول یا عقبی زمین خود ہندوستانی سپیکولیٹر کے اپنے تخیّل کی ساختہ و پرداختہ ہے۔ مثلاً زٹلی تخلص اختیار کر لینے کی وجہ میں مصنّف نے قصّۂ ذیل دیا ہے۔ جس کا میں نے اختصار کر لیا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

جعفر نے اپنے معلّم سے ابو اسحٰق اطعمہ کے چند شعر سُن لیے تھے ؎

جمالِ برّہ بریاں و حسنِ دُنبۂ فربہ — چناں بر دند صبر از دل کہ ترکانِ خوانِ یغمارا
چہ آرائی بمشک و زعفرانِ رخسارِ پالودہ — برنگ و بوی و خال و خط چہ حاجت روئے زیبارا

اس سے جعفر کے ذہن میں یہ بات آئی کہ میں اس کی طرز میں کچھ لکھوں۔ چنانچہ

اس نے اشیائے خوردنی کا مضمون لے کر ایک درخواست کا یوں خاکہ تیار کیا :-

"التماس بندۂ درگاہ داد خواہ موٹی مقدم موضع میتھی پرگنہ پالک من اعمال مودہ سرکار سیم - صوبہ اروی . آنکہ آداب ادرک و کورنشات کدو بجا آوردہ بعز عرض حضرت بادرنگ جی می رساند کہ شریف پرور سلامت - بڑھل باغبان از کٹھل کاردار اتفاق کرد - چچینڈا چغل خور و چولائی چودھری راپیشکار پلول ساختہ از انبہ ایمن وجامن اضافہ ...... از روی تعدی دستی پستہ تمسک توری گرفتہ حوالۂ کریلا کردری نمودہ شلغم شقدار گلورہ ساکن موضع کلگل رابستہ از نارنگی نویسندہ میوہ فوطہ دار وہلدی بوتاد یک جا کردہ سدا بیل سلائی کھرنی کشاد۔"

معلم نے تختی پر جب یہ مضمون دیکھا کہا کم بخت ! بیٹھے بیٹھے کیا ژٹل ہانکا کرتا ہے ۔ بس وہ دن اور آج کا دن ہے کہ جعفر کے نام کے ساتھ زٹلی کا خطاب لگ گیا۔" صہ ۴-۵

مگر فہرست ہندوستانی مخطوطات انڈیا آفس سے معلوم ہوتا ہے کہ حسب بیان منشی محمد الدین مولف حیاتِ زیب النسا، یہ شہزادی زیب النسا ہے ۔ جس نے جعفر کو زٹلی کا خطاب دیا تھا ۔ (فہرست بلومہارٹ نمبر ۱۳، صہ ۷۱ سنہ ۱۹۲۶ء)

ہندوستانی سپیکولیٹر کا بیان ہے کہ زٹلی نے "بھوت بلا رنامہ" اس وقت

لکھا تھا۔ جب اس کے استاد کی بیوی کو آسیب کا خلل ہو گیا تھا اور "کچھوے نامہ" ایک اور نظم تو استاد ہی کے حق میں لکھی تھی۔ گویا سب سے پہلے اُستاد اور اُستانی پر ہاتھ صاف کیا۔ کہتے ہیں اس کچھوے نامے کی بہت شہرت ہوئی۔ چنانچہ شہزادہ کام بخش نے ازراہِ قدردانی بلوایا اور مورچھل اُڑانے پر نوکر رکھ لیا۔

کبھی کبھی خود شہزادہ غزل کی فرمائش کرتا۔ چنانچہ یہ غزل اسی کے ارشاد پر لکھی :۔

اے روی تو چون ماہ شب تار جو ہے سو ۔۔۔ تجھ سا نکوئی دلبر و دلدار جو ہے سو
از غمزۂ خونریز تو افتادہ بہر سو ۔۔۔ بر طشت زمین کشتۂ بسیار جو ہے سو
مثل تو نباشد بجہان اے شہ خوبان ۔۔۔ لٹکندہ و مٹکندہ بر فتار جو ہے سو
از عاشق بیچارہ مکن نخرہ و گھونگھٹ ۔۔۔ تا کے بود ایں گرمئ بازار جو ہے سو
در آتش و آبست چو ماہی و سمندر ۔۔۔ ہر کس کہ بود طالبِ دیدار جو ہے سو
من پنڈت و پرکھنڈت دیران تو ہستم ۔۔۔ در گردنِ من زلف تو زنار جو ہے سو

جعفر چہ کسے باشد و کس باغ کی مولی
بر حُسن تو جبرئیل گرفتار جو ہے سو

مصنّف اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے کہ

"مورچھل والا اگرچہ سگ حضوری سے کم نہیں ہوتا۔ مگر سارا دن میر دربار

کھڑے رہنا جان کا خون کر دینا ہے۔ تنگ آ کے مورچھل کی ہجو کی اور شہزادے کے پاس بھجوائی۔ شہزادے نے عرضی پڑھی لکھا دیکھا:۔

توبہ ازین وسوسۂ مورچھل — دمبدم از دمدمہ جاں در خلل
توبہ ازین (مسکن) پر شور و شر — مرحلۂ پر خطر و خوف و ڈر
از نظر آدمیان شد الوپ — گنبدِ گردون تصدہائے توپ
بان و تفنگ است بہر صبح و شام — تیر و خدنگ است دگر و السلام
خاکِ درین زیستن و زندگی — جان بخلل دل بپراگندگی
روز بہ ہیبت گذرد شب بہ ہول — خاکِ درین زیستن فعل و قول
پرخس و خاشاک بسر ٹوکری — نزد خرد بہتر ازین نوکری

جعفر ازین کوچہ پس مورچل
شرم حضوری مکن ولوٹ چل

اس نظم اور اس کے متعلق ہندوستانی سپیکو لیٹر کی حاشیہ آرائی نے جو اوپر نقل ہو چکی ہے۔ ہمیں پہلی مرتبہ زر جعفری کے ایک غیر تاریخی رسالہ ہونے کے متعلق خبردار کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف فارسی سے نہایت معمولی شناسائی رکھتا ہے اور وہ مورچھل یا مورچال کو جو قلعوں کی تسخیر کے وقت محاصرین خندق کی شکل بنا لیا کرتے ہیں۔ مورچھل یا مگس ران سمجھ بیٹھا۔ اسی لیے اس کا تبصرہ مورچھل اڑانے اور سارا سارا دن کھڑے

کھڑے سوکھتے رہنے کے خلاف ہے۔ وہ یہ سمجھا کہ نظم میں مورچھل کی مذمت کی گئی ہے۔ حالانکہ یہ نظم مورچل (دھس یا دمدمہ مورچا و خندق) سے تعلق رکھتی ہے۔ شاعر اس زندگی کو جو ہر وقت خطرات سے محصور ہے بیان کرتا ہے توپوں کی آواز اور ان کے دھوئیں سے گنبد گردوں آنکھوں سے غائب ہے۔ سحر و شام بان چل رہے ہیں یا بندوقیں چھوٹ رہی ہیں۔ وہ کہتا ہے اس زندگی پر لعنت ہو۔ ہر وقت جان کا خطرہ لگ رہا ہے اور دل دھڑک رہا ہے۔ ایسی نوکری سے مٹی کی ٹوکری ڈھونا ہزار بار بہتر ہے۔ آخر میں کہتا ہے کہ جعفر اس مورچل سے نکل بھاگ اور لوگوں کی شرم حضوری کی مطلق پروا نہ کر۔

لیکن محمد کامل اپنی حاشیہ آرائی جاری رکھتے ہوئے لکھتا ہے کہ "امرا ہی پر موقوف نہیں بلکہ ہر ایک کی نسبت یہ کہا جا سکتا ہے کہ گاہے بہ سلامی بر بخندو گاہی، بدشنامی خلعت دہند۔ شہزادہ کام بخش نے آنکھیں بدل لیں (میر جعفر) مجلس سے پیشاب کے بہانے نکلے اور سیدھا دکن میں جا کے دم لیا۔ محمد کامل یہ سمجھ رہا ہے کہ جعفر اور اس کا آقا کام بخش دونوں دہلی میں موجود ہیں۔ حالانکہ یہ نظم دکن کے کسی قلعہ کے محاصرہ کے وقت لکھی جاتی ہے۔ اور جعفر بجائے دکن کو بھاگنے کے دکن سے لوٹ چلنے کی فکر کر رہا ہے۔

کلیات سے معلوم ہوتا ہے کہ میر جعفر نے ایک مرتبہ جب خان جہان بہادر

کوکلتاش متھرا میں مقیم تھا۔ ایک قرآن اس کی خدمت میں پیش کیا۔ ہدیہ کی امیدیں بہت انتظار کیا۔ لیکن خان کی طرف سے وعدوں کے باوجود کوئی صلہ نہیں پہنچا۔ اس پر زٹلی نے ان کی ہجو لکھی جس کی ردیف "تھکی ڈاڑھی پھٹے مُنہ" ہے۔ محمد کامل بعض بے اصل وجوہ کی بنا پر دونوں میں پرانی عداوت بیان کرتا اور کہتا ہے۔

"دوسرے دن ہی خان جہان کو کلتاش کے متھرا پہنچنے کی خبر آئی۔ جہاں کوکلتاش نے چند ایک دن ٹھہرنا تھا۔ دلّی بھر میں اس کی تعریف ہو رہی تھی۔ جعفر سے یہ کب ہو سکتا تھا کہ دشمن کی تعریف سنے اور چُپ رہے۔ فوراً قلم اٹھا کر قلم بند کیا" (ص۲۷)

اس بیان کا مطلب یہ ہوا کہ جعفر دہلی میں ہے اور خان جہان متھرا میں۔ تب جعفر نے یہ ہجو لکھی۔ حالانکہ اس ہجو سے پایا جاتا ہے کہ خان جہان بے فرمان شاہی متھرا میں آکر مقیم ہو گیا ہے۔ چنانچہ ؎

نیکو کردی نمک حلالی شاباش تیری ہمّت کو
آکر ہندوستان اجاڑی تھکے ڈاڑھی پھٹے مُنہ
بااین خواری اے شرم نداری آمدہ متھرا بنشستی!
تیری سدھ بدھ کن بسیاری تھکے ڈاڑھی پھٹے مُنہ
مطلب خود را پیش آوردی غارت کردی عالم را

کس کارن تم ہمّت ہاری تھکّے ڈاڑھی پھٹے مُنہ

ملک دکن تسخیر تو کردی نام تو اینجا روشن شُد

بڑھے پن میں ایسی خواری تھکّے ڈاڑھی پھٹے مُنہ

جاٹوں کو تیں پیٹھ دکھائی لاج نہ آئی ڈاڑھی کو

تیں بیٹھ کے کھودی ڈنڈیا ساری تھکّے ڈاڑھی پھٹے مُنہ

محمد کامل کا بیان ہے کہ "جعفر دلّی میں مقیم ہے کہ لتنے میں اورنگ زیب کی فتح دکن کی خبر دلّی پہنچی۔ جعفر نے ظفر نامہ لکھ کر بادشاہ کو خوش کرنا چاہا۔ مگر انھوں نے تو پہلے ہی درباری شعرا کو بے روزگار کر دیا تھا۔ جعفر کی دال کیسے گلتی۔ جواب میں یہ فقرہ سُنا ع

اینست جوابش کہ جوابش ندہی

ظاہر ہے کہ جعفر جیسے مُنہ پھٹ اور بے باک نے زبان قلم و قلم زبان سے کہاں تک کام نہ لیا ہوگا۔ غرض جان پر کھیل کر ہجو میں وہ کچھ لکھا جو عالمگیر کے بارے اشاعت نہ پا سکا۔ عالمگیر نے سزا دینا نامناسب سمجھ کر دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ پر عمل کیا جس سے جعفر کے چند دن مزے سے کٹے۔

یہ تمام بیان ایسا ہے جس کی کلیات کوئی تائید نہیں کرتا اور یوں بھی بجائے خود اپنی آپ تردید ہے اور عالمگیر پر حملہ۔ یعنی جعفر نے دلّی میں بیٹھ کر ظفر نامہ لکھا اور بادشاہ کی خدمت میں دکن بھیجا۔ اس وقت حضرت سلامت نے کوئی

شنوائی نہیں کی اور نہ جواب دیا۔ مگر جب ہجو لکھی جو بادشاہ کے خوف سے شائع بھی نہ ہو سکی تو بادشاہ نے بعد خرابی بسیار دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ پر عمل کیا۔ آخر محمد کامل کو یہ ہجو نویسی کا واقعہ کیونکر معلوم ہوا۔

ہندوستانی سپیکو لیٹر کا تمام بیان تقریباً فرضی ہے۔ چونکہ کلیات اس کے سامنے ہے اور اس کی امداد سے جو خاکے اس نے تیار کیے صحیح مانے جا سکتے ہیں۔ مگر چونکہ اس نے ایک واقعہ کو دوسرے واقعہ کی علّت قرار دیا ہے اور ان کو ملانے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے یہاں بھی اس نے کافی ٹھوکریں کھائی ہیں۔

آخر میں اس نے لکھا ہے کہ "میر جعفر کی تاریخ وفات کی تصدیق نہیں ہوتی۔ عمر تخمیناً کچھ ساٹھ سال سے اوپر ہے۔" مگر وہ پہلے لکھ آیا ہے کہ جعفر عالمگیر کی تخت نشینی کے ایام میں پیدا ہوتا ہے۔" اور یہ ظاہر ہے کہ فرخ سیر کی تخت نشینی کے وقت قتل کیا جاتا ہے۔ اس حساب سے اس کی عمر ۶۵ سال کی ٹھہرتی ہے نہ ساٹھ سے کچھ اوپر۔

ہندوستانی سپیکو لیٹر کو شکایت ہے کہ زٹلی کے حالات تذکروں میں نہیں ملتے۔ مگر یہ تذکروں کا قصور نہیں ہے بلکہ اس کا اپنا۔ میں یہاں بعض تذکروں کے بیانات درج کرتا ہوں۔

میر تقی میر نکات الشعرا میں لکھتے ہیں "مشہور تو زٹلی ہے مگر اپنے زمانہ کا عجیب و غریب انسان تھا اور کاٹنے والی زبان کا مالک تھا۔ شرفا لحاظ کرتے

اور کچھ دے دیتے۔ جب کسی کے پاس جاتا دو کاغذ لے کر جاتا۔ ایک پر اس کی تعریف اور دوسرے پر ہجو ہوتی۔ اگر مدارات سے پیش آیا۔ انھوں نے مدح پڑھ دی ورنہ کاغذ ہجو کو شہرت دی جاتی۔ محمد اعظم عالیجاہ کی ہجو سے بھی نہیں چوکا۔ ایک روز شاہزادہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور یہ شعر فی البدیہ اس کی تعریف میں پڑھا ؎

نگین سلیمان کہ تابندہ بود ہمیں اسم اعظم بران کندہ بود

عالیجاہ نے بہت اچھا صلہ دیا۔

ایک روز (مرزا عبدالقادر) بیدل کے ہاں پہنچے اور ان کی تعریف میں یہ مصرع پڑھا ع

چہ عرفی چہ فیضی بہ پیشِ تو چس

مرزا بگڑے اور جلد پیچھا چھڑایا۔ (نکات الشعرا صفحہ ۳۱-۳۲)

شفیق اورنگ آبادی اپنے تذکرۂ چمنستان شعرا میں بیان کرتا ہے کہ جعفر زٹلی ایک مُنہ پھٹ اور بیباک شخص تھا۔ اس کی شوخی اس کے کلام سے ظاہر ہے۔ اس کے اشعار مشہور عالم ہیں۔ صاف روزہ مرّہ میں مضامین اس کے ہاتھ آئے ہیں۔ محمد اعظم شاہ کا قول ہے کہ اگر جعفر میں زٹل نہ ہوتی وہ ملک الشعرائی کے قابل تھا۔ اس کے روزمرّہ اور اندازِ بیان کا رنگ جدا ہے اور اس طرزِ خاص میں خوب جولانی طبع دکھاتا ہے۔ جب جعفر کو کچھ درکار ہوتا کسی امیر کے پاس

دو شعر مدح کے لکھ کر بھیج دیتا۔ اگر اس نے کچھ دیا تو خیر نہیں تو ہجو میں دفتر سیاہ کیا جاتا۔ متصدی اور اہلِ خدمت در کنار خود ظل سبحانی بھی اس کی آتش بیانی سے بید کی طرح لرزتے۔

ایک دن کسی امیر کے ہاں گیا اور اپنے حال کا پرچہ اس کے سامنے گزرانا امیر نے کوئی توجہ نہیں دی اور پرچہ واپس دے دیا۔ جعفر نے پرچہ لیا اور امیر کے سامنے منہ پھاڑ کر چلا آیا۔ حاضرین میں سے کسی نے امیر کو جعفر کا پتہ نشان دیا۔ وہ گھبرایا اور جعفر کو فوراً بلوایا۔ معذرت کرنے لگا کہ میں نے آپ کو پہچانا نہیں تھا۔ جعفر نے جواب دیا۔ اس میں آپ کا قصور نہیں "من پیش بدادم حضرت پس بدادند من چاک نمودم۔ قصہ مختصر امیر موصوف نے اس جملہ ہی پر اپنی رہائی غنیمت سمجھ کر جعفر کو بوجہ معقول رخصت کیا۔

ایک دن جعفر کسی شخص محمد اشرف نامی کی سجع کہہ کر لے گیا ع

محمد اشرف پیغمبران است

شخص مذکور نے مطلق پروا نہیں کی اور شعر کی داد نہیں دی۔ جعفر نے خفا ہو کر فی البدیہہ یہ پیش مصرع بہم پہنچایا۔ ع

نہ ایں اشرف کہ مردودِ زمان است

مہا سنگ نامی ایک محرّر نے جعفر کی کار برآری میں غفلت سے کام لیا۔ اور اپنی تحریر واپس منگوا بھیجی۔ جعفر نے اسی کاغذ کی پشت پر لکھ دیا:۔

مہا سنگھ جی تم بڑے ڈھینگ ہو   گر رنکھیا بیل کے سینگ ہو
وایں جوگ جون غوک رکھتے رہو   لگوڑوں کوڑوں کو چکھتے رہو

(چمنستان شعرا صفحہ ۹۷-۹۶، انجمن ترقی اردو ۱۹۲۸ء)

میرحسن اپنے تذکرے میں اس کو نادرہٴ روزگار کہتے ہیں اور اضافہ کرتے ہیں کہ ادنیٰ واعلیٰ سب اس کا لحاظ کرتے ہیں۔ ان ایام میں لوگوں میں شرم و غیرت باقی تھی۔ اس لیے کچھ دے دلا کر اس سے اپنا پیچھا چھڑاتے تھے۔ آج اگر کسی کی ہجو کی جائے تو وہ اپنی مدح تصوّر کرتا ہے۔ بہرحال میر موصوف مدّح و ہجا میں بے مثل تھے۔

ایک روز میرزا بیدل کے گھر پہنچا۔ میرزا ایک مصرع کی تلاش میں تھے اس لیے متوجہ نہیں ہوئے۔ پوچھا قبلہ کوئی مصرع فرمایا ہے؟ میرزا نے کہا ہاں۔ وہ مصرع یہ تھا ؎

لالہ بر سینہ داغ چون دارد

میر نے کہا۔ اس کے لیے غور و تامل کی کیا ضرورت ہے۔ یہ کہہ کر دوسرا مصرع فوراً پڑھ دیا۔ جس کو عریاں ہونے کی بنا پر حذف کر دیا جاتا ہے۔ قصہ مختصر میرزا بہت برہم ہوئے اور کچھ دے کر اپنا پیچھا چھڑایا۔ (صفحہ ۷، تذکرہ شعرائے اردو)

قائم کا بیان ہے۔ چونکہ سخنوری کی بنیاد اس نے زٹل پر رکھی تھی۔ اس لیے

اسے زٹلی کہنے لگے۔ کلام کو خداداد قبولیّت حاصل تھی۔ عزّت دار لوگ اپنی آبرو کے خیال سے اس کے ساتھ سلوک سے پیش آتے۔ ایک دن مرزا عبدالقادر کے ہاں وارد ہوُا۔ انھوں نے اس کی نظم و نثر سُنی اور چند اشرفی بطورِ انعام مرحمت کیں۔ بروقتِ رخصت زٹلی نے یہ مصرع پڑھا ع

ظہوری و عرفی بہ پیشِ تو ہیچ

(صفحہ ۱۳ مخزن نکات طبع انجمن ترقی اُردو ۱۹۲۹ء)

میر قدرت اللہ خان قاسم مجموعۂ نغز میں رقمطراز ہیں کہ وہ سادات نارنول سے ہے۔ اس کی طبیعت رسا تھی مگر زٹل کہنے پر بہت راغب تھا۔ اس کا قول تھا کہ شعر میں خواہ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کروں۔ فردوسی اور سعدی کا ہم پایہ نہیں مانا جاسکتا۔ زٹل اختیار کرتا ہوں تاکہ ممتاز رہوں۔

(جلد اوّل ص ۱۶۷ مجموعہ نغز)

میں بخوف طوالت منشی کریم الدین کے طبقات الشعرا اور مظفر حسین صبا کے تذکرۂ روز روشن سے اعراض کر کے عرض کرتا ہوں کہ یہ صفحات محمد کامل عرف ہندوستانی سپیکولیٹر کی اپنے موضوع سے بے خبری ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ جو بے اصولی اس نے عبدالمومن عرف ملا دوپیازہ کی حالت میں کی ہے وہی بے اصولی اس نے جعفر زٹلی کے ساتھ برتی ہے۔ دوپیازہ کے سلسلے میں اُردو اہلِ قلم آنکھ بند کر کے اس کے مقلد ہو گئے ہیں۔ جس طرح زٹلی کے باب

میں مغربی مؤلفین ولیم اردن و پروفیسر بلومہارٹ وغیرہ اس کے متبع ہیں۔

یہاں قدرتاً یہ سوال ہوگا کہ آخر یہ سپیکولیٹر یا محمد کامل کون شخص ہے۔ اس سوال کا شافی جواب دینے سے ہم قاصر ہیں۔ ہم اسی قدر وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک مصنف ہے جو کئی تالیفات کا مالک ہے۔ اس کی ادبی کارکردگی کا زمانہ جہاں تک ہمیں معلوم ہے ۱۸۹۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس کی پہلی تصنیف سوانح عمری مُلّا دوپیازہ ہے۔ جو کم از کم پانچ بار چھپ چکی ہے۔ اس کی دوسری تالیف زرجعفری ہے جو اسی سال یعنی ۱۸۹۰ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوتی ہے۔ باقی تصانیف ناول کی قسم سے ہیں۔ ان میں ناول شام نرائن اور پاربتی بہت مقبول ہوا۔ جو ۱۹۲۷ء میں بار نہم طبع ہوتا ہے۔ اس میں ایسی شادیوں کی بُرائیاں جن میں چھوٹا خاوند اور بڑی بیوی یا اس کے برعکس بڑا خاوند اور چھوٹی بیوی ہو۔ ایک دلچسپ قصہ کے پیرایہ میں بیان ہوئی ہے۔ مہاراجہ پٹیالہ نے اس ناول پر مصنف کو خلعت بھی عنایت کیا ہے۔

دلفریب:۔ یہ ناول چار حصوں میں تقسیم ہے جس کے ضمن میں غدر کے حالات اور عیسائی مشنری عورتوں کی عیاریاں، پولیس کی لاپروائی وغیرہ دکھائی گئی ہیں۔

یوسف وجمیلہ:۔ یہ ایک اخلاقی ناول ہے جس میں طالب علمی کے زمانہ کی شادی کی خرابیاں بتائی ہیں۔ اس ناول کو زیادہ اشاعت کا موقع نہیں ملا۔ صرف

ایک مرتبہ چھپا ہے۔ ہم صرف اسی قدر تصانیف کا پتہ لگا سکے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان کے علاوہ اس کی اور تالیف بھی ہوں۔

ابتدا میں تصنیف و تالیف کے لیے اس نے ہندوستانی سپیکولیٹر اپنا نام اختیار کیا تھا۔ مگر ناول شام نرائن اور پاربتی کی اطلاع ذیل سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں محمد کامل نام اختیار کر لیا ہے۔ چنانچہ مرقوم ہے۔ "اکثر احباب کی خواہش تھی کہ "ہندوستانی سپیکولیٹر" نام بہت سے دیسی ناموں میں اچھا نہیں لگتا۔ اس واسطے ہم نے اس کو 'محمد کامل' سے بدل دیا ہے۔"

اس بیان سے ظاہر ہے کہ محمد کامل بھی اس کا اصلی نام نہیں ہے۔ اس عقدے کے حل کی تلاش میں میں محمد کامل کے ناشر ملک چنن الدین خلف فضل دین تاجر کتب سے ملا۔ مگر موصوف کے انکار کی بنا پر مجھے اپنی اُمید میں مایوسی ہوئی۔ ان سے اس قدر معلوم ہوا کہ محمد کامل دہلی کے رہنے والے تھے۔ جو یقیناً صحیح نہیں۔

ایران کا زندہ جاوید شاعر

"فردوسی"

فردوسی کو اس وقت دنیائے ادب میں ایک بین الملی حیثیت حاصل ہے۔ اس کی توصیف و تحسین میں مغرب، مشرق سے پیچھے نہیں ہے۔ شاہ نامہ اگرچہ فارسی خواں مشرق میں بہت مقبول ہو رہا ہے۔ لیکن خود شاعر کے حالات کی تحقیق و تنقید میں مغرب، مشرق سے بازی لے گیا ہے۔ یورپ کے دو مشہور فاضل نلدیکی اور ایتھے نے جس محنت و کاوش سے اس کے زمانے اور حالات پر روشنی ڈالی ہے۔ خود فردوسی کے وطن ایران میں اس کے مقابلے کا کوئی کام نہیں ہو سکا۔

میرے دوست پروفیسر محفوظ الحق اس امر کے محرک ہیں کہ میں فردوسی کی ہزار سالہ برسی کے موقع پر جو ماہ ستمبر میں کلکتہ میں منائی جائے گی چند سطور فردوسی کے حالات میں حوالۂ قلم کروں۔ ان سطور میں مَیں کسی طویل بحث کو تو چھیڑ نہیں سکتا۔

البتہ بعض امور اور عام نتائج جو شاہنامہ کے مطالعہ سے مجھ کو معلوم ہوئے مختصراً یہاں پیش کرتا ہوں۔

فردوسی پر دنیا کی مختلف زبانوں میں، ممالک مشرق و مغرب میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ دنیا نے اس کے حالات کی جستجو میں ہر ممکن ذریعۂ معلومات اور ضروری مآخذ کو چھان مارا ہے۔ ہر قسم کی اطلاع کا کافی ذخیرہ جمع ہو چکا ہے اور اس انبار سے رطب کو یابس سے اور درست کو نادرست سے شناخت کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ ہم یہاں زیادہ تر اس اطلاع پر اعتبار کریں گے جو ہمیں خود فردوسی کے اپنے بیان یا بالفاظ دیگر شاہنامہ سے حاصل ہوتی ہے۔ شاہنامہ کی شہادت اگرچہ مبہم اور مجمل ہے۔ مگر اس کی صحت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اور فردوسی کے اپنے بیان سے زیادہ اور کون سی معتبر شہادت ہو سکتی ہے۔ میں نے بعض موقعوں پر ضرورتاً دیگر ماخذ سے بھی کام لیا ہے۔ ان میں شاہنامہ کا دیباچہ قدیم سب سے پرانا ماخذ ہے۔

فردوسی کا نام ابوالقاسم منصور ہے اور وہ جماعت[1] دہاقین سے تعلق رکھتا تھا۔ اس امر پر تمام مآخذ متفق ہیں۔ دہقان ایران ایک جماعت تھی جو گویا سرکار اور کاشتکاروں میں درمیان کا واسطہ تھی۔ یہ طبقہ ایران میں ساسانیوں کے عہد سے

---

[1] دیباچۂ قدیم کی اصل عبارت یہ ہے۔ "آوردہ اند کہ پدر فردوسی مردے دہقان بود دو فرزند داشت، یکے حکیم ابوالقاسم المنصور الفردوسی و یکے مسعود"

موجود تھا۔ ہر دہقان اپنی اپنی متعلقہ زمین کے مالیے کے لیے سرکار میں ذمہ دار تھا۔ ادھر وہ کاشتکاروں کو زمین بغرض کاشت تقسیم کر دیا کرتا تھا۔ دہقانوں کی جماعت[۱] پانچ طبقوں میں منقسم تھی۔ فردوسی کا جماعت دہقان سے تعلق رکھنا ایک ایسا خیال ہے جس کی تائید بار بار شاہنامہ سے ہوتی ہے۔ شاہنامہ میں اس نے ایسے خیالات و جذبات کا اظہار کیا ہے جو ایک دہقان کو زیادہ مرغوب[۲] ہوں۔ وہ اپنی ذات کے تعلق میں بھی برفباری سے فصل کے ضائع ہونے آمدنی کی اور صورت نہ ہونے اور سرکاری مالیہ سے کسی صورت مفر نہ ہونے پر متفکر[۳] معلوم ہوتا ہے ایک اور موقع پر ژالہ باری سے فصل کی تباہی کا ماتم کرتا دیکھا جاتا ہے۔

شاہنامہ فردوسی کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اس کی تالیف کے سلسلے میں ہمارے اہلِ قلم نے مختلف خیال آرائیاں کی ہیں۔ قدیم تذکرہ نگار بالعموم لکھتے آئے ہیں کہ خود سلطان محمود کو تاریخِ عجم سے بیحد شغف تھا اور وہ مدت سے متلاشی تھا

۱؎ تفصیل کے لیے دیکھو مروج الذہب صفحہ ۲۴۱۔ ۲۴۰ جلد دوم۔ ۲؎ مثلاً دیکھو شاہنامہ طبع کلکتہ صفحہ محمود کی تعریف میں "ز فرش جہاں شد چو باغ و بہار" اور ساتھ کا شعر "ز ابر اندر آمد بہنگام نم"۔ ایک اور موقع پر محمود کو خطاب کر کے لکھتا ہے کہ "جاوید برکس کند آفریں ⁂ بدان شاہ کا باد دار و زمیں"۔ شاہنامہ صفحہ ۱۶۲۴ جلد سوم۔ ۳؎ دیکھو صفحہ ۱۴۸۷ جلد ثالث "بر آید یکے ابر و بر شد بماہ" کے بعد کے اشعار ۴؎ دیکھو صفحہ ۲۰۸۹ جلد رابع اور شعر "تگرگ آمد امسال برسان مرگ" اور بعد کا شعر۔

کہ کوئی ایسا باکمال مل جائے جو اس تاریخ کو نظم کا جامہ پہنا دے۔ یہ اور اس قسم کے دیگر بیانات بالکل غیر تاریخی ہیں۔ خوش قسمتی سے شاہنامہ اس بارے میں کافی روشنی ڈالتا ہے۔ شاہنامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نظم کے لیے دنیا سلطان محمودؔ کی مطلق ممنون نہیں ہے۔ بلکہ ایک نامعلوم عورت کی جو فردوسی کی بیوی تھی۔

بعض وقت چھوٹی باتوں سے بڑے کاموں کی ابتدا ہو جایا کرتی ہے۔ شاہنامہ کے اسباب نظم کی تلاش میں ہمیں اسی قسم کا ایک خفیف واقعہ ملتا ہے جو درحقیقت عظیم الشان شاہنامہ کی تصنیف کا ذمّہ دار ہے۔ شاہنامہ کی تصنیف فارسی ادبیات میں ایک عظیم الشان واقعہ ہے اور بادی النظر میں اس بڑے واقعہ کا ایک رات کی کچھ دیر کی بے خوابی سے کیا تعلق ہو سکتا ہے مگر دعوے کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہی خفیف سا واقعہ شاہنامہ کی تصنیف کا ذمّہ دار ہے۔

اس کے لیے ہمیں طوس کے ایک باغ کا تصوّر کرنا چاہیے جس میں فردوسیؔ لیٹا ہوا ہے۔ باغ سے ملحق اس کا مکان ہے۔ مہینہ کی ابتدائی تاریخوں کا چاند غروب ہو چکا ہے۔ ظلمت چاروں طرف چھائی چھا رہی ہے۔ تاریکی سے باغ کا منظر نہایت بھیانک اور وحشت ناک معلوم ہو رہا ہے۔ ایسی اندھیری رات میں فردوسی تن تنہا باغ میں لیٹا ہوا ہے۔ اس نے نیند کے انتظار میں آنکھیں بند کر لی ہیں۔ کروٹیں بدل رہا ہے مگر نیند ہے کہ نہیں آتی پر نہیں آتی۔ جب وحشت زیادہ غالب ہوئی گھبرا کر اس نے اپنی بیوی کو آواز دی۔ جو مکان میں سو رہی تھی۔ بیوی

بیدار ہو کر باغ میں آئی۔ ہمارے شاعر نے اس سے چراغ لانے کی درخواست کی۔ اس نے حیرت کے لہجہ میں کہا۔ تمھیں آج رات کیا ہو گیا ہے سو کیوں نہیں جاتے۔ بھلا اس قدر رات گئے چراغ کا کیا ہو گا۔ یہاں جواب یہی تھا کہ سو کیسے جاؤں نیند تو آتی نہیں اگر چراغ لے آؤ تو مہربانی ہو گی۔ الغرض چراغ آیا اور اس کے ساتھ کچھ میوے اور جام بھی۔ شراب اور موسیقی کے ساتھ دل بہلایا گیا۔ اس کے بعد اس عورت نے ہمارے شاعر سے کہا کہ میں تمھیں دفتر باستان سے ایک کہانی سناتی ہوں جو رزم بزم اور فریب محبت کے واقعات پر شامل اور سنجیدہ اور دانا لوگوں کے ذکر سے مملو ہے۔ اس کے سننے سے تمھیں آسمان کی نیرنگ سازیوں پر تعجب ہو گا۔ فردوسی نے بڑے اصرار سے کہا کہ اے ماہرو آج کی رات تم یہ داستان مجھ کو ضرور سناؤ۔ بیوی نے کہا میں یہ داستان تمھیں سُناتی تو ہوں۔ مگر تم کو چاہیے کہ سننے کے بعد اس کو نظم کا جامہ پہنا دو۔ فردوسی نے جواب میں کہا کہ ہاں منظور ہے۔ قصہ جس طرح تمھاری زبان سے سنوں گا نظم کر دوں گا۔ اس سے میری پریشان طبیعت کو سکون حاصل ہو گا۔ "اے نیکی شناس مہربان جفت" میں تمھارے اس خیال دلانے کا خدا کی جناب میں شکریہ ادا کرتا ہوں۔ فکرِ شعر میں مزے سے مجھ کو نیند بھی آجائے گی۔[۱]

اس تمہید کے بعد یہ داستان سنائی جاتی ہے۔ یہ خوش قسمت داستان جو فردوسی نے

---

[۱] اوپر کا بیان میں نے داستان بیژن کی تمہید سے ماخذ کیا ہے جو میکن کے شاہنامہ میں ص۷۵۲ سے شروع ہو کر ص۷۵۳ پر ختم ہوتی ہے۔

اپنی بیوی کی زبانی سُنی۔ داستان بیژن تھی۔ داستان بیژن کے واقعات کی کڑیاں کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہیں کہ ان میں جنس لطیف کی تحسین وستایش حاصل کر لینے کا کافی سامان موجود ہے۔ میں یہاں تفصیل میں جانا نہیں چاہتا[1] اور اسی گزارش پر اکتفا کرتا ہوں کہ یہ داستان بیژن ہی تھی۔ جو سب سے پہلے فردوسی نے اپنی اہلیہ کی فرمائش سے نظم کر دی تھی۔ لیکن جب یہ داستان نظم ہو کر شائع ہوئی اور قدر دانانِ کمال نے اسے دیکھا اور پڑھا تو دوستوں اور مداحوں کے اصرار نے اسے آخر کار تمام شاہنامہ کی نظم پر آمادہ کر دیا۔

میرا یہ اعتقاد کہ داستان بیژن سب سے پہلی داستان ہے جس پر فردوسی نے قلم اٹھایا ہے۔ ان بعض داخلی اور خارجی دلائل کے زیرِ اثر ہے جن کو میں نے اپنے مضمون "شاہنامہ کی نظم کے اسباب" میں مفصل بیان کیا ہے۔ یہاں ان کے دُہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں یہاں اس قدر جان لینا کافی ہوگا کہ فردوسی شاہنامہ کی نظم کا مستقل ارادہ کرنے سے پیشتر رزم نگاری کے میدان میں شہرت حاصل کر چکا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ فردوسی کا ایک دوست جیسا کہ شاعر نے سبب تالیف میں بیان کیا ہے۔ شاہنامہ کی نظم کی تشویق و تحریص کی غرض سے کہتا ہے ؎

کشادہ زبان و جوانیت ہست سخن گفتن پہلوانیت ہست

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھو "شاہنامہ کی نظم کے اسباب اور زمانہ" رسالہ اُردو ماہ جولائی سنہ ۱۹۲۱ء

(یعنی تم جوان ہو، خوش گفتار ہو اور رزمیہ شعر کہنے کا خوب طریقہ رکھتے ہو) یہ شہرت ہم کہتے ہیں اس کو داستان بیژن کے طفیل حاصل ہوئی تھی۔

علیٰ ہذا فردوسی کے بعض مغربی نقاد جن میں میکنؔ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ کہتے ہیں کہ فردوسی کے بیانات بسلسلہ مدّت نظم شاہنامہ زیادہ تر سرسری اور ناقابلِ اعتبار ہیں۔ مثلاً کہیں یہ مدّت تیس سال کہتا ہے اور کہیں پینتیس معترضین کی نگاہ میں شاہنامہ کے اشعار ذیل ہیں ؎

سی و پنج سال از سرائے سپنج بسے رنج بردم بامید گنج

چو برباد دادند رنج مرا نہ بد حاصلے سی و پنج مرا

صفحہ ۲۰۹۵ جلد چہارم

بسے رنج بردم دریں سال سی عجم زندہ کردم بدیں پارسی

صفحہ ۶۵ جلد اوّل

اعتراض اگرچہ بظاہر معقول ہے مگر صحیح نہیں کیونکہ فردوسی اس تیس سال میں جملہ مدّت نظم شاہنامہ شامل کر رہا ہے۔ لیکن جب وہ پینتیس سال کہتا ہے تو اس میں وہ داستان بیژن کا زمانہ بھی شامل کر لیتا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ شاہنامہ کی نظم کے مستقل ارادے سے پانچ سال پیشتر وہ داستان بیژن لکھ چکا ہے۔ یہ مان کر کہ شاہنامہ اس نے سنہ ۳۷۰ھ میں شروع کیا۔ داستان بیژن کو اس سے پانچ سال قبل یعنی سنہ ۳۶۵ھ کے گردو پیش میں لکھا جانا چاہیے۔

جب دوست و احباب کی تحسین آفرین نے فردوسی کو آخرکار شاہنامہ کی نظم کے لیے آمادہ کر دیا تو ذخیرہ فراہم کرنے کی نیت سے سب سے پہلے اسے بخارا جو ان ایام میں ساسانیوں کا پایۂ تخت تھا جانا پڑا۔ یہاں اسے شاہنامہ کے مکمل نسخہ کے حاصل کرنے کی امید تھی ؎

دل روشن من چو برگشت از وئے　　سُوئے تخت شاہِ جہاں کرد روئے

کہ ایں نامہ را دست پیش آورم　　ز دفتر بگفتار خویش آورم

اس تلاش میں وہ مرو، بلخ اور ہرات کا بھی سفر اختیار کرتا ہے۔ ہرات میں پیر خراسان ماخ سے ملتا ہے۔ داستان ہرمز[۱] فردوسی کو اس سے ملتی ہے۔ مرو میں احمد بن سہل کے یہاں آزاد سرو سے مل کر داستان شغاد[۲] کے واقعات معلوم کیے بلخ میں کسی موبد سے خسرو پرویز کی گرفتاری کے حالات دریافت کیے ؎

چنیں یاد دارم ز موبد بہ بلخ[۳]　　بخسرو چو شد ایں جہاں تار و تلخ

الغرض جہاں جہاں گیا اپنی تلاش میں مصروف رہا اور جس جس سے ملا کچھ نہ کچھ معلومات حاصل کیں ؎

بہ پرسیدم از ہر کسے بے شمار　　بترسیدم از گردش روزگار

وہ ایک ہنگامہ پرور زمانہ تھا۔ چاروں طرف جنگ و خونریزی کی آگ بھڑکی ہوئی تھی اور مسافروں کو آمد و رفت میں بڑی تکلیف اٹھانی پڑتی تھی ؎

زمانہ سرائے پر از جنگ بود　　بجویندگاں بر جہاں تنگ بود

۱؎ صـ۱۷۹۱ جلد چہارم ۲؎ صـ۱۲۲۹ جلد ثالث ۳؎ از مخطوطہ شاہنامہ نوشتہ ۷۵۲ھ۔

نوح بن منصور (۳۶۵ھ و ۳۸۷ھ) کا زمانہ طاقتور امرا کی بغاوت اور سرکشی کے لیے مشہور ہے جس میں سیمجوریوں کی مخالفت عرصہ تک قائم رہی۔

جب کوئی کام ہونے والا ہوتا ہے تو خدا غیب سے اس کے اسباب مہیا کر دیتا ہے۔ فردوسی کو ایک قدردان سرپرست کی ضرورت تھی جو اسے فکرِ معاش سے فارغ کر دے۔ اتفاق حسنہ سے یہ مربی بھی اسے مل گیا۔ فردوسی نے اس کا نام شاہنامہ میں بیان نہیں کیا ہے اور صرف توصیفی جملے "مہتر گردن فراز" کے الفاظ سے اسے یاد کرتا ہے۔ یہ رئیس خواہ کوئی ہو مگر گمان ہوتا ہے کہ سیمجوریوں کے متوسلین سے تھا کیونکہ ان ایام میں خراسان انھیں کے قبضہ میں تھا اور شاید یہی وجہ ہے کہ فردوسی نے اس کا نام جب شاہنامہ سلطان محمود کے نام پر معنون کیا شاہنامہ سے دانستہ نکال دیا۔ قصہ مختصر کچھ ایسے اسباب اور واقعات تھے جنھوں نے فردوسی کو بالآخر شاہنامہ کی نظم کے لیے آمادہ کر دیا۔ یہ زمانہ ہمارے شاعر کے لیے بہت مبارک تھا اور مستقبل خوش آئند امیدوں سے معمور تھا۔ جب وہ اپنی عمر کے شصت سالہ مرحلہ پر پہنچا ہے اطمینان اور فارغ البالی اس سے کنارہ کر چکے تھے۔ شاعر اپنے ماضی پر ایک نظر بازگشت ڈالتا اور اس زمانہ کو خوش فال اور مبارک مانتا ہے گویا شاہنامہ کے آغاز کا زمانہ اس کی زندگانی کا گل دگلزار تھا۔ اس وقت اس کی عمر اڑتالیس سال کی تھی۔ چنانچہ لکھتا ہے ؎

چل و ہشت بد عہد نوشیرواں تو بر شصت رفتی نمانی جواں[1]

---

[1] خاتمہ جلد ثالث۔

یہاں یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی نے شاہنامہ کی داستانیں موجودہ ترتیب میں نظم نہیں کی ہیں۔ بلکہ مختلف موقعوں پر متفرق داستانیں نظم کر کے بعد میں انھیں موجودہ یا تاریخی ترتیب میں منسلک کر دیا ہے۔ اس طرح شاہنامہ کی داستانیں تین دوروں میں منقسم کی جا سکتی ہیں۔ پہلا طوسی دَور۔ اس سے مُراد وہ بیس یا اٹھارہ سال کا زمانہ ہے جو فردوسی نے غزنی پہنچنے سے پیشتر طوس میں شاہنامہ پر صرف کیا اس مدت میں وہ موجودہ چار جلدوں سے تقریباً ڈھائی یا پونے تین جلد کا ذخیرہ نظم کر چکا تھا۔ دوسرا غزنوی دَور ہے۔ جس میں وہ ایک جلد یا اس سے کچھ زیادہ نظم کر چکتا ہے۔ غزنی میں اس کا قیام کم از کم چھ سال تک رہتا ہے۔ اس کے بعد سلطان کی طرف سے مایوس ہو کر وہ غزنی سے رخصت ہو جاتا ہے۔ اب ایک آخری دَور شروع ہوتا ہے۔ جس میں فردوسی شاہنامہ کا بقیہ حصہ نظم کر کے کتاب کو ختم کر دیتا ہے۔ اس دَور میں اس کا سرپرست اور کفیل حسین بن قتیب یا حییّ قتیب ہے۔

طوس میں فردوسی نے جو بیس یا اٹھارہ سال کا زمانہ گزرا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اکثر حصہ فراغت اور اطمینان کے ساتھ بسر ہؤا ہے۔ اور جو داستانیں اس دَور میں لکھی گئی ہیں، زور اور جوش میں بے مثال ہیں مثلاً داستان زال، داستان سہراب اور داستان بیژن غزنی کے قیام کا زمانہ اگرچہ دربارِ شاہی میں گزرا ہے۔ سلطان کے شاعر کے ساتھ اچھے تعلقات ہیں مگر اسے اطمینان نہیں

ہے۔ اس دور میں اسے بیحد محنت اور تندہی سے کام لینا پڑا ہے۔ اور وہ چوتھائی شاہنامہ سے زیادہ نظم کر ڈالتا ہے۔ داستان رستم و اسفندیار اس عہد کی شاعری کی بہترین مثال ہے۔ طوس اور غزنوی دور کے کلام کی شناخت کے لیے ہمارے پاس یہ معیار ہے کہ ایک میں سلطان محمود کی مدح موجود ہے اور ایک میں نہیں ہے۔ اگرچہ بعض ایسی داستانیں بھی ہیں جن میں شاعر نے نظر ثانی کرتے وقت محمود کی مدح میں ایک آدھ بیت کا اضافہ کر دیا ہے۔

اپنی عمر کے اٹھاونویں مرحلہ تک شاعر طوس میں بیٹھا ہوا نہایت فراغت کے ساتھ اپنی نظم میں مصروف رہا ہے۔ اس سال اس پر کئی انقلاب گزرتے ہیں۔ جن میں ایک مالی نقصان کی شکل میں ہے ؎

ازاں پس کہ بنمود پنجاہ و ہشت　　بسر بر فراواں شگفتے گزشت[۱]

اس کے بعد وہ کئی موقعوں پر اپنی تنگ دستی اور پریشان حالی کا شاکی نظر آتا ہے ؎

بجائے عنانم عصا داد سال　　پراگندہ شد مال و برگشت حال[۲]

دو گوش و دو پائے من آہو گرفت　　تہی دستی و سال نیرو گرفت[۳]

ہمی خورد باید کسے را کہ ہست　　منم تنگدل تا شدم تنگدست

ہمیں کوئی تعجب نہیں ہوگا کہ فردوسی کے پہلے سرپرست "مہتر گردن فراز"

---

۱ ص ۳۷۸ جلد اوّل۔ ۲ ص ۲۸۶ جلد اوّل۔ ۳ ص ۱۲۲۹ جلد سوم۔

نے بھی اسی سال وفات پائی ہو۔ اس وقت شاہنامہ ابھی ابتدائی مراحل طے کر رہا تھا۔ فردوسی نے اس رئیس کا مرثیہ نہایت دردناک الفاظ میں لکھا ہے۔

ان واقعات سے آٹھ یا دس سال بعد دو ایسے واقعے پیش آئے جن سے وہ اپنا وطن طوس چھوڑنے پر مجبور ہوا۔ وہ اپنی عمر کا پینسٹھواں مرحلہ طے کر رہا تھا۔ جب اس کے جوان جہان اکلوتے فرزند کی وفات کا واقعہ پیش آیا۔ فردوسی نے اس کا ایک مختصر مگر دردناک مرثیہ شاہنامہ میں لکھا ہے ؎

نگر بہرہ برگیرم از بندہ خویش　　بیاد آرم از مرگ فرزند خویش

یہ مختصر مرثیہ آج بھی ہمارے کلیجہ پر تیر و نشتر کا کام کرتا ہے۔ اس کے سادہ جذبات آج بھی ہم پر غم کی بجلیاں گراتے ہیں ؎

مرا شصت و پنج و ورا سی و ہفت　　نپرسید ازیں پیر و تنہا برفت

جواں بود ہموارہ با من درشت　　برآشفت و یکبارہ بنمود پشت

پھر فرزند کو خطاب کرکے کہتا ہے ؎

نگر ہمرہان جوان یافتی　　کہ ناگہ زمن روئے برتافتی

اسی واقعہ کے قریب ۳۸۷ھ میں غزنی میں امیر سبکتگین کی وفات اور اسمٰعیل کی مختصر حکومت ختم ہونے کے بعد جو صرف چند ماہ تک رہی دنیا کے اولوالعزم سلطان یمین الدولہ و امین الملۃ نظام الدین محمود غزنوی کا جشن تاجپوشی منایا جاچکا تھا۔

فردوسی بھی غزنی پہنچ جاتا ہے۔ اس کو کسی قدر دان سرپرست کی ضرورت تھی۔ ہمارا شاعر سلطان کی جنگی قابلیت اس کی دلاوری و دیگر جنگی اوصاف سے متاثر ہو کر غزنی کا رُخ کرتا ہے ورنہ اس زمانہ میں اور سلاطین بھی موجود تھے۔ فردوسی اپنی اس خواہش کو ایک خواب کے رنگ میں پیش کرتا ہے کہ خواب میں وہ ایک دربار دیکھتا ہے جس میں ایک بلند اقبال تاجور تخت پر جلوہ فرما ہے۔ فردوسی حیرت سے دریافت کرتا ہے کہ یہ کس بادشاہ والاجاہ کا دربار ہے۔ اسے جواب ملتا ہے کہ تم نہیں جانتے یہ دربارِ محمودی ہے۔

چو کودک لب از شیر مادر بشست　　　بگہوارہ محمود گوید نخست

خواب بالکل ممکن ہے کہ صحیح ہو اور کوئی تعجب نہیں کہ اسی خواب کی بنا پر اس نے غزنی کا رُخ کیا ہو۔ فردوسی اس میں شک نہیں کہ بےحد ذکی الحس تھا اور خوابوں کا بیحد معتقد۔ وہ خواب کو دانش پیغمبری کا ایک جزو سمجھتا ہے؎

نگر خواب را بیہدہ نشمری　　　یکے بہرہ دانش ز پیغمبری

وہ کہتا ہے کہ حساس طبائع آئندہ واقعات کا عکس خواب میں دیکھ سکتی ہیں؎

روانہائے بیدار بیند بخواب　　　ہمہ بودنیہا چو آتش بر آب

غزنی پہنچ کر وہ ابوالعباس فضل بن احمد وزیر اوّل سلطان کی معرفت یا امیر المظفر نصر بن سبکتگین کے ذریعہ سے سلطان کی خدمت میں رسائی حاصل کرتا ہے اور ۳۸۹ھ سے ۳۹۴ھ کے اختتام تک یا اپنی عمر کے پینسٹھویں سال سے لے کر اکہترویں سال کے اختتام

تک مستقلاً غزنی میں رہتا ہے اور شاہنامہ پر دن رات مصروف ہے ؎

چو بگذشت سال از برم شصت و پنج　　فزوں کردم اندیشہ در دو رنج

اس چھ سال کی مدت میں اس نے باقی شاہنامہ تقریباً ختم کر دیا ہے سلطان محمود کے ساتھ اس کے تعلقات بہت اچھے ہیں۔ دربار میں اس کی آمد و رفت ہے۔ بعض داستانیں وہ سلطان کی خدمت میں سناتا ہے۔ داستان ہفت خوان اسفندیار اس نے غالباً دربار میں سنائی ہے ؎

اگر شاہ پیروز بپسندد ایں　　نہادیم بر چرخ گردندہ زیں

داستان بابک کی تمہید میں بھی ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ داستانیں محمود کو سناتا رہا ہے ؎

ز ساسان و بابک چہ داری خبر　　بخواں ہیں بشہ بر ہمہ سر بسر

ایک عجیب امر یہ ہے کہ وہ اکثر اولوالعزم سلاطین مثلاً کیخسرو، سکندر اعظم اور نوشیروان عادل کی داستانیں خاص طور پر محمود کو خطاب کر کے لکھ رہا ہے۔ شاعر اپنی دیرینہ عمری سے فائدہ اٹھا کر کئی موقعوں پر سلطان کو نصیحت و پند بھی کرتا ہے۔ ایک موقع پر محمود کو خطاب کر کے کہتا ہے ؎

اگر داد گر باشی اے شہریار　　بگیتی بمانی یکے یادگار

کہ جاوید ہر کس کند آفریں　　بداں شاہ کا باد دارد زمیں[۱]

---

[۱] صفحہ ۱۶۲۴ جلد سوم

اس کے علاوہ اور موقعے ہیں جہاں وہ سلطان کو نصیحت کرتا نظر آتا ہے ؎

زدانا سخن بشنو اے شہریار چناں را بدینگونہ آباد دار[۱]

اس مدت میں جو بعض اہم واقعات محمودی تاریخ میں پیش آتے ہیں۔ فردوسی ان کی طرف بھی ایما کرتا ہے۔ مثلاً تخت نشینی کے بعد سلطان نے ایک سالہ خراج کی معافی کا اعلان کیا ہے۔ فردوسی اس کا ذکر کر رہا ہے ؎

کہ سالے خراجے نخواہد زپیش زدیندار بیدار و از مرد کیش

خلیفہ بغداد القادر باللہ سلطان کو یمین الدولہ امین الملۃ کا خطاب بھیجتا ہے فردوسی کے ہاں اس کی طرف بھی ایک اشارہ ہے۔

یمین و دل شاہ محمود باد ہمہ کار ....

جب محمود کے حملات ہند شروع ہو جاتے ہیں وہ ان کی طرف بھی ایما کرتا ہے ؎

جہاں بستد از مردم بت پرست بدیباے دیں بردل آذیں بہ بست

ایک اور موقع پر لکھا ہے ؎

جہاں بستد از بت پرستان ہند بہ تیغے کہ دارد چو وحشی پرند

شاہنامہ میں آخری تلمیح سیستان میں کان طلا کے انکشاف کے متعلق ہے۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ ۳۹۴ھ میں سیستان میں زلزلہ آنے کے بعد سونے کی کان دریافت ہوئی جو ایک اوندھے درخت کی مانند تھی۔ اور جس قدر اسے زیادہ کھودتے تھے زیادہ

۱؎ داستان خردمندی اردشیر۔

پھیلتی جاتی تھی۔ تاریخ میں اس کان طلا رکا ذکر آتا ہے۔ قاضی احمد غفاری نگارستان میں اور فرشتہ اپنی تالیف میں اس کا ذکر کرتے ہیں۔ فردوسی اس واقعہ کو سلطانی اقبال و فر کی دلیل مانتا ہے۔ چنانچہ ؎

زخاور بیار است تا باختر   پدید آمد از فرّ او کانِ زر[ل]

سلطان کے علاوہ غزنی میں سلطان کے وزیر فضل بن احمد اور سلطان کے بھائی امیر نصر سے بھی خوشگوار تعلقات تھے۔ شاہنامہ میں دونوں کا ذکر ایک سے زیادہ موقعوں پر آتا ہے۔ دستور شاہ کا فردوسی ایک موقعہ پر شکریہ بھی ادا کرتا ہے ؎

ز دستور فرزانۂ داد گر   پراگندہ رنج من آمد بسر

فردوسی کی عمر کے اکہترویں سال میں شاہنامہ تقریباً ختم ہو جاتا ہے جسے سال ہجری ۳۹۴ سنہ سمجھنا چاہیے۔

اس وقت بعض وجوہ کی بنا پر جن کی اصلیت سے ہم ناواقف ہیں۔ سلطان ہمارے شاعر کے ساتھ بے التفاتی کا سلوک روا رکھتا ہے اور اس انعام و اکرام سے جس کی شاہنامہ کے اختتام پر سلطان سے اس کو امید تھی محروم رکھا جاتا ہے۔ ہمیں یہ نہیں معلوم کہ کن اسباب کے ماتحت سلطان اس سے ناراض ہوا۔ اور کوئی تعجب نہیں

[ل] مگر دیوان فرخی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کان زر کوہ زرویاں میں تھی جو غزنی کے قریب تھا۔ چنانچہ ؎
بگفت اندر نقصان بجا پدید آید؛ کہ باشد او را ہمسایہ کوہ زرویاں (فرخی ص ۲۵۳ طبع طہران) دیگر ؎
بدہ چنداں کہ در دہ سال ازاں کشور خراج آید؛ بہ یک ہفتہ بر آید مر ترا از کوہ زرویاں (ایضاً ص ۲۵۹)
دیگر ؎ اگر نیستے کوہ غزنی توانگر؛ بدیں سیم رویندہ و زر کانی (ایضاً صفحہ ۲۹۵)

اگر خود ہمارا شاعر بھی اس کے حقیقی باعث سے بے خبر ہو۔ مشرقی درباریوں میں ایک شخص کی کامیابی اور ناکامی کچھ اس قدر اس کے اپنے استحقاق کی بنا پر نہیں ہوتی جس قدر کہ اس کے حامی کی حمایت اور دسترس پر منحصر ہے۔ یہ بہت ممکن ہے کہ ایک مستحق شخص اپنے مقصد میں محروم رہے اور ایک غیر مستحق شخص محض اپنے حمایتی کی بنا پر کامیاب ہو۔ سلطان کے یہاں فردوسی کی کامیابی اس کے اپنے حامی کے اثر کی بنا پر ہو سکتی تھی۔ بہر حال یہ امر واقعہ ہے کہ فردوسی کو سلطان کے دربار سے بے نیل مرام جانا پڑا۔ ہم ان بیانات سے قطع نظر کر کے جو فردوسی کے تذکرہ نگاروں نے دیئے ہیں کہہ سکتے ہیں کہ پیاسا کنویں سے اور قطرہ دریا سے محروم گیا۔ داستان شیریں و خسرو کی ابتدا میں فردوسی اپنی ناکامی کا ایک نہایت تعجب اور حیرت کے لہجے میں ذکر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ کتاب جس میں ساٹھ ہزار اشعار ہیں۔ حالانکہ ابھی تک فارسی میں تین ہزار شعر سے زیادہ تعداد کی بھی کوئی تصنیف موجود نہیں ہے۔ اس تالیف سے میرے منتقدین کمزور اور خراب اشعار کی زیادہ سے زیادہ تعداد پانچسو نکال سکتے ہیں۔ اب ایسا سلطان جو دنیا کے سلاطین میں ممتاز ہے اور فیاضی میں مشہور۔ میں تعجب سے دیکھتا ہوں کہ اس نے میری کتاب کی طرف مطلق توجہ نہیں کی جو سراسر میری کوتاہ نصیبی اور میرے دشمن کی بدگوئی کی بنا پر ہے۔ دشمن نے میرے معاملات میں دراندازی کی اور بادشاہ کے سامنے میری عزت و حرمت بالکل تباہ ہو گئی ۔

بود بیت شش بار بیور ہزار سخنہائے شائستۂ غمگسار

نہ بیند کسے نامۂ پارسی ۔۔۔ نبشتہ بابیات صد پارسی
دگر باز جویند ازو بیت بد ۔۔۔ ہمانا کہ باشد کم از پنج صد
چنیں شہر یارے و بخشندۂ ۔۔۔ بہ گیتی ز شاہاں درخشندۂ
نکرد اندریں داستانہا نگاہ ۔۔۔ زگوئی ور بخت ۔ آمد گناہ
در افتاد بدگوئے در کار من ۔۔۔ تبہ شد برشاہ بازار من

یہ اشعار اسی وقت لکھے گئے ہوں گے جب شاہنامہ تقریباً ختم ہو چکا ہے اور شاعر کو اپنے ابیات کا اندازہ ہو گیا ہے۔

آئندہ فردوسی نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا۔ اگر ہم اس کے تذکرہ نگاروں پر یقین کریں تو ماننا ہوگا کہ وہ سلطان کی ہجو لکھ کر غزنی سے غائب ہو گیا۔ طبرستان گیا۔ مازندران گیا اور بغداد پہنچا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن شاہنامہ ایسے بیانات کی مطلق تائید نہیں کرتا۔ شاہنامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی نہ بغداد گیا اور نہ طبرستان بلکہ اس نے وہ طریقہ اختیار کیا جو اس صورتِ حالات کے مناسب تھا۔ سلطان سے جب وہ آخر کار مایوس ہو گیا تو اپنی مقصد براری کے لیے امیر نصر بن ناصر الدین کی خدمت میں پہنچا امیر نصر ان ایام میں امیر الجیوش خراسان تھے۔ فردوسی بہر حال ان کی خدمت میں پہنچتا ہے اور اشعار بالا سنا کر عرض پرداز ہے ؎

چو سالار شہ آن سخنہائے نغز ۔۔۔ بخواند بہ بیند بپاکیزہ مغز
ز گنجش من ایدر بوم شادماں ۔۔۔ کزو دور بادا بد بد گماں

وزاں پس کند یاد بر شہریار | مگر تخم رنج من آید ببار
که جاوید باد افسر و تخت وے | ز خورشید تابندہ تر بخت وے

جب آپ اس کلام کو پڑھیں گے۔ میں امید کرتا ہوں کہ قدردانی کریں گے اور میں آپ کی فیاضی سے بے نیل مرام نہیں جاؤں گا۔ نیز یہ کہ سلطان کی خدمت میں بھی عرض کریں تاکہ مجھ کو میری محنت کی داد مل سکے اور میں کامیاب ہو جاؤں۔

شاہنامہ چونکہ اس وقت تک ختم ہو چکا ہے۔ اس لیے بعد کے واقعات پر کوئی روشنی نہیں ڈالتا اور ہمیں معلوم نہیں کہ امیر نصر کے دربار سے اس کی مساعی کا کیا حشر ہوا۔ آیا کامیاب ہوا یا بدستور محروم رہا۔ ہمیں معلوم نہیں لیکن قرائن سے پایا جاتا ہے کہ سلطان محمود سے وہ مایوس ہی رہا۔ فردوسی کی محرومی اور اس کے مایوسانہ جذبات کا یہ قطعہ شاہد ہے ؎

حکیم گفت کسے را کہ بخت والا نیست | بہیچ وجہ مراد از زمانہ جویا نیست
برو مجاور دریا نشیں مگر روزے | بدست افتد دُرے کہ جاش ہمتا نیست
خجستہ درگہہ محمود زابلی دریاست | کدام دریا کانرا کرانہ پیدا نیست
شدم بدریا، غوطہ زدم ندیدم دُر | گناہ بخت منست ایں گناہ دریا نیست

یہ قطعہ اگرچہ فردوسی کی مایوسی اور محرومی کا افسانہ خواں ہے لیکن اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اس کے قائل کے دل میں کوئی انتقامی جذبہ پیدا ہوا ہے یا وہ ہجو کہہ کر بادشاہِ وقت سے انتقام لینا چاہتا ہے۔

اس واقعہ کے کئی سال بعد ۴۰۰ھ میں جب وہ شاہنامہ کا خاتمہ لکھتا ہے اور سلطان کی طرف سے بالکل مایوس ہے۔ وہ حسب معمول اپنے بادشاہ کے حق میں ہاتھ اٹھا کر یہی دعا دیتا ہوا خاموش ہو جاتا ہے ؎

تن شاہ محمود آباد باد ہمیشہ بکام دلش شاد باد
چنانش ستودم کہ اندر جہاں سخن ماند از و آشکار و نہاں
ہمش رائے و ہم دانش و ہم نسب چراغِ عجم آفتابِ عرب[1]

یہاں موقع آگیا ہے کہ چند سطور ہجو کے سلسلہ میں بھی لکھی جائیں۔ ہجو کے متعلق ہم نہیں کہہ سکتے کہ فردوسی نے لکھی یا نہیں۔ دیباچہ قدیم کے بیان کی رُو سے ہجو کی تعداد دو تین شعر سے زیادہ نہیں تھی۔ نظامی کہتا ہے کہ فردوسی نے پورے سَو شعر لکھے تھے۔ مگر شہریار والئ طبرستان کی درخواست پر شاعر نے اسے شاہنامہ سے محو کر دیا اور صرف چھ شعر باقی رہ گئے جو زبان زد ہو گئے ؎[2]

---

[1] یہ شعر مطبوعہ شاہناموں میں نہیں ملتا میں نے ایک قلمی مخطوطہ سے جس کی تاریخ ۸۵۲ھ ہے۔ نقل کیا ہے۔ [2] ہجو فردوسی نے لکھی یا نہ لکھی۔ اس سوال کو چھوڑ کر ہمیں یہ بھی لینا چاہیے کہ وہ ہجو لکھنے کا حق بھی رکھتا ہے یا نہیں۔ جو لوگ اس امر کے مدعی ہیں کہ فردوسی نے ہجو لکھی ان کا گمان یہ ہے کہ شاہنامہ سلطان محمود کے حکم سے فردوسی نے لکھنا شروع کیا تھا لیکن ہمیں شاہنامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہنامہ کے سلسلہ میں سلطان کا کوئی ہاتھ نہیں تھا بلکہ شاعر نے محمود کی تخت نشینی کے بیس سال پہلے سے لکھنا شروع کیا تھا ؎

(باقی حاشیہ بر صفحہ ۱۴۴)

موجودہ ہجو کی تعداد جو شاہنامہ کے ساتھ شائع ہو رہی ہے۔ ایک سُو اشعار سے اوپر ہے۔ میں نے اس مسئلہ پر ایک علیٰحدہ مضمون میں جو اکتوبر ۱۹۲۱ء کے رسالہ اُردو میں شائع ہوا ہے تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ یہاں میں اسی قدر کہنا چاہتا ہوں کہ موجودہ ہجو یقیناً فردوسی سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ وہ ایک مجہول دستاویز ہے جس کی تعمیر کے لیے سب سے زیادہ ذخیرہ شاہنامہ سے سرقہ کیا گیا ہے۔ اور ہجو نگار نے اپنے مطلب کے اشعار شاہنامہ سے لے کر ربط و تسلسل کی غرض سے بعض جدید اشعار اس میں اضافہ کر کے اس کی موجودہ شکل میں مرتب کر دیا ہے۔ وہ شاہنامہ کے ہر نسخہ کے ساتھ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۳):-

سخن را نگہ داشتم سال بیست   بداں تا سزاوار ایں گنج کیست
ہمیں گفتم ایں نامہ را چند گاہ   نہاں بود از چشم خورشید و ماہ
چو تاجِ سخن نام محمود گشت   ستائش بآفاق موجود گشت

شاہنامہ اگرچہ اس نے محض بقائے نام کے لیے شروع کیا مگر اس میں بھی شک نہیں کہ اسکے ذریعے سے وہ اپنی قدر افزائی بھی چاہتا ہے۔ جب ۳۸۷ھ میں محمود تخت نشین ہوتا ہے شاعر قدردانی کی امید میں غزنی کا رُخ کرتا ہے اور اُسے اُمید بندھتی ہے کہ میری محنت کا صلہ مل جائے گا لیکن آخر میں اُسے مایوسی سے ہمدوش ہونا پڑا اور کوئی صلہ نہ ملا۔ فردوسی بیشک سلطان کے یہاں امید لگا کر آیا تھا۔ مگر سلطان پر کوئی قانونی حق نہیں رکھتا تھا۔ اگرچہ اخلاقاً سلطان پر ایک ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ بہرحال اس صورت حالات میں فردوسی سلطان کی ہجو لکھنے میں حق بجانب نہیں مانا جاسکتا۔ بیشک اس کو محروم ہونا پڑا۔ اس کی ساری عمر کی محنت برباد ہوئی۔ دل شکنی ہوئی۔ مگر محمود کی ہجو لکھنے کا پھر بھی اس کو حق نہیں تھا اور نہ وہ ایسا کر سکتا تھا۔

شائع ہو رہی ہے۔ متاخرین نے کہیں اس کی مصنوعی ہستی کا احتمال تک نہیں کیا۔ آج یہ جعلی نمونہ، اسی قدر فردوسی کا اصلی کلام مانا جاتا ہے۔ جس طرح فردوسی کا اور صحیح کلام۔ درحقیقت اشاعتِ نسخہ بایسنغری کے مرتبین، ہجو کو ایک سو اشعار کی حد تک پہنچانے کے ذمہ دار ہیں۔ ورنہ ایسی اشاعتوں میں جن میں دیباچہ قدیم موجود ہے۔ ان اشعار کی تعداد بہت کم ہے اور شاہنامہ کا نسخہ جس قدر زیادہ قدیم ہوگا، اسی قدر ہجو یہ اشعار کی تعداد اس میں کم پائی جائے گی۔

ہجو کے مرتبین نے اپنے مطلب کے بعض اشعار شاہنامہ کے مختلف اشعار سے لیے ہیں اور تسلسل کی غرض سے اور اشعار اضافہ کر کے اس کو موجودہ شکل میں پہنچا دیا ہے۔

بایسنغری نسخہ کی ہجو کے علاوہ ایک اور ہجو چل رہی ہے جو اپنی تعمیر میں بایسنغری ہجو سے بھی متاخر ہے۔

بایسنغری ہجو سے پایا جاتا ہے کہ سلطان نے شاعر پر محبت رسول اور محبت علی کی بنا پر بے دینی کا الزام لگایا ؎

مرا غمز کردند کاں پر سخن بمہرِ نبیؐ و علی شد کہن
ہر آنکس کہ در دیش بغضِ علی است ازو در جہاں خوار تر گو کہ کیست

ہجو بایسنغری میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ جب بادشاہ تخت نشین ہوا تو مجھ سے شاہنامہ کی نظم کی فرمائش کی اور صلہ فی بیت ایک دینار قرار پایا جب میں نے

پینتیس سال لگاتار کام کر کے چھیاسٹھ ہزار ابیات پر کتاب کو ختم کیا اور انعام کا وقت آیا۔ اس نے مجھ کو بالکل محروم التفات رکھا۔ اس ہجو کی ابتدا ہے ؎

الا اے خرد مند صاحب خبر — بگفتار و کردار من در نگر
میانجی میان من و شاہ باش — بحق خدا کز حق آگاہ باش

اب ہم ہجو بایسنغری کی طرف رجوع کرتے ہیں اور یہاں بعض ایسے اشعار کا حوالہ دیتے ہیں جن کو ہجو نگار نے شاہنامہ سے لیا ہے

ہجو بایسنغری		شاہنامہ
چہ گفت آں خداوند تنزیل وحی	ــــــــ	چہ گفت آں خداوند تنزیل وحی
خداوند امر و خداوند نہی	ــــــــ	خداوند امر و خداوند نہی
کہ من شہر علمم علیم دراست	ــــــــ	کہ من شہر علمم علیم دراست
درست ایں سخن قول پیغمبر است	ــــــــ	درست ایں سخن قول پیغمبر است
گواہی دہم کیں سخن راز اوست	ــــــــ	گواہی دہم کیں سخن راز اوست
تو گوئی دو گوشم بر آواز اوست۔ صـ ۶۳	ــــــــ	تو گوئی دو گوشم بر آواز اوست۔ صـ ۵ دیباچہ

چو باشد ترا عقل و تدبیر و رائے	ــــــــ	اگر چشم داری بدیگر سرائے
بنزد نبی و علی گیر جائے	ــــــــ	بنزد نبی و وصی گیر جائے
گرت زیں بد آید گناہ من است	ــــــــ	گرت زیں بد آید گناہ منست

چنین است و ایں رسم و راہ من است - صـ۶۱ ——— چنین است آئین و راہ منست صـ۶

منم بندۂ اہلبیتِ نبیؑ ——— منم بندۂ اہلبیتِ نبیؑ
ستایندۂ خاک پائے نبیؐ - صـ۶۳ ——— سر افگندہ بر خاک پائے وصی - صـ۲۸۶ ج ۱

نکردی دریں نامۂ من نگاہ ——— نکرد اندریں داستاں ہا نگاہ
بگفتار بدگوئے گشتی زراہ - صـ۶۳ ——— ز بدگوئی و بخت بد آمد گناہ صـ۱۹۹۵ ج ۴

من ایں نامۂ شہریاران پیش ——— کہ ایں نامۂ شہریاران پیش
بگفتم بدیں نغز گفتار خویش صـ۶۴ ——— بہ پیوندم از خوب گفتار خویش صـ۱۰۶۴ ج ۲

چو عمرم بنزدیک ہشتاد شد ——— کنوں عمر نزدیک ہشتاد شد
امیدم بیکبارہ برباد شد ——— امیدم بیکبارہ برباد شد

بسی سال اندر سرائے سپنج ——— سی و پنج سال از سرائے سپنج
چنیں رنج بردم بامید گنج صـ۶۴ ——— بسے رنج بردم بامید گنج - صـ۲۰۹۵ ج ۴

چنیں نامداراں و گردن کشاں ———— ہمہ پہلواناں و گردن کشاں

کہ دادم یکایک از ایشاں نشاں ———— کہ دادم دریں قصۂ ایشاں نشاں

ہمہ مردہ از روزگار دراز ———— ہمہ مردہ از روزگار دراز

شد از گفت من نام شان زندہ باز ———— شد از گفت من نام شان زندہ باد

چو عیسیٰ من ایں مردگاں را تمام ———— منم عیسیٰ آں مردگاں را کنوں

سراسر ہمہ زندہ کردم بنام ص ۶۵ ———— رواں شان بمینو شدہ رہنموں ص ۱۱۲۷ ج ۳

یکے بندگی کردم اے شہریار ———— یکے بندگی کردم اے شہریار

کہ ماند ز تو در جہاں یادگار ———— کہ ماند ز من در جہاں یادگار

بناہائے آباد گردد خراب ———— بناہائے آباد گردد خراب

ز باران و از تابش آفتاب ———— ز باران و از تابش آفتاب

پے افگندم از نظم کاخ بلند ———— پے افگندم از نظم کاخے بلند

کہ از باد و باراں نیابد گزند ص ۶۵ ———— کہ از باد و باراں نیابد گزند ص ۹۰ ج ۲

بشیرے بہ از شہریارے چنیں ———— پلنگے بہ از شہریارے چنیں

کہ نہ کیش دارد نہ آئین و دیں ص ۶۶ ———— کہ نہ شرم دارد نہ آئین و دیں ص ۱۴۲۴ ج ۳

چو گودرز و ہشتاد پور گزیں ——— چو گودرز و ہفتاد پور گزیں
سواران میدان وشیران کیں ——— سواران میدان وشیران کیں
چو جاماسپ کاندر شمار سپہر ——— چو جاماسپ کاندر شمار سپہر
فروزندہ تر بدز تابندہ مہر۔ ص ۶۴ ——— فروزندہ تر بدز ناہید و مہر ص ۲۰۳۸ ج ۴

بنالم بدرگاہ یزدان پاک ——— بنالم زتو پیش یزدان پاک
فشانندہ بر سر پراگندہ خاک ص ۶۶ ——— خروشاں بسر بر پراگندہ خاک ص ۱۳۶۱ ج ۳

پرستار زادہ نیاید بکار ——— پرستار زادہ نیاید بکار
اگرچند دارد پدر شہریار ص ۶۶ ——— اگرچند باشد پدر شہریار ص ۱۷۰۱ ج ۴

ہجو کی روایت اگرچہ قدیم ہے۔ دیباچہ قدیم اور نظامی عروضی کے علاوہ مختاری شاعر اپنی تالیف شہریار نامہ میں بعض ایسے شعر لا رہا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک فردوسی نے ہجو لکھی ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

وگر ہدیہ ندہی ایا شہریار   زنجم کہ ہستی خداوندگار
زبان من از ہجو کوتاہ باد   ہمیشہ ثنا گوئے ایں شاہ باد

اگرچہ فردوسی کا نام نہیں لیا گیا ہے مگر ان اشعار سے ظاہر ہے کہ فردوسی ہی

کی طرف ایما ہے۔ نظامی سکندر نامہ میں فردوسی کی[1] محرومی کے معتقد ہیں۔ اگرچہ ہجو کا ذکر نہیں کرتے ؎

ستانی بایں طاس طوسی نواز — خن شاہنامہ ز محمود باز

دو وارث شمار از دو کانِ کہن — ترا در سخا و مرا در سخن

بوامے کہ نادادہ باشد نخست — حق وارث از وارث آید درست

لیکن یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ سلجوقیوں کے زمانے میں فردوسی کی محرومی اور ہجو پر عام طور پر یقین کیا جاتا ہے۔ شیخ فرید الدین عطار اگرچہ صوفی ہیں۔ لیکن وہ قدیم تاریخ و سیر سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ پہلے شخص ہیں جو فردوسی کے جنازے پر شیخ ابوالحسن خرقانی کے نماز ادا نہ کرنے اور فردوسی کے شیخ کے خواب میں آنے اور اپنی مغفرت بیان کرنے کے قصّہ کے راوی ہیں۔ اس کے علاوہ الٰہی نامہ میں وہ فردوسی کی بلند ہمتی کے ذکر میں کہتے ہیں کہ سلطان نے شاہ نامہ کے صلے میں پیلبار انعام بخشی کی۔ لیکن شاعر نے اپنی سیر چشمی کی بنا پر اس پیلبار انعام کو فقاع خریدنے کے قابل بھی نہ سمجھا ؎

اگر محمود اخبار عجم را — بداد آں فیل و لشکرداں درم را

اگر تو شعر آری فیل وارے — نیابی یک درم در روزگارے

چہ آں گر فیل وارش کم نہ ازرید — بر شاعر فقاعے ہم نہ ازرید

نہ ہے ہمت کہ شاعر داشت انگاہ — کنوں بنگر چوں برگشت از راہ[1]

---

[1] کلیات عطار الٰہی نامہ صفحہ ۹۳۴ نول کشور

چونکہ قدیم روایات میں فردوسی پر بد مذہبی کا الزام لگایا گیا ہے اور سلطانی دربار میں اس کے مذہب کو اس کی محرومی کا باعث بیان کیا گیا ہے۔ اس لیے ضروری ہوا کہ یہاں چند الفاظ اس کے مذہب کے متعلق بھی بیان کیے جائیں۔ اگر شاہنامہ پر اعتبار کیا جائے تو اس میں متضاد شہادت ملتی ہے۔ جس کی رو سے فردوسی شیعہ بھی مانا جا سکتا ہے اور سنّی بھی۔ ایک بات یقینی ہے کہ جہاں شاعر کو اس کے دشمنوں نے مجوسی، فلسفی، دہریہ، ملحد، کافر اور معتزلی کہا ہے وہاں اس کو رافضی بھی بیان کیا ہے۔ اب دشمنوں کے بیانات پر کہاں تک اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہم یہاں قدیم روایات کا جائزہ لیتے ہیں۔

دیباچہ قدیم میں مذکور ہے۔ "امّا بر سر شاہنامہ شرطِ ادب نگاہ نداشتہ بود و سخن در مذہب خود گفتہ ؎

گرت زیں بد آید گناہ منست چنیں است و ایں رسم و راہ منست[1]

نظامی عروضی کی روایت کی رو سے اس پر اعتزال اور رفض کی تہمت لگائی گئی ہے۔ کہ او مردے رافضی است و معتزلی مذہب و ایں بیت بر اعتزال او دلیل کند کہ او گفت ؎

بہ بیندگان آفرینندہ را نہ بینی مرنجاں دو بینندہ راہ

و بر رفض او ایں بیتہا دلیل است کہ او گفت ؎

---

[1] دیباچہ قدیم شاہنامہ۔

خرد مند گیتی چو دریا نہاد　　برانگیختہ موج از و تند باد
چو ہفتاد کشتی درو ساختہ　　ہمہ بادباں ہا برافروختہ
میانہ یکے خوب کشتی عروس　　برآراستہ ہمچو چشم خروس
پیغمبر بروں اندروں با علی　　ہمہ اہلبیت نبی و وصی
اگر خلد خواہی بدیگر سرائے　　بنزدِ نبی و وصی گیر جائے
گرت زین آید گناہِ منست　　چنیں دان و ایں راہ راہ منست
بریں زادم و ہم بریں بگذرم　　یقیں داں کہ خاکِ پئے حیدرم

(چہار مقالہ طبع یورپ صفحہ ۴۹)

شاہ نامہ کے دیباچہ میں خلفائے راشدین کا نام بنام ذکر کرنے کے فوراً بعد جیسا کہ اہلِ تسنّن کا دستور ہے۔ شیعی عقیدے کے یہ شعر ملتے ہیں جو نظامی کے ہاں اوپر نقل ہوئے ہیں۔ ان میں ابیاتِ ذیل قابلِ غور ہیں ؎

اگر چشم داری بدیگر سرائے　　بنزدِ نبی و علی گیر جائے
گرت زیں بد آید گناہِ منست　　چنیں است ایں رسم و راہ منست
دلت گر براہ خطا مائل است　　ترا دشمن اندر جہاں خود دلست
نباشد جز از بے پدر دشمنش　　کہ یزداں بآتش بسوزد تنش

اب فردوسی کے اعتزال کو لیتا ہوں۔ شاہنامہ کے دیباچہ میں فردوسی نے حمد باری میں جو اشعار لکھے ہیں۔ ان میں وہ شعر بھی آتا ہے جس سے فردوسی کے

اعتزال کا استدلال کیا گیا ہے۔ علاوہ اور تفریقی مسائل کے جو اشاعرہ اور معتزلہ میں بحث و جدال کے مورث بنے ہیں۔ ایک مسئلہ رویت باری ہے۔ اشاعرہ کا اعتقاد ہے کہ قیامت کے روز خدا کا دیدار بلاکیف ہوگا۔ وہ اپنے مذہب کی سند میں یہ آیت پیش کرتے ہیں وُجُوۡهٌ يَّوۡمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ لیکن معتزلہ جو رویت کے قائل نہیں ہیں۔ اس آیہ شریفہ سے متمسک ہوتے ہیں لَا تُدۡرِكُهُ الۡاَبۡصَارُ وَهُوَ يُدۡرِكُ الۡاَبۡصَارَ وَهُوَ اللَّطِيۡفُ الۡخَبِيۡرُ۔ اس آیت کی دلیل پر یہ معتزلی عقیدہ کہ دنیا و عقبیٰ میں خدا کا دیدار ناممکن ہے۔

فردوسی نے شاہنامہ میں حمد باری کے موقع پر ایک شعر لکھا ہے ؎

بہ بینندگاں آفرینندہ را نہ بینی مرنجاں دو بینندہ را

یہ شعر فردوسی کے معترضین نے اس کے اعتزال کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔ شعر کے معنی یہ ہیں کہ ذات باری کا مشاہدہ باصرہ کے ذریعہ سے ممکن نہیں۔ اس لیے اپنی آنکھوں کو اس کے دیدار کی جستجو میں زحمت نہ دے۔

کسی مسلسل نظم سے ایک شعر لے کر اس کو خاص معنی پہنا دینا اور اس بناء پر شاعر پر اعتراض کرنا میرے نزدیک صریح بے انصافی ہے۔ بھلا اس شعر سے کون معقول پسند انسان یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ فردوسی رویت باری کا منکر ہے۔ شاعر کا صحیح مفہوم دریافت کرنے کے لیے ہمیں اس شعر کو فردوسی کے اور اشعار کے ساتھ ملا کر پڑھنا چاہیے تاکہ تسلسل قائم رہے۔ یعنی اس طرح ؎

خرد گر سخن برگزیند ہمی ہماں را گزیند کہ بیند ہمی
بہ بیندگاں آفرینندہ را نہ بینی مرنجاں دو بیندہ راہ
نیابد بدو نیز اندیشہ را کہ او برتر از نام و از جائگاہ[1]

شاعر کا مفہوم یہ ہے کہ ہم ذات باری کے ادراک سے قاصر ہیں۔ ہمارا تعقل انھیں اشیاء کے وجود کا قائل ہو سکتا ہے جو حواس کی معرفت اس تک پہنچیں۔ مگر ذات باری کا مشاہدہ آنکھوں سے نہیں ہو سکتا۔ حواس ایک طرف خدا کی ذات تو ہمارے تخیل کے تصرفات سے بھی بالاتر ہے۔

نظامی گنجوی جو اہلِ تسنن سے ہیں فردوسی کی تقلید میں قریب یہی خیال ادا کر رہے ہیں ؎

بآنچیزہا باید اندیشہ راہ کہ باشد برو دیدہ را دستگاہ
خدا را نشاید بہ اندیشہ جست کہ درتست ہر چہ آن اندیشہ رست

(سکندر نامہ بحری)

اب فردوسی ایک شعر کی بنا پر جس کا تسلسل توڑ دیا گیا ہے۔ معتزلی کیونکر مانا جا سکتا ہے؟

---

[1] میکن کے یہاں ان اشعار کی ترتیب ۱۰، ۵، ۶ ہے۔ لیکن تسلسل کا تقاضا ہے کہ وہ اسی ترتیب میں پڑھے جائیں جس میں میں نے اوپر لکھا ہے۔ حمد کے میدان میں فردوسی کے لیے یہ خیال کرنا کہ فرقہ دارانہ عقیدہ کا اظہار کر رہا ہے۔ میرے نزدیک دور از کار امر ہے۔ ۱۲

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی کے ہاں یہ ایک مقبول خیال رہا ہے۔ شاہنامہ میں ایک اور موقع پر شاعر فلسفیوں کی تردید اور بطلان میں قریب قریب یہی خیال ادا کرتا ہے ؎

ابا فلسفہ دان بسیار گوئے — نپویم براہے کہ گوئی بپوئے
ترا ہر چہ بر چشم بر بگذرد — بگنجد ہمی در دلت با خرد
چناں داں کہ یزدان نیکی دہش — جز آنست و زیں برگردان منش

شاہنامہ میں ایسے ابیات موجود ہیں جن کی رو سے فردوسی کو شیعہ مانا جا سکتا ہے اور سنّی بھی۔ دیباچہ کے علاوہ شاہنامہ میں دو اور مقام ایسے ہیں جہاں شیعہ رنگ کے اشعار ملتے ہیں۔ مثلاً خاتمۂ داستان سیاوش کے دو شعر اور داستان نوشزاد کے خاتمہ کے دو شعر اسی طرح سُنّی رنگ کے اشعار دیباچہ کے علاوہ ص۴۴۳ ج اوّل ساختن سیاوش کنگ دژ دو شعر ص جلد۳ خاتمۂ داستان اردشیر بابکان دو شعر ص ج سوم خاتمہ داستان سکندر ایک شعر ص ج۴ داستان یزدجرد کے آغاز میں حضرت عمرؓ کے ذکر میں دو شعر۔ یہ وہ مواد ہے جس کی رُو سے فردوسی کو شیعہ بھی مانا جا سکتا ہے اور سُنّی بھی۔ لیکن شاہنامہ میں یہ متضاد عنصر کس طرح داخل ہو گیا۔ ہماری فہم سے بالا ہے۔ فردوسی یا شیعہ ہوگا یا سُنّی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ سُنّی بھی ہو اور شیعہ بھی ہو۔ اس عقیدہ کا حل یوں ممکن ہے کہ دونوں فرقوں نے ہمارے شاعر کو اپنے اپنے مذہب کا رکن بنانے کی کوشش کی

ہے اور نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دونوں مذہبیت کے اشعار شاہنامہ میں داخل ہو گئے۔

قاضی نور اللہ شوستری کا خیال ہے کہ فردوسی نے تقیہ کر کے سنی رنگ کے اشعار بخوف سلطان محمود داخل کر دیئے ہیں۔ لیکن اگر واقعہ ایسا ہوتا تو شاہنامہ میں صرف سنی رنگ کے اشعار پائے جاتے۔ کیونکہ تقیہ کی صورت میں فردوسی اپنے مذہب کو پوشیدہ رکھنے پر مجبور تھا۔ فردوسی اس پایہ کا شخص ہے کہ اپنے مذہب کو چھپانا یا تقیہ کرنا اس کے لیے ہتک کہا جا سکتا ہے۔ دوسرے سلطان محمود کے دربار میں ہر ملت و مذہب کے شخص کا گزر تھا۔ ہندو اس کی فوج میں موجود تھے۔ عیسائی طبیب اس کے ہاں تھے۔ پھر کیا وہ ایک شیعہ شاعر کے وجود کا اپنے دربار میں روادارانہ ہوتا۔ ہمیں معلوم ہے کہ اسی سلطان نے ایک اور شیعہ شاعر غضائری رازی کا پیلبار انعام بخشی کی ہے ؎

امیدوارم کایں بار صد ہزار تمام — بمن بیارد بر پشت فیل بر فیال

ابو ریحان البیرونی ایک اور شیعہ فاضل کو خود محمود نے خواہش کر کے اسے دربار میں بلایا۔ محمود کی دو لڑکیاں شیعہ شہزادوں منوچہر بن قابوس اور عنصر المعالی کیکاؤس کے ساتھ بیاہی گئی ہیں۔ آل بویہ کے یہاں بھی محمود ایک شہزادی دینا چاہتا تھا۔ اس لیے فردوسی کی نسبت تقیہ کا گمان کرنا بالکل غیر موزوں ہے۔

فردوسی کے مذہب کا مسئلہ طے کرنے کے لیے ہم کو کسی اور شہادت کی ضرورت ہے جو بالکل غیر مشتبہ اور معتبر ہو یہ شہادت بھی شاہنامہ میں موجود ہے اور میں اس کا

ذکر ذیل میں کرتا ہوں۔

(۱) اشاعرہ و معتزلہ میں مسئلہ جبر و قدر رنگ تفرقہ انداز رہا ہے۔ متکلمین کے نزدیک جبر ضد عدل ہے۔ اس سے ان کی مراد بندوں کی مقہوریت اور مغلوبیت ہے جس کے اثر میں انسان کے تمام افعال مہد سے لے کر لحد تک گویا اقوال و افعال خدا ہیں جو ان کے ہاتھ اور زبان سے ان کے اختیار اور ارادے کے بغیر جاری کرتا ہے یعنی اعمال خیر و شر جو کچھ اس زندگی میں ہم سے سرزد ہونے والا ہے خدا نے اپنے علم ازلی کے مطابق ہماری تقدیر میں لکھ دیا ہے۔ اور اس سے سر مو تجاوز نہیں کیا جا سکتا۔ صاحب گلشن راز کہتے ہیں ؎

ہر آنکس را کہ مذہب غیر جبر است　　　نبی فرمود کو مانند گبر است

لیکن معتزلہ کا مختار یہ ہے کہ عباد اپنے اقوال و افعال میں فاعل و موجد ہیں۔ بالفاظ دیگر اپنے افعال میں مختار ہیں اور یہی ان کا مسئلہ قدر ہے۔ اب شیعوں اور معتزلیوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اکثر مسائل ان میں عام ہیں۔ چنانچہ اس مسئلہ میں دونوں فرقے متحد ہیں۔

محمد باقر بن محمد تقی فرماتے ہیں: "بندگان در فعل خود مختار اند و خود فاعل فعل خود اند خواہ اطاعت باشد خواہ معصیت و اکثر امامیہ و معتزلہ باین قول قائل اند و اشاعرہ و اکثر اہل سنت اند میگویند۔ فاعل ہمہ افعال بندہ خداست و بندگان مطلق در آنہا اختیار ندارند بلکہ خدا بر دست ایشاں افعال را جاری میکند و در آں فعل مجبور اند۔" (حق الیقین)

یہ شیعہ نقطہ نظر ہے۔ اس مسئلہ پر نظر ڈالتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی معتزلہ کے برخلاف اشاعرہ کا ہم زبان ہے۔ فردوسی کا اعتقاد ہے کہ مشیتِ الٰہی نے جو کچھ ازل کے دن ہمارے مقدرات میں لکھ دیا ہے۔ انہی احکام کے مطابق ہم چلتے ہیں۔ وہ احکام ایسے زبردست اور طاقتور ہیں کہ نہ ہم ان پر چون وچرا کر سکتے ہیں اور نہ احتراز کر سکتے ہیں۔ نہ ان میں تغیر و تبدل کی گنجائش ہے۔ نوشتۂ تقدیر اسٹ اور اٹل ہے۔ حیلہ اور پرہیز سے کوئی تبدیلی اس میں نہیں کی جا سکتی۔ بعض مثالیں یہاں عرض ہیں۔

بدانگہ کہ لوح آفرید و قلم　　　بزد بر ہمہ بودنیہا رقم

کہ ہر چیز کاو آفرید از پوش　　　بدآنسو کشد بندگاں را روش

کہ کارِ خدائی نہ کاریست خود　　　قضائے بنشتہ نشاید سترد

چنیں گفت دستاں کہ دانا یکیست　　　بتقدیر او راہ تدبیر نیست

بنشتہ بسر بر دگر گونہ بود　　　ز فرماں نکاہد نہ خواہد فزود

قضا چوں ز گردوں فرو ہشت پر　　　ہمہ زیرکاں کور گردند و کر

بکوشیم و از کوشش ما چہ سود　　　کز آغاز بود آنچہ بایست بود

نوشتہ چنیں بود و بود آنچہ بود　　　ز فرماں نکاہد نخواہد فزود

(۲) معتزلہ جو اپنے آپ کو عدلی کہتے ہیں۔ اس عقیدہ کے پابند ہیں۔ کہ خدائے تعالیٰ حکیم ہے اور حکیم سے خیر و صلاح کے سوا اور کچھ صادر نہیں ہو سکتا اور حکم

عقل رعایتِ مصالح عباد اس پر واجب ہے۔ پس خدا کی نسبت یہ اعتقاد کرنا کہ وہ بندوں کو اوّل تو اعمال خیر و شر پر مجبور کرے اور بعد میں ان کی پاداش میں سزا دے قبیح معلوم ہوتا ہے۔

محمد باقر بن محمد تقی فرماتے ہیں: "حق تعالےٰ حکیم است و کارہائے او منوط بحکمت و مصلحت است و فعل عبث و بے فائدہ از و صادر نمی شود۔ او را در افعال اغراض صحیح و حکمت ہائے عظیمہ ملحوظ می باشد و لیکن غرض در افعال الٰہی عاید بہ بندگان میگردد۔ غرض از تحصیل نفع از برائے خود نیست .... و اکثر امامیہ را اعتقاد آنست کہ اصلح باشد از برائے و نظام عالم فعلش بر حق تعالےٰ واجب است (حق الیقین)

برخلاف اس کے اشاعرہ کا عقیدہ ہے کہ بروئے عقل خدا پر کچھ واجب نہیں۔ وہ قادرِ مطلق اور فعّال مایشاء ہے وہ جو چاہے اور جب چاہے کرے جس کو چاہے بلند کرے اور جس کو چاہے پست کرے۔ ذلیل کو عزت دے اور عزت والے کو ذلیل کر دے۔ جس کو چاہے راہ راست پر لائے اور جس کو چاہے سیدھی راہ سے الگ کر دے۔ جسے جو چاہے دے اور جو چاہے چھین لے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے یا کرے گا وہی عدل و انصاف ہے۔ نفع و ضرر اس کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ عزّ و جل پر ثواب یا عذاب یا بندے کے ساتھ لطف یا اس کے ساتھ وہ کرنا جو اس کے حق میں بہتر ہو، کچھ واجب نہیں۔ مالک علی الاطلاق ہے جو چاہے کرے اور جو چاہے حکم دے۔ اس پر کوئی جور و حیف لازم نہیں آتا۔

اس مسئلہ میں فردوسی اشاعرہ کا ہمزبان ہے۔ چنانچہ ؎

(۱) یکے را برآری بچرخ بلند — یکے را کنی خوار و زار و نژند
یکے راز ماہ اندر آری بچاہ — یکے راز چاہ اندر آری بماہ
یکے را برآری و شاہی دہی — یکے را بدریا بماہی دہی
نہ با آنت مہر و نہ با اینت کیں — کہ بہ داں توئی اے جہاں آفریں
(۲) غم و اندوہ و رنج و تیمار و درد — ز نیک و زبد ہر چہ آید بمرد
کمی و فزونی و نیک اختری — بلندی و پستی و کند آوری
زداد تو بینم ہمی ہر چہ ہست — دگر کس ندارد دریں کار دست
(۳) توانائی او راست ما بندہ ایم — ہم از راستیہاش گویندہ ایم
یکے را دہد تاج و تخت بلند — یکے را کند خوار و زار و نژند
نہ با آنش مہر و نہ با اینش کیں — نمیداند ایں جز جہاں آفریں
(۴) ز دولیست پیروزی و ہم شکست — بہ نیک و بہ بد داں بود کام دست
زمان و مکان و جہاں آفرید — پے مور و کوہ گراں آفرید
خرد داد و جان و تن زورمند — بزرگی دو دیہیم و تخت بلند
رہائی نبد بد سر از بند او — یکے را بود فرد او رند او
یکے را دگر شور بختی بود — نیاز و غم و رنج و سختی بود
ز رخشندہ خورشید تا تیرہ خاک — ہمہ داد بینم زیزدان پاک

(۳) فرقہ اہلِ تسنن و تشیع میں ہاروت و ماروت کے متعلق بھی اختلاف رائے ہے۔ ان فرشتوں کی بابت وہ قصہ جس سے ان کا بشری حیثیت اختیار کر کے دنیا میں آنا۔ لوگوں کو جادو کی تعلیم دینا، زہرہ پر عاشق ہونا اور اسم اعظم سکھانا جو اہلِ سنت و جماعت کے یہاں مقبول ہے۔ اہلِ تشیع نہیں مانتے۔ فردوسی شاہنامہ میں ایک سے زیادہ موقع پر ہاروت کا ذکر کرتا ہے اور اس طریقہ سے کرتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس قصہ پر اس کا اعتقاد تھا۔ کیونکہ وہ ان کی جادوگری کا ذکر کرتا ہے ؎

گہے میگسار ید وگہ چنگ ساخت ؛ تو گفتی کہ ہاروت نیرنگ ساخت (تمہید داستان بیژن)

(۴) سکندر کے حالات جو شاہنامہ میں ملتے ہیں وہ معلوم ہوتا ہے زیادہ تر سُنّی ماخذ سے لیے گئے ہیں۔

(۵) صوفیوں کے متعلق اس کی رائے نہایت محترمانہ ہے جو سُنّیوں کے مطابق ہے۔ سکندر کی داستان میں کہتا ہے ؎

غریباں کہ بر شہر ما بگذرند   چمانندہ پائے دلباں ناچرند
دل از عیب صافی و صوفی بنام   بدرویشی اندر شدہ شادکام
زخواہندگاں نام شاں بر کنید   شمار اندر آغاز دفتر کنید ج ۳

اہلِ تشیع ابتدا ہی سے صوفیوں کی نسبت معاندانہ رائے رکھتے ہیں۔ امام علی نقیؑ ان کو امت کے نصاریٰ اور مجوس کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ حضرت امام جعفر صادقؑ سے کسی نے دریافت کیا کہ اس زمانہ میں ایک فرقہ مبعوث ہوا ہے جس کو

صوفی کہا جاتا ہے۔ آپ کی ان کی بابت کیا رائے ہے؟ جواب میں فرمایا کہ وہ ہمارے دشمن ہیں۔ جو ان کی طرف مائل ہوا وہ انھیں سے ہے اور انھیں کے ساتھ محشور ہوگا۔

بروایت امام حسن عسکریؑ ابو ہاشم کوفی الصوفی کے متعلق جنھوں نے سب سے پیشتر صوفی کے لفظ ۔رواج دیا ہے۔ حضرت امام جعفر صادقؑ کی رائے یہ ہے کہ وہ سخت بد عقیدہ شخص ہے۔

ان معتبر مسائل سے جو اتفاقیہ شاہنامہ میں آگئے ہیں اور جو ہر قسم کے شبہ سے بری ہیں دیکھا جاتا ہے کہ فردوسی اہل تسنن کا ہم نوا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی سُنّیوں میں بوجہ تصنیف شاہنامہ جس کو ادب و شعر کی خدمت کے بجائے صریحاً مجوسیوں کی خدمت کے ساتھ تعبیر کیا گیا تھا بدنام تھا۔ اور اسی بنا پر اس کی وفات پر شیخ الاکابر شیخ ابو القاسم طوسی نے (جنھیں متاخرین نے ابو القاسم خرقانی لکھا ہے) اس کے جنازے کی نماز پڑھنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ قصہ اگرچہ دیباچہ بایسنغری کی وجہ سے عام طور پر مشہور ہے۔ لیکن اس کا کوئی قدیم ماخذ معلوم نہ تھا۔ شیخ فریدالدین عطار بہر حال اس قصہ کے راوی ہیں۔ اسرار نامہ میں لکھتے ہیں:۔

شنودم من کہ فردوسی طوسی   کہ کرد او در حکایت بے فسوسی
بہ بست و پنج سال از نوک خامہ   بسر می بُرد بیت شاہنامہ

باآخر چوں رسیدش دم باآخر　　ابوالقاسم کہ بد شیخ الاکابر

اگرچہ بود پیر پرنیاز او　　نکرد از راہ دیں بروے نماز او

چنیں گفت او کہ فردوسی بسے گفت　　ہمہ درحق گبرے ناکسے گفت

بمدح گبرگاں عمرے بسر برد　　چو وقت مردن آمد بے خبر برد

مرا درکار او برگ ریا نیست　　نمازم بر چنیں شاعر روا نیست

چو فردوسیٔ مسکیں را ببردند　　بہ زیر خاک تاریکش سپردند

دراں شب شیخ او را دید درخواب　　کہ پیشِ شیخ آمد دیدہ پرآب

زمرد رنگ تاجے سبز برسر　　لباسے سبز تر از سبزہ دربر

بہ پیشِ شیخ بنشست وچنیں گفت　　کہ اے جان تو با نور یقیں جفت

نہ کردی آں نماز از بے نیازی　　بلے ننگ آمدت زیں بے نمازی

خدائے ما جہان پر فرشتہ　　ہمہ از فیض روحانی سرشتہ

فرستادانیت لطفِ کارسازے　　کہ ناکردند بر جانم نمازے

خطم دادند بر فردوس اعلیٰ　　کہ فردوسی بفردوس است اولیٰ

خطاب آمد کہ اے فردوسی پیر　　اگر راندت ز پیش آں طوسی پیر

پذیرفتم منت تاخوش بخفتی　　بداں یک بیت توحیدم کہ گفتی

مشو نومید از فضلِ الٰہی　　مدہ بر فضل ما بخلی گواہی

یہ یقینی ہے کہ اگر فردوسی شیعہ ہوتا تو سُنّیوں میں ایسے قصوں کے تراشنے کی

کوئی ضرورت نہیں تھی۔ فردوسی اپنی زندگی میں ممکن ہے کہ بدنام ہو رہا ہو۔ لیکن وفات کے بعد وہ سُنی حلقوں میں ہر دلعزیز معلوم ہوتا ہے۔ سب سے پہلے اسدی طوسی گرشاسپ نامہ میں اس کا ذکر کرتا ہے۔

امام احمد غزالی نے جو اس عہد کے مشہور واعظ ہیں ایک موقع پر اثنائے وعظ میں کہا کہ اے مسلمانو! مجھے تمہیں وعظ و نصیحت کرتے چالیس سال ہو گئے اس عرصے میں جو کچھ پند و موعظت میں نے کی اس کا خلاصہ فردوسی نے ان دو شعروں میں کر دیا ہے[۵]

ز روز گزر کردن اندیشہ کن　　پرستیدن داد گر پیشہ کن
بہ نیکی گرای و میازار کس　　رہ رستگاری ہمیں است و بس

یہی حال شیخ عطار اور نظامی گنجوی کا ہے۔ یہ تینوں بزرگ اہل تسنن میں اپنے اپنے مرکز میں بلحاظ شہرت و تقدس نہایت محترم مانے جاتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا مذہب سے قریبی تعلق رہا ہے۔ یہ بزرگوار فردوسی کا ذکر عزت کے ساتھ کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی ان کے نزدیک اہلِ تسنن سے تھا۔

یہاں میں مثنوی یوسف زلیخا کے متعلق بھی جو فردوسی کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہوں۔ مغربی محققین میں نلدیکی اور ایتھے اور ان کی تقلید میں دیگر مستشرقین نے اس کو فردوسی کی تصنیف مانا ہے۔ مشرقی اہلِ قلم بالعموم اسکو فردوسی کی یادگار مانتے ہیں۔ یہ عقیدہ خواہ کتنا ہی عالمگیر کیوں نہ ہو لیکن میرے خیال میں صحت پر مبنی نہیں۔ میں یہاں ان تمام دلائل سے جو اس عام عقیدہ کی تردید میں لائے جا سکتے ہیں۔

صرف چند مختصراً ذیل میں درج کرتا ہوں۔ اس مسئلہ پر میں نے تفصیل کے ساتھ ایک اور مضمون میں جو اپریل ۱۹۲۲ء کے رسالۂ اردو میں شائع ہوا ہے بحث کی ہے۔

۸۲۹ھ تک ہمارے پاس کوئی ایسی سند نہیں جو اس کتاب کو فردوسی کی طرف منسوب کرے۔ سب سے پہلے دیباچہ نگار بایسنغر خانی نے یہ قصہ اٹھایا ہے۔ اس کی تقلید دوسرے تذکرہ نگاروں نے بھی کی ہے۔ قصہ یوں چلتا ہے کہ جب فردوسی سلطان کی ہجو لکھ کر غزنی سے فرار ہوا۔ اور محمود کے خوف سے ایرانی والیانِ ملک اس کو اپنے ہاں پناہ نہیں دے سکتے تھے۔ اس نے بغداد کا رُخ کیا اور بارگاہ خلافت میں پہنچا۔ شاہنامہ اس کی زندگی کا کارنامہ چونکہ احوال ملوک عجم میں تھا۔ اس لیے یہاں پسند عام کا خلعت حاصل نہ کر سکا۔ فردوسی نے بغدادیوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کتاب یوسف وزلیخا نظم کی جو عام طور پر پسند کی گئی اور دربارِ خلافت میں اس سے اس کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوا جب بغداد میں فردوسی کے پہنچنے کی اطلاع سلطان محمود کو ہوئی۔ اس نے فردوسی کی طلب میں ایک عریضہ بارگاہِ خلافت میں ارسال کیا اور لکھا کہ اگر امیر المومنین نے شاعر کو میرے پاس روانہ نہ کیا تو میں بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادوں گا اور دار الخلافہ کی خاک ہاتھیوں پر لدوا کر غزنی لے آوں گا۔ خلیفہ القادر باللہ سلطان کی اس دھمکی سے مطلق سراسیمہ نہیں ہوا۔ اس نے جواب میں صرف ایک لفظ "الم" لکھ بھیجا۔ محمود کے دبیر خلیفہ کے اس جواب کی عقدہ کشائی سے عاجز رہے۔ آخر یہ رائے قائم ہوئی کہ چونکہ سلطان نے اپنے عریضہ میں خلیفہ کو ہاتھیوں کی تہدید دی تھی اس لیے

جواب میں خلیفہ نے سورۂ "الفیل" کی طرف تلمیح کی ہے۔ کہ الم ترکیف فعل ربک باصحٰب الفیل ۵

اگرچہ نگارستان اور تاریخ گزیدہ میں سلطان اور خلیفہ کے مابین فردوسی کو بنائے مخاصمت بتایا گیا ہے۔ لیکن وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ فردوسی کا اس قصہ سے کوئی سروکار نہیں۔ حقیقت نفس الامر یہ ہے کہ سلطان اور خلیفہ کے درمیان ملک ماوراالنہر متنازعہ فیہ تھا۔ سلطان خواہش مند تھا کہ ملک ترکستان پر متصرف ہو مگر خلیفہ مانع تھا۔ جب سلطان نے دیکھا کہ عجز ولجاج سے کار برآری دشوار ہے تشدد کا رنگ اختیار کیا۔ جس کے جواب میں خلیفہ نے وہ مشہور لفظ "الم" لکھا۔ امیر عنصر المعالی کیکاؤس والیٔ طبرستان نے اپنی تصنیف کتاب قابوس نامہ میں یہ حکایت مفصل (باب سی ونہم در آئین کاتب) درج کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نزاع ملک ماوراالنہر کے لیے تھا نہ فردوسی کے لیے۔ لیکن جو لوگ اس تالیف کو فردوسی کی ملک مانتے ہیں۔ اس کی وجہ شاید وہ بیانات ٹھہرا سکتے ہیں جو اس کے دیباچہ میں مذکور ہیں۔

یوسف زلیخا کے دیباچہ میں شاعر کہتا ہے کہ میں نے اکثر داستانیں اور پرانے قصے نظم کیے ہیں۔ جن میں رزم بزم۔ دوستی۔ عداوت۔ بلندی اور پستی سے بحث کی ہے عشاق کے حالات لکھے۔ معشوقوں کا تذکرہ لکھا۔ مختصر یہ کہ ہر قسم کی نظم لکھی۔ ایسے مشغلوں سے اگرچہ دل کو فرحت حاصل ہوئی۔ لیکن فی الواقع میں نے تکلیف اور گناہ

کی کشتکاری کی۔ جس سے اب پشیمان ہوں۔ دل و زبان پر سکوت کی گرہ دیتا ہوں۔ آیندہ جھوٹے افسانے لکھ کر رنج و معصیت کی تخم ریزی نہیں کروں گا۔ فریدوں سے میں سیر ہوں۔ مجھے کیا نفع اگر ضحاک تازی کا تخت اس نے چھینا کیقباد اور اس کی مملکت سے دلگیر ہوں۔ تخت کیکاؤسی برباد ہو چکا ہے۔ کیخسرو اور افراسیاب کی داستانیں لکھنے سے عذاب کے سوا اور کوئی یاداش نہیں۔ میری اس حمایت پر جس میں نصف عمر کھو کر رستم کا نام زندہ کیا۔ اگر عقلاً ہنسیں تو موزوں ہے۔ اس بیان کے اثر میں غالباً یہ عقیدہ قائم ہو گیا کہ یہ کتاب فردوسی کی تصنیف ہے۔ لیکن کیا ان کا قائل کوئی غیر فردوسی نہیں ہو سکتا جس نے فردوسی کی طرح ان داستانوں پر قلم اٹھایا ہو لیکن اب وقت آگیا ہے کہ ہم اس کے بعض بیانات کا امتحان لیں۔ کیا یہ شخص فردوسی ہے؟ اگر فردوسی ہے تو بہت کچھ تبدیل ہو چکا ہو گا۔ جب اس نے زلیخا میں یہ اشعار لکھے ؎

برین مے سزد گر بخندد خرد　　　زمن خود کجا کے پسند و خرد
کہ یک نیمہ از عمر خود کم کنم　　　جہانے پر از نام رستم کنم

پور زال سے فردوسی کی بغاوت کے قصہ پر ہمارے کان مشکل سے یقین کر سکتے ہیں۔ اسی رستم کے لیے وہ شاہنامہ میں کہتا ہے ؎

جہاں آفریں تا جہاں آفرید　　　سوارے چو رستم نیامد پدید

ایک اور جگہ لکھتا ہے ؎

کسے را کہ رستم بود پہلوان　　　سزد گر بماند ہمیشہ جوان

شاہنامہ نظم کرتے وقت فردوسی ان داستانوں کے لیے گویا ہے کہ تم ان کو دروغ اور افسانہ مت جانو اور واقعات کی رفتار کو اپنے زمانے کے معیار کے مطابق قیاس مت کرو۔ جو باتیں قرین عقل ہوں ان کو باور کرو۔ باقی کی ترجمانی رمز و ایما کے ساتھ کی جا سکتی ہے ؎

تو ایں را دروغ و فسانہ مداں یکساں روش در زمانہ مداں

ازو ہرچہ اندر خورد باخرد دگر بر رہ رمز و معنی برد

اساطیر عجم کی نسبت شاعر کا یہ نقطۂ نظر معقولیت کا پہلو لیے ہوئے ہے لیکن زلیخا میں غیر ضروری سختی کے ساتھ کہتا ہے ؎

کہ آں داستانہا دروغ است پاک دو صد زاں نیرزد بیک مشتِ خاک

چہ باشد سخن ہائے برساختہ شب و روز زاندیشہ پرداختہ

یہ عام تکذیب و تردید پہلے نقطۂ نظر کے مقابلہ میں نہ صرف غیر منصفانہ بلکہ معاندانہ ہے۔

فردوسی کو شاہنامہ میں اپنے کارنامہ پر ایک غیر معمولی فخر اور ناز تھا۔ تخیلاً سلطان محمود کو خطاب کر کے فخریہ لہجہ میں یہ غیر فانی ابیات لکھتا ہے ؎

یکے بندگی کردم اے شہریار کہ ماند زمن در جہاں یادگار

بناہائے آباد گردد خراب ز باران و از تابشِ آفتاب

بنا کردم از نظم کاخی بلند کہ از باد و باراں نیابد گزند

کسی اور موقع پر یہی جوش مفاخرت یوں ادا ہؤا ہے ؎

بسے رنج بردم دریں سال سی	عجم زندہ کردم بدیں پارسی

مگر جب توبۂ نصوح سے ذوق باب ہو چکا ہے۔ خیالات میں ایک انقلاب عظیم مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ زلیخا ؎

ازاں تخم کشتن پشیماں شدم	زباں را و دل را گرہ برزدم

نگویم کنوں نام ہائے دروغ	سخن را ز گفتار ندہم فروغ

ہم ان دعاوی پر صدق دل سے ایمان نہیں لا سکتے۔ کیونکہ عمر بھر عجم اور صناوید عجم کی پرستاری میں مصروف رہ کر آخر وقت میں فردوسی کے لیے زندگی کا نیا ورق انبیاء کرام کی خدمت گزاری کے لیے لوٹنا تمام واقعات پر نظر رکھتے ہوئے مستبعد ضرور معلوم ہوتا ہے۔

اگر یوسف زلیخا فردوسی نے لکھی ہے تو ظاہر ہے کہ شاہنامہ ختم کرنے کے بعد لکھی ہوگی۔ جب وہ نزدیک ہشتاد تھا اور شاہنامہ کے بعد لکھے جانے کا خود اس تصنیف کو اعتراف ہے۔ شاہنامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا شاعر بالکل ضعیف اور بوڑھا ہو چکا تھا نہ صرف بال سفید ہو چکے تھے جو منازل پیری میں اوّلین منزل ہے بلکہ سماعت جاتی رہی ہے اور بصارت بالکل ضعیف ہو چکی ہے۔ کمر جھک گئی۔ دانت جھڑ گئے۔ دست و پا میں رعشہ نمودار ہے اور عصا کی مساعدت کے بغیر نقل و حرکت دشوار ہے اور یہ عام بیان ہے جو فردوسی اپنے بڑھاپے کے متعلق شاہنامہ میں دے رہا ہے جو ایک

اظہر اسی سال کے بوڑھے پر بالکل صادق آتا ہے۔ لیکن یہی بوڑھا جب مثنوی یوسف زلیخا میں اپنے بڑھاپے کی شکایت کرتا ہے تو صرف اسی قدر کہتا ہے کہ میرے بال سفید ہو گئے۔ شاعر کے طرزِ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی عمر میں یہ انقلاب یعنی پیری کی آمد اور بالوں کا سفید ہونا ایک تازہ واقعہ ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

نکارم کنوں تخم رنج و گناہ　　کہ آمد سپیدی بجائے سیاہ
پر از خاک شمشاد بود از نخست　　کنوں بر کراں سوسن تازہ رست

دیگر ؎

زمن دست گیتی بدزدید مشک　　بجائش پراگندہ کافور خشک
برآمد زناگاہ باز سفید　　گسستند زاغانم از جا امید
زمانے ہمی گشت زافراز باغ　　سرانجام بنشست برجائے زاغ

پیری کی اس قسم کی شکایت پینتالیس پچاس سال کے بوڑھے کی زبان سے بھلی معلوم ہوتی ہے۔ نہ اسی بیاسی سال کے پیر فرتوت کے منہ سے۔ تعجب ہے کہ یہ پیر ضعیف یوسف زلیخا میں پیری کی موجودگی سے اپنے میں یہی انقلاب دیکھتا ہے کہ اس کے بال سفید ہو گئے۔ مشک کافور بن گیا اور زاغِ سیاہ کی جگہ باز سفید نمودار ہو گیا۔ مقابلہ کے لیے میں شاہنامہ سے بھی بعض اشعار نقل کرتا ہوں ؎

رخِ لالہ گوں گشت بر سان کاہ　　چو کافور شد رنگ ریش سیاہ
ز پیری خم آورد بالائے راست　　ہم از نرگساں روشنائی بکاست

دیگر ؎

دو گوش و دو پائے من آہو گرفت   تہیدستی و سال نیرو گرفت

دیگر ؎

دو تائے شد آں سرو تازاں بباغ   ہماں تیرہ گشت آں فروزاں چراغ

پر از برف شد کوہسار سیاہ   ہمی لشکر از شاہ بیند گناہ

دیگر ؎

مرا ور خوش آب سستی گرفت   ہماں سرو آزاد پستی گرفت

خروشاں شد ایں نرگسان وژم   ہمی گردد از سستی و رنج وغم

اب ظاہر ہے کہ یوسف زلیخا کا بیان فردوسی کا بیان نہیں ہو سکتا بلکہ کسی اور شخص کا جو ہمارے شاعر سے بالکل مختلف ہے۔ یہ ممکن ہے کہ فردوسی کی طرح اس نے بھی داستانِ عجم پر قلم اٹھایا ہو۔

میں اس کتاب کے سبب تالیف سے بعض امور یہاں حوالۂ قلم کرتا ہوں۔ مصنف کہتا ہے کہ اتفاقاً ایک روز میں بختیاری کی یوسف و زلیخا کا ذکر تاج زمانہ اجل مُوفق سے کر رہا تھا۔ اس ذکر سے میری کوئی خاص غرض نہیں تھی۔ امام نے فرمایا۔ میں چاہتا ہوں تم بھی کسی شغل میں لگو اور بہتر تو یہ ہوگا کہ سرمایہ جمع کر کے اس قصہ کو نظم کر ڈالو مگر نظم کو دانش سے ترکیب دینا۔ اسقام و خطا سے بری رکھنا۔ تاکہ دوسرے شعراء کو اعتراض کرنے کی گنجائش نہ رہے۔ بندش اور ترکیب چست ہونی چاہیے۔ نکات اور

معانی دل پسند، اشعار دلچسپ اور بولتے قافیے ہوں۔ کلام نقص اور گنجلک سے پاک ہو۔ دلکش پاکیزہ اور رواں ہو۔ تاکہ میں وزیر امیر عراق کے پاس لے جاؤں۔ اور کچھ حصّہ اس کے سامنے پڑھا جائے۔ اس سے تمہاری شاعری کا پایہ محقق ہو جائے گا اور تمہیں یہ فائدہ ہوگا کہ اس کی مہربانی تمہارے حال پر ہوگی۔

میں نے اس عالم اجل کی گفتگو سُن کر جواب دیا کہ میں آپ کا تابعدار ہوں۔ جلد اس داستان کو نظم کر دوں گا۔ اگر یہ قصّہ عمدہ طریق پر نظم ہو گیا اور بادشاہ نے پسند فرما لیا، زمانے نے میری مساعدت کی اور شاہ میری خدمت گزاری سے خوشنود ہو گیا تو شاید اس بہانے سے میری قدر و منزلت میں اضافہ ہو جائے جس سے میری تشویش و افکار دور ہو جائیں گے۔ اگرچہ مجھ کو اپنی نادانی کا اقرار ہے لیکن اگر خدا کا فضل شاملِ حال ہے اور بادشاہ کا پرتو مجھ پر رہا۔ میں اپنی لیاقت کے بموجب اس کام میں کوشش کروں گا اور اپنی سمجھ کے موافق نظم کر دوں گا۔

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں ہم فردوسی سے دوچار نہیں ہیں بلکہ کسی اور گمنام شاعر سے جو فردوسی سے بالکل مختلف ہے اور جس کی شاعری کی شہرت بھی عام طور پر نامعلوم ہے۔ وزیرِ عراق سے اس کی تقریب کرانے کے لیے امام موفق اس کو زلیخا لکھنے کی ترغیب دیتا ہے۔ شاعر اس قدر گمنام ہے کہ وزیر کے دربار تک خود نہیں جا سکتا۔ اس کی مثنوی امام موفق کے توسط سے جائے گی جب امتحاناً تھوڑا سا مثنوی سے وزیر سُن لے گا اور پسند کرے گا تب کہیں غریب شاعر کی قسمت جاگے گی۔

اگر واقعی یہ شخص فردوسی ہے تو عراقیوں کی اس حماقت کا جواب شاید تاریخ میں کہیں نہ مل سکے کہ شاہنامہ کے ساٹھ ہزار اشعار پڑھنے کے بعد بھی ان کو فن شعر میں فردوسی طوسی خدائے سخن کا پایہ معلوم نہیں ہو سکا۔ اس کا امتحان لیا جاتا ہے اور بختیاری[1] جیسے گمنام شاعر کے مقابلہ میں کھڑا کیا جاتا ہے کہ اس کی مثنوی کا جواب لکھو۔ لیکن خدارا اس طرح لکھنا کہ دوسرے شاعر انگشت نمائی نہ کریں۔

امام اجل موفق[1] کی ہدایت پر جو ایک مبتدی شاعر کے لیے زیادہ موزوں ہو سکتی ہے۔ فردوسی برا ماننے کی بجائے الٹا فخر کرتا ہے اور خوشامد کے لہجہ میں جواب دیتا ہے۔ اس سبب تالیف نے مجھے اپنے عقیدے میں اور راسخ کر دیا ہے کہ اس تصنیف کو فردوسی سے کوئی نسبت نہیں۔ ع

چہ نسبت خاک را با عالم پاک!

---

[1] ایتھے کا خیال ہے کہ زلیخا فردوسی نے مجد الدولہ ابوطالب رستم ۳۸۷ھ و ۴۲۱ھ کے لیے نظم کی۔ پروفیسر نلدیکی کا اعتقاد ہے کہ بہاء الدولہ ۳۷۹ھ ۴۰۳ھ یا اس کے فرزند سلطان ۴۰۳ھ و ۴۲۶ھ کے واسطے لکھی ایتھے کے خیال کی موید کوئی دلیل موجود نہیں۔ اس سے اعراض کر کے میں نلدیکی کے نظریہ کو لیتا ہوں جس کی تائید میں یہ امور ملتے ہیں (۱) موفق بہاء الدولہ کا وزیر ہے۔ اس کا پورا نام ابوعلی (الحسن محمد) بن اسمٰعیل ہے (۲) اہواز کو بہاء الدولہ کی تاریخ میں زبردست اہمیت حاصل ہے (۳) بختیاری شاعر نے جس کا ذکر آیا ہے۔ عزالدولہ بختیار ۳۶۷ھ کے نام پہ اپنا تخلص رکھا ہوگا۔ جو بویہ خاندان کا ایک شہزادہ تھا۔ اس نظریہ کے خلاف میں اس قدر کہنا چاہتا ہوں

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۱۷۴)

کہاں فردوسی اور کہاں یہ غریب شاعر۔ لیکن ہم نے بدقسمتی سے شبہ کو گوہر اور ذرّے کو آفتاب مان لیا ہے۔

شاہنامہ اور یوسف زلیخا کے مقابلے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کتابیں اسلوب بیان اور زبان میں مختلف ہیں۔ شاہنامہ میں جہاں اجمال ہے یوسف زلیخا میں تفصیل اور طوالت دیکھی جاتی ہے۔ شاہنامہ سے ہم فردوسی کی خوبو، مزاج پسند و ناپسند اخلاقی نصب العین اور سوانح زندگی کے متعلق بہت کچھ جان سکتے ہیں۔ لیکن یوسف زلیخا میں شاعر نے اپنی شخصیت کو اس قدر چھپانے کی کوشش کی ہے کہ باوجود تمام کتاب پڑھ چکنے کے ہم اس کی ذات کے متعلق کوئی اطلاع حاصل نہیں کر سکتے۔ شاہنامہ میں عربی الفاظ کا استعمال اس تناسب سے نہیں ہے، جس تناسب سے فردوسی کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۳) :۔ کہ الاجل تاج الزماں موفق جس کا دیباچے میں مذکور ہے اور موفق وزیر بہاء الدولہ ایک شخص نہیں ہو سکتے۔ تاج الزماں اور کمال الزماں کی طرز کے القاب پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں ملتے ہیں۔ موفق بن اسمٰعیل وزیر بہاء الدولہ سنہ ۳۹۰ھ میں پہلی مرتبہ اور سنہ ۳۹۲ھ میں دوسری مرتبہ گرفتار ہوتا ہے اور عنقریب بعد وفات پاتا ہے۔ یوسف زلیخا کو شاہنامہ کے اختتام یعنی سنہ ۴۰۰ھ کے بعد لکھے جانے کا اعتراف ہے۔ اس سال سے بہت قبل موفق کا انتقال ہو جاتا ہے۔ زلیخا میں جس موفق کا ذکر ہے وہ کوئی عالم معلوم ہوتا ہے جو صاف الفاظ میں شاعر سے کہتا ہے کہ میں تمھاری مثنوی کو دستور امیر عراق کے پاس لے جاؤں گا ؎

برم نزد دستور میر عراق ✿ کہ گردانش خیلند ایران مشتاق ✦ فردوسی سنہ ۳۸۸ھ سے لیکر سنہ ۳۹۲ھ تک غزنی میں موجود ہے اور اس زمانے میں سلطان محمود سے اسکے خوشگوار تعلقات قائم ہیں اس لیے اس زمانہ میں اس کا اہواز جا کر مثنوی یوسف زلیخا بہاء الدولہ کے لیے تصنیف کرنا مستبعد معلوم ہوتا ہے۔

پیش رووں رودکی اور دقیقی کے ہاں ملتا ہے۔ لیکن یوسف زلیخا میں عربی الفاظ نہایت کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اگر واقعی فردوسی اس تصنیف کا مالک ہے تو دشوار معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اس طرز رائج الوقت کو جو ساٹھ ہزار ابیات لکھنے کے بعد اس کے لیے بمنزلہ طبیعت ثانی تھی۔ ترک کر کے ایسی روش اختیار کرے جو اس کے پس رووں میں رائج ہو۔

اسلوب بیان و زبان کے سلسلے میں دیکھا جاتا ہے کہ فردوسی کے ہاں اظہار مطالب میں تنوع اور بوقلمونی ایک نہایت محدود پیمانے پر ملتی ہے۔ جب کوئی خاص خیال اس کو ادا کرنا ہوتا ہے تو چند بار پیرایۂ بیان بدل کر وہ پھر انھیں الفاظ کے تکرار اور اعادہ پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس لیے تکرار شاہنامہ کے دلکش چہرہ کا نہایت بدنما خال ہے۔ یہ نقص زیادہ تر فردوسی کے عہد کی زبان کی ناداری اور بے مائگی کی بنا پر ہے۔ لیکن مثنوی یوسف و زلیخا میں دیکھا جاتا ہے کہ یہ نقص ایک حد تک غائب ہے۔

دونوں مصنّف ادائے مضمون، انتخاب الفاظ اور اسلوب کلام میں اس قدر مختلف ہیں کہ ان میں اشتباہ و التباس تقریباً دشوار ہے۔ مثلاً یوسف زلیخا میں حسب قاعدہ تفریس یہ الفاظ ملتے ہیں :۔

عفو (بحرکت دوم) لطف (بحرکت دوم) عمدا (بہ تسکین میم) عمّاری (بہ تشدید میم) نشاط (بہ تخفیف تشدید) میشوم بجائے مشئوم۔ اور مملکت بجائے مملکت۔

فردوسی ان الفاظ کے متعلق قاعدۂ تفریس سے بالکل ناواقف معلوم ہوتا ہے۔

یہ قاعدہ فردوسی کے عہد میں نامعلوم تھا۔ اگرچہ سلجوقی دَور کے شعرا مثلاً منوچہری۔ ناصر خسرو۔ اسدی۔ امیر معزّی۔ مسعود سعد سلمان۔ حکیم سنائی۔ عثمان مختاری۔ عمعق بخاری۔ ادیب صابر وغیرہم اس سے واقف ہیں۔

مرکبات توصیفی میں زلیخا میں اکثر ایسے مرکب ملتے ہیں جو اضافت تشبیہی یا بیانی کے ذریعہ سے بنتے ہیں۔ مثلاً گلشن حسن۔ کیمیائے جلال۔ چراغِ بصر۔ چراغِ جہاں چراغِ دل۔ سپہر وفا۔ آفتابِ ہنر وغیرہ۔

فردوسی کے ہاں ایسے مرکبات ہیں جو اسم فاعل اور اسم کی آمیز سے بنتے ہیں۔ مثلاً چرانندۂ کرگس۔ گرایندۂ تاج۔ فرازندۂ اختر۔ فزایندۂ نام۔ نشانندۂ شاہ ستانندۂ گاہ۔ فشانندۂ گنج وغیرہ۔

بعض الفاظ شاہنامہ میں رائج ہیں لیکن یوسف زلیخا میں متروک ہیں اور ان کی جگہ جدید الفاظ نے لے لی ہے۔ مثلاً شاہنامہ میں بویژہ کا قائم مقام زلیخا میں خاصہ ہے۔ شاہنامہ کے بند بستن کی جگہ عقد بستن اور بادِ سرد کی جگہ آہ اور گزاریدن خواب کی جگہ تعبیر ہے۔ شاہنامہ کا ارج۔ زلیخا میں درج اور آذین بستن۔ آئین بستن ہے۔ غریویدن۔ شاہنامہ میں بمعنی شور و فریاد ہے اور زلیخا میں گریۂ و زاری۔

فردوسی ارژنگ کو جادو نیرنگ اور تصویر کے معنوں میں لاتا ہے اور یہ معنی ایسے ہیں جن سے نہ صاحب یوسف زلیخا اور نہ دیگر اساتذہ واقف ہیں شاہنامہ میں ارژنگ پانچ موقعوں پر بمعنی تصویر آیا ہے۔ اس تکرار سے ظاہر ہے کہ فردوسی کے

نزدیک یہی معنی تھے۔ ترکیبی شکل میں ارژنگ چیں بمعنی تصویر چیں ملتا ہے۔ اگر فردوسی یوسف زلیخا لکھتا تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنے معلومہ معنی یوسف زلیخا میں ارژنگ کو نہ دیتا۔

ارژنگ مانی کی ترکیب زلیخا میں چار موقعوں پر ملتی ہے اور ہر موقع پر کتاب مانی یا نگارخانۂ مانی کے معنوں میں مستعمل ہے اور شاہنامہ والے معنی بھول کر بھی نہیں آتے۔ کیا فردوسی کو اسّی برس کی عمر میں زلیخا لکھتے وقت یہ امر محقق ہوا کہ ارژنگ مانی کی کتاب کا نام ہے نہ تصویر جو معنی شاہنامہ میں وہ لاتا رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ فردوسی مانی کی تاریخ سے واقف ہونے کی بنا پر مانی کی کتاب ارژنگ کے وجود کا قائل نہیں تھا۔ اسی لیے شاہنامہ میں وہ اس کا ذکر نہیں کرتا۔ اور اگر زلیخا لکھتا تو اس میں بھی اس قسم کی غلطی کے ارتکاب سے احتراز کرتا۔

مثنوی لیلےٰ مجنوں

ساتویں صدی ہجری میں سکندر ثانی علاؤالدین خلجی نے دیوگرھ۔ ورنگل۔ کرناٹک وغیرہ فتح کرکے دکن کو سلطنت دہلی کا صوبہ بنا دیا اور مسلمانوں کا قدم اس سرزمین میں جم گیا۔ لیکن یہ محمد تغلق کا عہد ہے جو سیاسی اور اقتصادی تغیرات سے مالامال ہے۔ وہ شاہانہ دل و دماغ لے کر آیا تھا۔ تختِ ہندوستان پر قدم رکھتے ہی چین و ایران کی فتح کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ لیکن وقت اس کی اولوالعزمیوں کے استقبال کے لیے آمادہ نہیں تھا۔ چنانچہ ہندوستان ہی نے اس کے راستے میں اس قدر مشکلات پیدا کردیں کہ وہی تلوار جو اس نے ممالک غیر میں ہندوستان کا اقتدار قائم کرنے کے لیے تیز کی تھی۔ اپنے رعایا کے خون سے رنگین کرنی پڑی۔ راجا اور پرجا، راعی اور رعیت میں ایک زبردست نفرت قائم ہوگئی اور جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ یہ نفرت خطرناک بغاوتوں کی شکل اختیار کرتی گئی اور اسی وقت ختم ہوئی۔ جب اس کو پیام اجل آپہنچا۔

محمد تغلق کی اصلاحی تجاویز میں ایک تجویز یہ بھی تھی کہ دہلی کو ترک کرکے

دولت آباد کو ہندوستان کا پایۂ تخت بنایا جائے۔ وہ اپنی اس تجویز پر ایک ناقابل یقین جنوں کی حد تک مصر رہا۔ ہر چند دولت آباد، آباد نہ ہو سکا۔ لیکن ایک مرتبہ اس نے دہلی کو ضرور اجاڑ دیا اور جب اس پر اس تجویز کی عملی مشکلات واضح ہو گئیں تو اگرچہ اس نے رعایا کو واپس دہلی جانے کا حکم دے دیا۔ تاہم ان میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جس نے نئے وطن کو ترجیح دی اور یہیں آباد ہو گیا۔ دلّی کے یہ آبادکار اپنے ساتھ دلّی کا تحفہ یعنی زبان اُردو بھی ساتھ لائے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا جب اُردو زبان دکن میں مرہٹی اور تلنگی زبان کے درمیان گلیوں اور بازاروں میں بولی جانے لگی۔

بغاوت امیران صدہ کے واقعے نے دکن کو بہت جلد خاندان تغلق کی اطاعت سے آزاد کر دیا اور عین وقت پر محمد تغلق کی وفات نے حسن بہمنی کو ممالک دکن کا مستقل تاجدار تسلیم کرا دیا۔

بہمنی دَور میں جو ۷۴۸ھ سے شروع ہو کر ۹۳۲ھ پر ختم ہوتا ہے۔ اُردو زبان دکن میں رواج پاتی رہی۔ اگرچہ تحریری شہادت موجود نہیں۔ تاہم قیاس میں آتا ہے کہ مسلمانوں کی اس نئی بستی کی عام زبان اُردو تھی کیونکہ اس کو تعلیم یافتہ فرقہ بول سکتا تھا۔ فارسی صرف درباری زبان تھی اور کوئی تعجب نہیں اگر ضرورتاً اس عہد میں اردو تالیفات شروع ہو گئی ہوں۔ بہمنی خاندان کی بربادی پر ان کی میراث پانچ ریاستوں میں تقسیم ہو گئی۔ ان میں اُردو ادبیات کی ترویج کے لیے خاندان قطب شاہیہ کا قدم پیش پیش ہے۔ بالخصوص محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸ھ و ۱۰۲۰ھ) کا نام

اُردو کی تاریخ میں آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ جس کے عہد میں مستقل تصنیفات لکھی جانے لگی تھیں۔ خود محمد قلی اُردو اور فارسی کا زبردست شاعر تھا۔ اس کے ضخیم کلیات پر جو اٹھارہ سو صفحات پر شامل ہے۔ حال ہی میں مولوی عبدالحق صاحب آنریری سکریٹری انجمن ترقی اُردو نے رسالہ اُردو بابت ماہ جنوری ۱۹۲۲ء میں ایک پُر مغز اور عالمانہ تبصرہ لکھا ہے۔

محمد قلی بہ لحاظ علم دوستی ایک بے نظیر شخصیت معلوم ہوتا ہے۔ علوم کی سرپرستی میں جس قدر اس نے حصہ لیا ہے ہم ابھی اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ کیونکہ اس کے عہد کے ذہنی کارناموں کی تاریخ ابھی تک مدوّن نہیں ہوئی ہے۔ اس کی سرپرستی میں متعدد نفیس اور علمی کتابیں تالیف ہوئی ہیں جو آج یورپ کے مشرقی کتب خانوں کی زینت بنی ہوئی ہیں۔

اختیارات قطب شاہی جو اختیارات بدیعی (طبّی تصنیف) کی ایک ضخیم تنقید ہے۔ اسی بادشاہ کے حکم سے اطبّا کی ایک جماعت نے تالیف کی ہے۔ جس کا اصل نسخہ راقم کے مجموعۂ کتب کے نوادرات میں سے ہے۔

مثنوی لیلیٰ مجنوں بھی احمد دکنی نے اسی بادشاہ کے حکم سے نظم کی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اعلیٰ اور نفیس کتب خانہ کا مالک تھا۔ راقم نے ایسی بیسیوں کتابیں دیکھی ہیں جو اس کی مہر اور اس کے بھتیجے اور جانشین محمد قطب شاہ کی مہر اور دستخطوں سے مزیّن تھیں۔

ایک لحاظ سے یہ زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں زرّیں دَور کے نام سے یاد کیا جاسکتا ہے۔ آگرہ کے تخت پر جلال الدین اکبر بادشاہ جلوہ افروز تھا۔ علوم کی سرپرستی اور فنون ظریفہ کی حمایت میں گویا سلطان حسین مرزا اور امیر علی شیر نوائی کے عہد کا احیا ہوگیا تھا۔ تصویرکشی اور خطاطی کی بیحد قدر کی جاتی تھی۔ صنّاع اور دستکاروں کی حوصلہ افزائی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا جاتا تھا۔ ادب و شعر کی گرم بازاری تھی۔ دکن میں اگرچہ اکبر کی ارضی فتوحات دیر میں شروع ہوتی ہیں لیکن اس کی علمی اور صنعتی فتوحات کی ہوائیں پیشتر سے گولکنڈہ اور بیجاپور کی پہاڑیوں سے جاجا کر ٹکرا چکی ہیں۔ اسلامی تاریخ کے دَوران میں ایک مخصوص اصول باربار نظر افروز ہوتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ سلاطین اور رؤسا ایک دوسرے کی تقلید میں بیحد اصرار کرتے تھے اور جب ایک دربار کسی خاص علمی یا صنعتی اوصاف میں ممتاز ہوتا، دوسرے رؤسا اور سلاطین اپنے اپنے دائرۂ اثرات میں ضرور اس کا اتباع کرتے تھے۔ وہ علم کا جواب علم سے اور باغات و عمارات کا جواب باغات و عمارات سے دیتے تھے اور یہ ہم چشمی ان میں ہر زمانے میں مشاہدہ کی جاتی ہے۔ اکبر اعظم کی علمی ضیا باریوں نے نہ صرف فتح پور اور آگرہ کو جگمگا دیا تھا بلکہ اس کی شعاعوں نے دندھیاچل کی چوٹیوں سے نفوذ کرکے دکن کی وادیوں کو بھی مطلع نور بنادیا تھا۔ دکن میں تصویرکشی کا ایک نیا دبستان قائم ہوجاتا ہے جو اصفہان کے مقابلے میں آگرہ سے زیادہ فیضان حاصل کرتا ہے۔ اس میں بعض مقامی خصوصیات بھی موجود ہیں۔ یہ دکنی دبستان اگرچہ وسعت، بلند آہنگی

اور عظمت میں کبھی بھی آگرہ کے دبستان کو نہ پہنچ سکا۔ لیکن دلکشی، نزاکت اور پختگی میں اکبری دبستان سے کم نہیں ہے۔

کتاب زیرِ نظر ایک منظوم و مصوّر لیلیٰ مجنوں ہے۔ جو محمد قلی قطب شاہ کے ارشاد پر دکنی اُردو میں لکھی گئی ہے۔ ناظم کا تخلص احمد ہے۔ اس سے زیادہ مصنف کے متعلق کچھ کہا بھی نہیں جا سکتا۔ گارساں دتاسی نے پانچ لیلیٰ مجنوں کا ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ کتاب اس مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ نہ کسی اور تذکرے میں اس کا سراغ چلتا ہے۔

میرے مخدوم اور کرم فرما پروفیسر سید عبدالقادر ایم۔ اے پروفیسر تاریخ اسلامیہ کالج لاہور تاریخی کتب کی تلاش کے سلسلے میں اس کتاب کو حاصل کرتے ہیں اور نہایت مہربانی کر کے میرے استفادہ کی غرض سے مجھ کو عنایت فرما دیتے ہیں جس کے لیے میں سید صاحب کا تہ دل سے منت گزار ہوں۔

یہ مثنوی اپنی گزشتہ آب و تاب اور حسن کی ایک خستہ یادگار ہے۔ اس کی موجودہ ویرانی اس کے اصلی جوبن کا پتہ دے رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بچّوں کی مصاحبت زیادہ تر اس کی بربادی کی ذمہ دار ہے۔ کتاب کا اکثر حصّہ غائب ہے۔ صرف انچاس منتشر اوراق ہیں جو زمانے کی دستبرد سے باقی رہ گئے ہیں۔ ان میں چودہ تصاویر اکبری دبستاں کی طرز میں موجود ہیں۔ لیکن اگر شکستہ و ریختہ قریب قریب کوئی ورق سلامت نہیں ہے۔ اس کی جو پیوند کاری ہوئی ہے وہ سکھا شاہی زمانے سے تعلق

رکھتی ہے۔ لیکن ایسے شخص کے ہاتھوں سے عمل میں آئی ہے، جس کو نہ تصاویر سے محبت تھی اور نہ متن سے سروکار تھا۔ تصاویر پر جو اصلی کتاب سے تعلق رکھتی ہیں، کسی غیر قلم میں جو گزشتہ صدی کا معلوم ہوتا ہے۔ مشائخ و بزرگانِ دینؒ کے نام مرقوم ہیں۔ مثلاً لیلیٰ کی بیماری کی تصویر پر لکھا گیا ہے "شاہزادی" ایک پر لکھا ہے "حضرت غوث اعظم پادشاہ"۔ کسی مجلس پر "فرہاد و شیریں" کسی پر "حضرت امام حسین بن علی بن طالب"، کسی پر "حضرت امام حسن رحمۃ اللہ علیہا ابن علی ابن طالب کرم وجہ (کذا) ایک پر "خواجہ فریدالدین عطار" اور ایک پر "حضرت خواجہ خضر" اگرچہ ظاہر ہے کہ ان تصاویر سے ان بزرگوں کو کوئی علاقہ نہیں ہے۔

پیشتر اشارہ کیا جا چکا ہے کہ فنِ مصوری میں دبستانِ دکن بہ لحاظ کلیات دبستان اکبری کا مقلد ہے جو اپنے پیش رو دبستان ہرات کا اتباع کرتا ہے۔ پُرشکوہ عمارات قدرتی مناظر۔ صحرا و باغ۔ گل و ریاحین۔ سبزہ و لبِ جو۔ طیور و وحوش۔ میدانِ جنگ اور کوہستانی مناظر کے پیش کرنے میں دبستانِ اکبر بہت کچھ پیش پیش ہے۔ فتح پور سیکری کے قدرتی مناظر اور عمارات اکبری مصورین کے پیشِ نظر تھیں۔ اور ان کو اکثر اوقات کثرت تکرار کے خوف سے بے خبر عالمِ رنگ و نقش میں بار بار پیش کرتے ہیں۔ دُور اُفق میں پہاڑوں کی ٹیکریاں اور پتھروں کی چٹانیں دکھائی جاتی ہیں۔ جن کی ترتیب اور اظہار میں مصورین خاص اہتمام سے کام لیتے ہیں۔ چٹانوں کے دامن میں سبزہ لہلہا رہا ہے جس کے گرد سرسبز نہال دُور و نزدیک نظر آتے ہیں۔ نیلگوں آسمان میں غوطے لگانے والے

آفتاب کی ناتواں شعاعوں نے ایک زرّیں دریا کی کیفیت پیدا کردی ہے۔ اس نیم سبز اور رنگلگوں سراب میں بسیرا لینے والے پرندے قطار در قطار اپنے آشیانوں کو جاتے نظر آتے ہیں۔ سب سے بلند چٹان پر ایک پہاڑی بکرا اپنی پوری عظمت کے احساس کے ساتھ زیر قدم وادیوں پر ایک نگاہ غلط انداز ڈال رہا ہے۔

قریب قریب یہی خط و خال دبستانِ دکن میں بھی کسی قدر تبدیلی کے ساتھ جو مقامی خصوصیات کی مناسبت سے نشو و نما پاتے ہیں۔ ترتیب اشیاء، لباس، چہرے کا حلیہ بعینہٖ وہی ہے۔ البتہ انسانی جسم کے دو اعضاء کے اظہار میں وہ مختلف ہے۔ دکن نے آنکھ کو کٹار کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ سینے کو بہت ابھارا ہے اور کمر کو بہت نازک بنا دیا ہے۔ دکنی نقّاش خاص خاص تصاویر پر اپنا زورِ قلم دکھاتا ہے۔ اور اکثر تصاویر کو ایک قابلِ رحم اور غیر تکمیل یافتہ حالت میں چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔

ایک امر میں ہندوستانی مصوّر ایرانی نقّاش پر تفوّق رکھتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ایرانی مصوّر تخیل کے اعتبار سے برخلاف ایرانی شاعر کے ایک محدود سرمایہ کا مالک ہے۔ ایران کی قدرتی سرسبزی، چار فصلیں، باغات کی کثرت، گل و ریاحین کی بہتات، طیور و وحوش اور قدرتی مناظر کی افراط سے تو یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہاں کا تصویر کش اپنے ملکی مناظر اور گرد و پیش کی فضا میں اپنی تصاویر کو بے انتہا متفاوت مناظر اور جذبات کا دلکش مرقع بنا دیتا ہوگا۔ لیکن افسوس سے دیکھا جاتا

ہے کہ اس کی قوتِ تخیل نہایت محدود ہے۔ وہ قدرت کی دلفریب اشیاء پر نظر نہیں ڈالتا۔ اپنے گرد و پیش فطرت کے اعلیٰ نمونوں سے کوئی رابطہ نہیں رکھتا۔ اس کے پیشِ نظر وہ مرقعے ہیں جو ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری کے مغولی اور تیموری دبستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ نمونے بجائے خود ہر قسم کے تخیل سے عاری ہیں اور ایرانی مصوّر کا معراج یہی ہے کہ وہ ان نمونوں کی تقلید کرے۔ جس طرح شعر میں ایرانی شاعر تقلید کا پابند ہے۔ یہی حالت وہاں کے مصوّر کی ہے۔ ہندوستان میں شاعر اگرچہ شاعری کا مقلّد رہا ہے۔ لیکن برخلاف اس کے ہندی مصوّر نے اپنے آپ پر تقلید کی زنجیروں کا سلسلہ برپا نہیں کیا۔ صحیفۂ فطرت اس کے پیشِ نظر ہے اور قدرتی مناظر کی طرح اس کا تخیّلہ بھی غیر محدود ہے۔ وہ فطرت کے نمونوں کا خواہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ اہم ہو یا غیر اہم نہایت غور کے ساتھ مطالعہ کرتا ہے اور اس کی تمثال کو نقش و رنگ کے واسطے سے صفحۂ قرطاس کے حوالے کر دیتا ہے۔

قطب شاہی خاندان مذہب جعفریہ کا جو شیعہ فرقہ کی ایک شاخ ہے متبع تھا اور اسی لیے شاہانِ صفویہ سے جنہوں نے ایران میں شیعہ مذہب کو فروغ دیا تھا۔ ان کے تعلقات نہایت دوستانہ تھے اور رسل و رسائل کا سلسلہ باہم جاری تھا۔ شیعہ فقہا نے ایران میں نستعلیق کے بجائے خطِ نسخ کو فروغ دینے کی کوشش کی تھی۔ فقہا کی تقلید یا اتفاق قطب شاہی دربار میں بھی خطِ نسخ کو بہت تقویت دی گئی چنانچہ اس لیلیٰ مجنوں کا خط بھی نسخ ہے۔ کتاب کی تقطیع $9 \times 5\frac{1}{2}$ ہے۔ فی صفحہ گیارہ اشعار ہیں اور

نہایت صاف جلی قلم میں مرقوم ہے۔ رسم الخط میں بعض مقامی خصوصیات مشاہدہ میں آتی ہیں جو زیادہ تر ہندی اصوات کے اظہار کے لیے ایجاد ہوئی ہیں۔ چنانچہ جیم فارسی، رائے ہندی یعنی ڑ۔ اور دال ہندی یعنی ڈ اور بائے فارسی کے نیچے بالعموم تین نقطے دیے گئے ہیں۔ تائے ہندی یعنی ٹ پر چار نقاط لگائے گئے ہیں۔ کاف فارسی کو کاف تازی کی طرح لکھا گیا ہے اور بعض اوقات اس کے نیچے بھی تین نقطے دیے گئے ہیں۔

میں اس کی زبان کی بعض خصوصیات یہاں بیان کرتا ہوں:۔

عربی و فارسی الفاظ جو روزمرّہ میں مستعمل ہیں۔ کاتب نے ان کا املا بالکل ہندی طریق پر لکھا ہے۔

مثلاً فائدہ کو "فائدا" (الف کے ساتھ) صراحیان کو "سراحیان" یا "سوریاں ذوق" کو "زوق" عذر خواہی کو "عزر خواہی" نور کو "سور" ذرہ کو "زرہ" افطار کو "افتار" خوش کو "خش" خوشی کو "خشی" راضی کو "راجی" ساز کو "ساج" منجم کو "مونجم" جواب کو "جاب" خیر کو "کھیر" مدد کو "مدت" نثار کو "نسار" حیا کو "ہیا" صورت گری کو "سورت گیری" اور کبیر کو "کھبیر" لکھا ہے۔

جمع کی حالت میں اسم کے آخر میں الف نون عام طور پر زیادہ کر دیا جاتا ہے۔ امثال۔ جنس۔ جنساں۔ میوہ۔ میویاں۔ نعمت۔ نعمتیاں۔ حکمت۔ حکمتاں۔ سنبل۔ سنبلاں۔ سوال۔ سوالاں۔ جواب۔ جواباں۔ حرف۔ حرفاں وغیرہ۔ لیکن ذیل کی صورتیں

مختلف ہیں۔

رشک واحد۔ رشکوں جمع۔ دروں واحد۔ درونیں جمع۔ ابرو واحد۔ ابروں جمع۔ صراحی واحد۔ سوریاں جمع۔

ایسے الفاظ جن میں حرف دوم ساکن ہے۔ شاعر ایسے ساکن کو عموماً متحرک کر دیتا ہے۔ امثال :۔

نرم۔ نَرَم (بہ تحریک دوم) شرم۔ شَرَم (بہ تحریک دوم) صدر۔ صَدَر۔ (بہ تحریک دوم) مچھر۔ مچھَر (بلا تشدید و بہ تحریک دوم) دنیا۔ دریا۔ دنیاں۔ دَرَیا (بہ تحریک دوم و اشمام یا) جرعہ۔ جَرَعَ (بہ تحریک سوم و تخفیف دوم) بچّی۔ بچی (بہ تخفیف تشدید) بعض اوقات دیکھا جاتا ہے کہ شاعر بعض الفاظ میں نون کو غنّہ بنا دیتا ہے۔ مثال جنگل ؎

جو چمکے ترے عدل کی بجلی   جنگل ظلم کا جال لینی چلی

مثال ننگا ؎

ننگے سر ننگے پاؤں ننگے سر پہ   پھرے شہر میں جن سو کیوں ہوئے گھبیر

مثال بندہ ؎

جو عاجز بندے عجز سوں پیش آئیں (کذا)

سو تقصیر بخشائے بخشش بجائے

ماضی کے آخر میں الف سے پیشتر ایک یے جو اشمام کے ساتھ بولی جاتی ہے۔

اضافہ کردی گئی ہے۔ امثال

کہا۔ کہیا۔ چھوٹا۔ چھوٹیا۔ لگا۔ لگیا۔ لکھا۔ لیکھیا۔ بھرا۔ بھریا۔ مانا۔ مانیا۔ رکھا۔ رکھیا۔ بڑا۔ بڑیا۔

اس مثنوی میں عربی، فارسی الفاظ ایک معتد بہ مقدار میں ملتے ہیں۔ بعض مثالیں عرض ہیں ؎

جلالت سوں جب یک تجلا کرے ۔۔۔ تو آکاس کوں توڑ سرمہ کرے

دیگر ؎

جو توفیق دے شکر کارن کسے ۔۔۔ سو وہ پھیر نعمت اوکہ ہووے
سو نعمت پہ پھر شکر لازم کرے ۔۔۔ سو اس پر بی جگ شکر قائم دھرے
سو وہ شکر نعمت اوکر ہوئے پھر ۔۔۔ سو نعمت ستیں یوں بدہے جم بجیر
دے جن کرے عجز ہوں اعتراف ۔۔۔ قبولے کرم سات راکھے معاف
بہو عجز سو اُس احمد دھرے ۔۔۔ کہ ساہیں دکھت عجز رحمت کرے

بعض ہندی الفاظ کے املا میں بھی وہ ہم سے مختلف ہے۔ مثلاً دکھ۔ سکھ۔ بکھ رکھ وغیرہ کو دک۔ سک۔ بک۔ رک لکھتا ہے۔ لیکن تجھ۔ ساتھ۔ ہاتھ۔ کچھ وغیرہ کو تج۔ سات۔ ہات اور کچ کی شکل میں تحریر کرتا ہے۔

بعض حروف و اسمار کی قدیم شکلیں یہاں دکھائی جاتی ہیں:۔

خیال۔ خیال (با شمام یار) مشاطہ۔ مشاطا (بغیر تشدید) بغیر۔ بغر

(بہ تخفیف یا) آزمانا۔ ازمانا (بغیر مد) سالک۔ سلوک (بہ فک اضافت) سبھی سبہ۔ بوند بوند۔ بند بند۔ باہر۔ بہر۔ اکیلی۔ یکیلی۔ سے۔ تھے۔ مجھے۔ منجے۔ اور۔ ہور۔ میں۔ مانہ۔ نہیں۔ نانہ۔ تو۔ تیا۔ بھی۔ بی۔ کبھی۔ کبھیں۔ بے۔ اچھے۔ کا۔ کیرا۔ میں۔ مان (ظرفیہ) میں۔ منی (ظرفیہ) جلانا۔ جالنا۔ گلانا۔ گالنا۔ آگ لگائی۔ آگ لائی۔ جلا جلا کر۔ جال جال۔ ہوں۔ اچھوں۔ چھری چھوری۔ میں ہوں۔ میں سو۔ کبھی۔ کدہیں۔ بہت۔ بھوت۔ بہت۔ بھوتیکر۔ طرح۔ وہاتھ۔ تیرا سبق۔ تجھ سبق۔ سب کچھ۔ سب کوچ۔ بجلی۔ بیجلی۔ جلالیتی۔ جال لیتی۔ کیا۔ کیتا۔ دیا۔ دیتا۔ جوش کرکے۔ جوش کرکن۔ سراہنا۔ سرہاناں۔ رکھتا۔ راکھتا۔ آپ۔ آپیں۔ سورج۔ سور۔ چاند۔ چندا (بانون غنہ) جو کچھ۔ جے کچ۔ کا۔ کرا۔ تک۔ لک۔ چرہا۔ چھپیا۔ بہت۔ بہوتیک۔ بزار۔ سہس۔ میرا۔ منج۔ بھنورا۔ بھنورہ (بہ تحریک واؤ) سے۔ تے۔ کہ۔ جو۔ انہوں کا۔ انو کا۔ ساتواں۔ ستیں۔ کے۔ کر۔ تلے۔ تل۔

مثنوی کے افتتاحیہ ابیات یہ ہیں ؎

اس اللہ کے ناؤں سوں سب حکمت — جو دانی دیا ونت اس کی صفت

سرہانا سب اللہ کوں جم قرار — جو جگ کا دھنی ہور پروردگار

جو دنیا میں کافر مسلمان کوں — سنگے من سو بخشتے بھو مان سوں

شاعر نے حمد کے بعد تین مناجاتیں لکھی ہیں۔ ان مناجاتوں کے پہلے پہلے بیت پر قناعت کرتا ہوں۔

از مناجات اوّل ؎

الٰہی جو میں داس ہوں تو دھنی   سدا میں گدا ہور تو ہے غنی

از مناجات دوم ؎

رحیمی سو رحمت کرے سو رحیم   کریمی کے سب گن دھرے سو کریم

مناجات سوم ؎

جگت کا غنی سب سکت کا دھنی   جو اسکوں سہی کبریا ہور منی

یہ کتاب محمد قلی قطب شاہ کے نام پر لکھی گئی ہے۔ سرخی کے علاوہ بادشاہ کا نام شعرِ ذیل میں ملتا ہے۔ ؎

محمد قلی قطب شاہ ہے شاہاں   جسے چرن سیوک شاہان جہاں

بادشاہ کی فرمائش کا ذکر ذیل کے ابیات میں ملتا ہے ؎

جو منج بخت کوں فتح یاور ہوا   سو منج بخت کا سیوک انبر ہوا

جو شہ آپ تھے آپ منج یاد کر   منجے غم کی بندگی تھے اذاد کر (کذا)

دیتی امر علی کی یہ باغ لاؤں   جو پالوں اسے شہ امرت ناؤں

جو میں شہ کا امر سر پر لیتا   ترت باغ لانی شتابی کیتا

بہوتیک پریشانے روزگار   اگرچہ منجے ہے ملالت سو بار

بہوتیک شغلاں ستیں راۃ دن   نتھی منج فرصت بھلڑ یک بن

دلے آس دہر شہ کے فرمان پر   لگیا تن سنگارن بہو قصد دہر

دہر میں عشق کی باس اس بنکے پھول　　جو اس باس پر جوں بھنور جگ کے بھول
سو کچ عشق کوں اب جگت میں جگاؤں　　جو گھر گھر تے لیلیٰ و مجنوں او چاؤں
جو لیلیٰ و مجنوں تھے بولوں پوران　　سو تازہ کروں اب النو کا پوران
جو اس بن چمن پر تھے گزرے پون　　پون باس تھے باس لے سرک بن
جو اس باغ پر شہ کا داغ ہے　　سو باغوں میں یہ باغ شہ باغ ہے
دہنی باغ کا شہ ہیں باغبان　　بھنور باغ کا کیوں نہووے آسمان
جو اس باغ مہکار تھے جگ بھرے　　سو سر مست کر قدسیاں کو دھرے
سو کچ شہ کوں یہ بن مبارک ہو　　جو اس بن تھے ہر روز نو روز ہو
شہنشہ کے ارکان دولت جے کوئی　　مبارک الوں پر بھی یہ باغ ہوئے
جکوئی باغ کی باغبانی کرے　　سو اس باغ تھے شادمانی کرے
دہنی باغ کا باغباں کوں نواز　　بہوم حمت سوں کرے سرفراز
جو احمد کرے آس دہر بن سنگار　　سو اب شہ تھے پائے ستین سنگار

احمد ایک ایسے عہد میں جبکہ اُردو زبان اپنا گہوارہ چھوڑ کر گھٹنیوں چلنے کی کوشش کر رہی تھی خاصہ مہارت اور قادر الکلامی کا ثبوت دے رہا ہے۔ اشعار آیندہ میں اس نے مجنوں کے باپ کے جذبات کا خاکہ کھینچا ہے۔ موقع یہ ہے کہ قیس آبادی کو چھوڑ کر جنگل آباد کر چکا ہے۔ اس کے باپ کو خبر ہوتی ہے۔ بے تاب ہو کر آتا ہے۔ فرزند کی زار حالت دیکھتا ہے۔ اس کا دل کڑھتا ہے اور سمجھانے کی

کوشش کرتا ہے ٥

گیا پوت کا مکہ دکھن آس سو — رہیا پوت کے دکھ سوں نراس ہو
تری آگ تھے جیو میرا جلے — تری آہ تھے سوم ہو تن گلے
کیتا تو جلے ہور جالے ہنجے — تیا کیا گلے ہور گالے ہنجے
جو توں ہے پیار نیں منج کوں — ہنسوں کیوں جو روتے دیکھوں نیں کوں
میرا جیو ہے توں مرے لاڈلے — جلے جیو جس کا سو کیوں نا جلے
رکھیا آس جو توں بساوے محل — نجانیا کہ توں یوں جگاوے جنگل
جو گھر چھوڑ جنگل بسانے لگیا — سو تج تھے جنگل ہور جنگل بی جلیا
نین میگہ برسن جو ہوئے نپاس — گلے پربتاں ہور جلے سب اکاس
دلے دل ترا کچ پگھلتا نہیں — جو میرے کہے سات چلتا نہیں
رہی مائی جاں کندنی بیں جرم — سو اس پر نہیں چک تیرا کرم

ولادت مجنوں ٥

بغیر از خدا کون قدرت رکھے — جو پانی سوں سورۃ گیری کر سکے (کذا)
بہو چاہو کیتی دیکھت کرب جب — سو پورے ہوئے کرب کے ماس سب
جو ناموس کوں چودواں چاند ہووے — او کھایا اجالا کیتا جگ دوئے
نکھا مکھ مبارک دیکھی دائی جب — سنی ہیں دبی سر تھی پگ لاگ سب
اسے دائی پھل تیر سوں سر نہلائی — دلے ان کنک دان سوں سیس نہائی

بھائی اوڑھائی امولک حریر — کیتی دائی کوں ماں دے کر کھیر
خوشیاں کرا دے قیس رکھی جو نام — لگی وارنے وام اس پر تمام
خزینے دفینے دیتی وار وار — تو سگلے فقیراں ہوئے مالدار

احمد کے کلام میں پختگی کے علاوہ اس کی زبان میں صفائی اور زور دونوں موجود ہیں۔ یہ ابیات ملاحظہ ہوں۔ جن میں ایک بزرگ مجنوں کے باپ کو اس کے اولاد نہ ہونے پر تسلی دیتے ہیں ؎

خداوند جگ کا کریم و رحیم — جکچ دیں حکمت سو دے وو حکیم
جے کچ حکمت اس کی تقاضا کرے — سو وہ چھوڑ کس وہاتھ دوجا کرے
نہیں باج حکمت کچ اس کا کھیا — نہ بن مصلحت کچ لیا ہور دیا
بہو تیک مراداں نہ ہوے مرحمت — سو اس میں اچھیں خیر ہور مصلحت
کسی پر سو نعمت بلا ہو بھرے — کسی کو بلا وے سو نعمت کرے
نراستھی بلا دیک نہ آس ہووے — نہ نعمت کوں بھل کر سٹی ڈھاک کوے

ان اشعار پر بھی نظر رہے ؎

۱۔ میری خاک میں تھے جو اپجے نہال — وفا کے لگے پھول پھل ڈال ڈال
۲۔ جو روشن کرے رات کوں آہ سوں — سو ہووے روشنی دین کی راہ کوں
۳۔ سنے کی چھوری ہوئے تو کیا ہوا — نہیں پیٹ میں مار لینا روا

دکن میں اردو کے ساتھ ساتھ طبقۂ عوام میں فارسی بھی بولی اور سمجھی جاتی تھی۔

لیکن وہ اس قسم کی فارسی ہے جس پر تعلیم یافتہ طبقہ ہر زمانے میں ناک بھوں چڑھائے گا۔ احمد دکنی اس مثنوی کا ناظم اُردو کا زبردست شاعر ہے۔ لیکن فارسی سے بے بہرہ ہے۔ اگرچہ اپنی مثنوی میں اس نے بعض موقعوں پر حکمت اور نجوم کی اصطلاحات کو خوب برتا ہے۔ وہ اپنے مذہب سے بھی جو شیعہ تھا بخوبی واقف معلوم ہوتا ہے۔ اور ایک شعر سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بوستاں سعدی سے بے خبر نہ تھا مثلاً سعدی کے مصرع "مرادرارسد کبریا دمنی"

بجنسہٖ اس نے اپنی زبان میں اس طرح ترجمہ کیا ہے ع

"جو اس کو سہی کبریا دمنی"

تاہم کہا جا سکتا ہے کہ اس کی فارسی ہمارے عہد کے کالجوں کے انگریزی خواں طلبا کی فارسی سے کسی طرح بہتر نہیں تھی۔ میں اس کتاب کی سرخیوں سے جو فارسی میں مرقوم ہیں بعض فقرات نقل کرتا ہوں :۔

"نزد درویش بردند مجنوں را پدر او"

دیگر:۔ "مجنوں فقیر شدہ بخانۂ لیلیٰ رفتند"

دیگر:۔ "آں صحیفہ دیدن لیلے و باز مضمون آں صحیفہ فرستادن نزد مجنوں"

دیگر:۔ "پدر مجنوں بخانۂ لیلے رفتن" (کذا)

دیگر:۔ "پنہاں کردند لیلیٰ را زشنام دادند مادر"

دیگر:۔ "پدر لیلے دختر خود را بردند نزد مجنوں شتر لیلے آمدند"

دیگر:۔ " درخواب لیلےٰ مجنوں مردہ دید خود را تپ آمدند"

میں نے دانستہ احمد کی شاعری کے متعلق کچھ نہیں کہا ہے۔ اس لیے کہ ایک قدیم زبان کے ساتھ جو اب سے تین سو سال پیشتر رائج تھی۔ وہی شخص انصاف کر سکتا ہے جو اس زبان کا پُورا ماہر ہو۔ اس امر میں شک نہیں کہ ادب اُردو کی تاریخ میں اس مثنوی کو ایک خاص اہمیّت حاصل ہے۔ اس کے ذریعے ہمیں ایک ایسے شاعر کا سراغ ملا ہے جو اب تک نامعلوم تھا۔ دکن میں جتنے شعرا گزرے ہیں اور جن کے حالات تذکروں میں ملتے ہیں۔ سب کے سب محمد قلی قطب شاہ اور احمد کے دَور کے بعد کے ہیں۔ اس نظر سے بھی یہ مثنوی خاص وقعت کی مستحق ہے۔

یہاں ایک اور امر کی طرف بھی اشارہ کیا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ احمد کے ہاں جو نظم کی حالت دیکھی جاتی ہے۔ اس سے قیاس لگایا جا سکتا ہے کہ وہ مثنوی کا ابتدائی نمونہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک ایسے وقت کی یادگار ہے جب کہ نظم نے ایک معتدبہ حد تک ترقی کر لی تھی۔ اس لیے ضروری ہے کہ سلاطین بہمنیہ کے دور میں بھی اُردو شعرا موجود ہوں۔ لیکن ان کے کلام کا سراغ لگانا حضرات دکن کا کام ہے ؂

حالی اور مسدسِ حالی

پانی پت میں کچھ کم سات سو برس سے قومِ انصار کی ایک شاخ آباد چلی آتی ہے۔ غیاث الدین بلبن کے عہد میں اس شاخ کے ایک بزرگ خواجہ ملک علی نامی ہرات سے ہندوستان وارد ہوئے۔ بلبن نے چند سیر حاصل دیہات بطور مدد معاش عطا کرکے پرگنہ کا قاضی مقرر کر دیا۔ پانی پت کے انصاری اسی بزرگ کی اولاد ہیں۔ مولانا حالی اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ولادت کے بعد ہی ان کی والدہ کا دماغ مختل ہو گیا۔ نو سال کی عمر میں والدہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ بھائی بہنوں کے سوا کوئی سرپرست نہیں رہا۔ قرآن شریف ختم کرنے کے بعد سید جعفر علی سے فارسی کی چند ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ یہ بزرگ میر ممنون دہلوی کے داماد اور بھتیجے تھے۔ فارسی سے آشنائی حاصل کرنے کے بعد مولوی حاجی ابراہیم حسین انصاری سے جو شیعوں میں ایک جید عالم مانے جاتے ہیں، عربی صرف و نحو شروع کی۔ سترہ سال کی عمر میں شادی ہو گئی۔ بیوی کے میکے والے چونکہ آسودہ حال تھے اس لیے تلاشِ معاش کو بالفعل بے سود

اور غیر ضروری سمجھ کر جس کے لیے ان کے اقارب ان کو مجبور کر رہے تھے ۔ شوقِ علم میں گھر سے روپوش ہو کر دہلی جا پہنچے ۔ یہاں صرف و نحو اور منطق کی کتابیں مولوی نوازش علی مرحوم کے درس میں پڑھیں ۔ یہ ایک مشہور واعظ اور مدرس تھے ۔ قیامِ دہلی کے زمانے میں مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ مرحوم کے ہاں آنا جانا شروع کیا تو شاعری کا شوق بھی پیدا ہو گیا ۔

۱۸۵۵ء میں رشتہ داروں کے مجبور کرنے پر واپس پانی پت گئے اور ڈیڑھ برس تک بطور خود عربی دیکھتے رہے ۔ ۱۸۵۶ء میں ایک قلیل تنخواہ کی اسامی ضلع حصار کے کلکٹر کے دفتر میں مل گئی ۔ لیکن غدر ۱۸۵۷ء میں انگریزی حکومت برطرف ہوئی ۔ مولانا پانی پت چلے آئے ۔ اس کے بعد وہ نواب مصطفےٰ خان شیفتہ کے مصاحب ہو گئے ۔ جب تک نواب مرحوم زندہ رہے مولانا ان کے جلیس رہے ۔ شیفتہ کے اثر میں ان کی شاعری نے فروغ حاصل کیا اور ان ہی کی صحبت نے ان کو نیچرل شاعری کی طرف متوجہ کیا ۔ نواب مرحوم غیر ضروری مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے ۔ واقعیت اور حقیقت آپ کی طبیعت پر غالب تھی ۔ شیفتہ کی وفات کے بعد پنجاب گورنمنٹ کے بکڈپو میں ان کی تقرری عمل میں آئی ۔ اس دفتر میں ان کا کام انگریزی سے اُردو تراجم کی اصلاح تھی ۔ اس سلسلہ میں وہ چار سال تک لاہور رہے ۔ اسی زمانے میں انھوں نے مولانا آزاد کے مشاعرے کے لیے اپنی مثنویات نشاطِ امید ۔ برکھارُت وغیرہ لکھیں ۔ بعد ازاں لاہور سے اینگلو عربک اسکول دہلی کے مدرس مقرر ہو کر دہلی تشریف

لے گئے۔ ۱۳۰۵ھ میں جب سر آسمان علی جاہ علی گڑھ تشریف لائے۔ مولانا حالی بھی وہیں موجود تھے۔ سر آسمان علی جاہ نے گورنمنٹ نظام کی طرف سے مولانا کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ اور مولانا نے ملازمت غیر ضروری سمجھ کر اینگلو عربک اسکول سے اپنا تعلق منقطع کر لیا۔

اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے کہ مولانا کی شعر و شاعری نواب مصطفےٰ خاں مرحوم کی صحبت میں چمکی۔ اس سے پیشتر قیامِ دہلی کے زمانے میں اگرچہ مرزا غالب سے ان کے تعلقات قائم ہو گئے تھے اور مرزا نے ان کو اپنے چند قصیدے بھی پڑھائے تھے اور مشکل اور دقیق اشعار کے معانی کا حل بھی کرتے رہے تھے تاہم ان ایام میں مولانا نے باقاعدہ شعر گوئی نہیں شروع کی تھی۔ اصل یہ ہے کہ شیفتہ نے ان کی شاعری کے خوابیدہ ذوق کو بیدار کیا۔ نواب مرحوم مبالغہ دل سے ناپسند کرتے تھے۔ حقائق اور واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنے اور سچی باتوں کو محض حسنِ بیان سے دلفریب بنانے کو منتہائے کمال شاعری سمجھتے تھے۔ چھچھورے اور ادنےٰ خیالات کے اظہار کو مرزا اور نواب دونوں معیوب جانتے تھے۔ نواب موصوف کی مصاحبت اور اس طرف لاہور میں انگریزی خیالات سے اُردو تراجم کی بدولت آشنائی حاصل کرنے سے مولانا میں اس خاص مذاق نے نشوونما پائی جس کے اثر سے انھوں نے بعد میں جدید شاعری کی بنیاد ڈالی۔

۱۸۹۳ء میں انھوں نے اپنا اُردو دیوان چھپوا کر شائع کیا۔ جس میں ان کی

جدید اور قدیم رنگ کی نظمیں شامل ہیں۔ تمہید میں ایک زبردست مقدمہ شاعری پر لکھا ہے۔ جس سے شاعری کے متعلق ان کے صحیح مذاق، تعمق نظر اور وسعت معلومات کا پتہ چلتا ہے۔

تصنیفات

سب سے پہلے مولانا نے ایک کتاب "تریاقِ مسموم" ۱۸۶۷ء میں پادری عماد الدین کی کتاب ہدایت المسلمین کے جواب میں لکھی۔ اسی پادری کی تاریخ محمدی کا ایک تبصرہ مولانا نے ایک رسالے کی شکل میں لکھا جس میں مسٹر بجل اور غیر متعصب یورپین مصنفین کی آرار کا مقابلہ آنحضرت صلعم کے متعلق نہایت خوبی سے کیا ہے۔

لاہور میں ایک عربی کتاب جو طبقات الارض پر فرانسیسی زبان سے ترجمہ ہوئی تھی۔ اُردو قالب میں شائع کی۔ اس ترجمہ کا کاپی رائٹ بغیر کسی معاوضہ کے پنجاب یونیورسٹی کو دے دیا۔ اور ڈاکٹر لائٹنر نے اسی زمانے میں یونیورسٹی کی طرف سے چھپوا کر شائع کیا۔ قیامِ لاہور کے زمانے میں انھوں نے مستورات کی تعلیم کے لیے ایک کتاب قصہ کے پیرائے میں دو جلدوں میں لکھی۔ اس کتاب پر کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب نے بمقام دہلی ایک ایجوکیشنل دربار میں لارڈ نارتھ بروک کے ہاتھ سے چار سو روپے کا انعام دلوایا تھا۔ یہ کتاب ایک مدت تک اودھ اور پنجاب کے مدارس میں جاری رہی۔ مثنوی کلمۃ الحق ۱۸۶۲ء میں اور مسدس حالی یا مدّ و جزر اسلام ۱۸۷۹ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب سید احمد خاں

کے ایما سے لکھی گئی تھی۔ فرماتے ہیں :۔

"قوم کے ایک سچے خیر خواہ نے جو اپنی قوم کے سوا تمام ملک میں اسی نام سے پکارا جاتا ہے اور جس طرح خود اپنے پیر اور ہاتھ اور قوی بازو سے بھائیوں کی خدمت کر رہا ہے اسی طرح ہر اپاہج اور نکمے کو اسی کام میں لگانا چاہتا ہے آگر ملامت کی اور غیرت دلائی کہ حیوان ناطق ہونے کا دعویٰ ہے اور خدا کی دی ہوئی زبان سے کچھ کام نہ لینا پڑے شرم کی بات ہے ؎

روچو انساں لب بجنباں در دہن

در جمادی لاف انسانی مزن

قوم کی حالت تباہ ہے۔ عزیز ذلیل ہو گئے ہیں۔ شریف خاک میں مل گئے ہیں۔ علم کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ دین کا صرف نام باقی ہے۔ افلاس کی گھر گھر پکار ہے۔ پیٹ کی چاروں طرف دہائی ہے۔ اخلاق بالکل بگڑ گئے ہیں اور بگڑتے جاتے ہیں۔ تعصب کی گھنگھور گھٹا تمام قوم پر چھائی ہوئی ہے۔ رسم و رواج کی بیڑی ایک ایک کے پاؤں میں پڑی ہے۔ جہالت اور تقلید سب کے اوپر سوار ہے۔ امرا جو قوم کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں غافل اور بے پروا ہیں۔ علما جن کو قوم کی اصلاح میں بڑا دخل ہے۔ زمانے کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف ہیں۔ ایسے وقت میں جس سے کچھ بن آئے سو بہتر ہے ورنہ ہم سب ایک ہی ناؤ میں سوار ہیں اور ساری ناؤ کی سلامتی میں ہماری سلامتی ہے۔ ہر چند لوگ بہت کچھ لکھ چکے ہیں اور لکھ رہے ہیں۔

مگر نظم جو کہ انسان کو بالطبع مرغوب ہے اور خاص کر عرب کا ترکہ اور مسلمانوں کا موروثی حصّہ ہے۔ قوم کے بیدار کرنے کے لیے اب تک کسی نے نہیں لکھی۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ اور تدبیروں سے کیا ہؤا جو اس تدبیر سے ہوگا۔ مگر ایسی تنگ حالتوں میں انسان کے دل پر ہمیشہ دو طرح کے خیالات گزرتے ہیں۔

ایک یہ کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔

دوسرے یہ کہ ہم کو کچھ کرنا چاہیے۔

پہلے خیال کا نتیجہ ہمیشہ یہ ہؤا کہ کچھ نہ ہؤا۔ اور دوسرے خیال سے دنیا میں بڑے بڑے عجائبات ظاہر ہوئے ؎

در فیض است منشیں از کشائش ناامید اینجا
برنگ دانہ میر دید زہر قفلے کلید اینجا

مولانا فرماتے ہیں:۔

"ناصح کی جادو بھری تقریر دل میں گھر کر گئی۔ دل ہی سے نکلی تھی۔ دل ہی میں جا کر ٹھہری۔"

آخر مولانا نے اس مسدس کی بنیاد ڈالی۔ اگرچہ دنیا کے مکروہات اور بیماریوں کے ہجوم سے اطمینان کبھی نصیب نہیں ہؤا۔ لیکن یہ عالی حوصلہ اپنی دھن کا پکا نکلا اور یہ مسدس ۱۸۷۹ء میں شائع ہو گیا۔ مسدس کیا تھا وہ بجلی کا کڑکا یا صوت ہادی۔ ایک آواز میں سارے سوتے ہوؤں کو جگا دیا۔

یہ ایک نہایت سادہ اور سلیس نظم ہے جس میں نہ حسن وعشق کے معرکے ہیں اور نہ شاعرانہ وسخنورانہ موشگافیاں پائی جاتی ہیں۔ تشبیہ اور استعارے سے بالکل معرّا ہے۔ تمہید کے چند بندوں کے بعد شاعر نے عرب الجاہلیتہ کی حالت کا نقشہ بہ سبیل اجمال دکھا کر آفتابِ اسلام کے طلوع ہونے کا منظر پیش کیا ہے۔ نبی آخر زمان کی تعلیم وتلقین سے ریگستانِ عرب دفعتاً ایک سدا بہار باغ بن جاتا ہے۔ مسلمان تمام اقوامِ عالم پر دینی ودنیاوی ترقیات میں سبقت لے جاتے ہیں۔ علوم وفنون اور دیگر اصنافِ تمدّن میں بازی لے جاتے ہیں۔ عروج کے بعد ان کے زوال کے حالات بیان کرتے ہوئے شاعر نے مسلمانانِ ہند کی موجودہ تصویر دکھائی ہے جس میں ان کے تنزل اور پستی سے بحث کی گئی ہے۔ اصحاب ثروت اور امرا کے ذلیل مشغلے اور بیکار مصروفیت کا اچھا خاصہ سین کھینچ کر دکھایا ہے۔ علما کے تعصّب، غصّہ اور کج خلقی، ان کی شرک پرستی باایں ہمہ دعوئے توحید کے خدوخال علیحدہ کھینچے گئے ہیں۔ شرفا کی اولاد کی بد اطواری اور بے سلیقگی۔ علوم وفنون میں ان کی بدشوقی۔ رذیل صحبتوں میں ان کا بیٹھنا اور انھیں کے ڈھنگ اختیار کر لینا۔ پڑھے لکھے لوگوں سے ان کا تنفر۔ جوان ہو کر ان کا عشق بازی میں انہماک۔ ان کی بدچلنی۔ ماں باپ سے بے مہری۔ وغیرہ وغیرہ کے واقعات کسی قدر تفصیل سے درج ہیں۔ ہماری موجودہ شاعری جو گیسوئے رسا اور آہِ نارسا۔ گل وبلبل۔ شمع وپروانہ۔ حسن وعشق۔ وصال وفراق

شراب و میخانہ۔ ساقی و پیمانہ۔ خد و خال جاناں۔ نالۂ سحری۔ گریۂ نیم شبی۔ تجلی طور۔ اور گیسوئے حور۔ افسانۂ مجنوں و لیلیٰ۔ شیریں و فرہاد۔ بے بصر صناع۔ بے جا مبالغے۔ بے معنی تشبیہات و استعارات کی بھول بھلیاں میں پھنس کر دین و دنیا کے مصرف کے لیے بیکار ہو گئی ہے۔ شاعر نے پُر مغز الفاظ میں اس کی بے لاگ تنقید کر کے عرب کی شاعری سے مقابلہ کیا ہے جس نے ملکی اور قومی ترقی میں عملی حصہ لیا ہے۔ عرب شاعروں اور خطیبوں نے اخلاق اور عادات کی تہذیب اور اصلاح میں بہت امداد دی ہے۔

آخر میں بے درد تعلیم یافتہ مسلمانوں کا ذکر کرتے ہوئے قوم کی عام غفلت کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس سلسلے میں فرماتے ہیں ؎

جہاز ایک گرداب میں پھنس رہا ہے　　پڑا جس سے جوکھوں میں چھوٹا بڑا ہے
نکلنے کا رستہ نہ بچنے کی جا ہے　　کوئی ان میں سوتا کوئی جاگتا ہے

نہ سوتے ہیں وہ مست خواب گراں ہیں
جو بیدار ہیں ان پہ خنداں زناں ہیں

اس کے بعد مولانا حالیؔ اس قدیم فلسفیانہ مقولے کو بیان کرتے ہیں جس کی رو سے انسان کو دنیا میں اپنی موجودگی ضروری ثابت کرنے کے لیے صفات ذیل میں سے کسی ایک کی ضرورت ہے۔ یعنی عقل۔ علم و ہنر۔ دولت۔ مولانا اپنے انداز میں اس کو یوں لکھتے ہیں :۔

کسی نے یہ اک مرد دانا سے پوچھا کہ نعمت ہے دنیا میں سب سے بڑی کیا
کہا عقل جس سے ملے دین و دنیا کہا گر نہ ہو اس سے انساں کو بہرا
کہا پھر اہم سب سے علم و ہنر ہے کہ جو باعثِ افتخارِ بشر ہے
کہا گر نہ ہو یہ بھی اس کو میسّر کہا مال و دولت ہے پھر سب سے بڑھ کر
کہا در ہو یہ بھی اگر بند اس پر کہا اس پہ بجلی کا گرنا ہے بہتر
وہ ننگِ بشر تا کہ ذلت سے چھوٹے
خلائق سب اس کی نحوست سے چھوٹے

ان اشعار کے ماخذ کی تلاش میں ہم جامی کے ان اشعار سے دو چار ہوتے ہیں ؎

جامی آید دریں سرائے سپنج دولتِ مرد عقل مادر زاد
دگر آں نیست شیوۂ ادبی کردہ حاصل ز خدمتِ اُستاد
دگر آں نیز نیست، سیم و زرے کہ شود پردہ پوش شر و فساد
دگر آں نیز نیست حادثۂ
کہ کند نخل عمرش از بنیاد

لیکن ذیل کے اشعار سے ظاہر ہے کہ جامی نے اپنا چراغ فردوسی کی شمع فیضان سے جلایا ہے۔ چنانچہ ؎

بپرسید پس موبدے تیز مغز کہ اندر جہاں چیست انبار نغز

کجا مرد را روشنائی دہد ز رنج زمانہ رہائی دہد

چنیں داد پاسخ کہ ہر کو خرد بیابد ز ہر دو جہاں برخورد

بدو گفت اگر مینتش بخردی خرد خلعت روشن است ایزدی

چنیں داد پاسخ کہ دانش بہ است چو دانا شود بر مہاں برمہ است

بدو گفت اگر آب دانش بجست بدیں آب ہرگز رواں را نشست

چنیں داد پاسخ کہ با مرد گرد تن خویش را خوار باید شمرد

اگر ناوک دارد ہزار نبرد سر بد سگال اندر آرد بگرد

گرامی شود بر دلِ بادشا بود جاوداں شاد فرمانروا

بدو گفت اگر نیستش بہ زیں نہ دانش پژوہد نہ آئیں نہ دیں

چنیں داد پاسخ کہ آں بہ کہ مرگ
نہد بر سر او یکے تیرہ ترگ

مولانا حالیؔ اپنے نتیجہ میں ایک مایوسی بخش لہجہ میں فرماتے ہیں ؎

امیروں کی تم سُن چکے داستاں سب چلن ہو چکے عالموں کے بیاں سب

شریفوں کی حالت ہے تم پر عیاں سب بگڑنے کو تیار بیٹھے ہیں یاں سب

یہ بوسیدہ گھر اب گرا کا گرا ہے
ستوں مرکزِ ثقل سے ہٹ چکا ہے

یہ جو کچھ ہوا ایک شمہ ہے اس کا کہ جو وقت یاروں پہ ہے آنے والا

زمانے نے اُونچے سے جس کو گرایا وہ آخر کو مٹی میں مل کر رہے گا

نہیں گرچہ کچھ قوم میں حال باقی

ابھی اور ہونا ہے پامال باقی

یہاں پر ترقی کی غایت یہی ہے سرانجام ہر قوم و ملت یہی ہے

سدا سے زمانے کی حالت یہی ہے طلسم جہاں کی حقیقت یہی ہے

بہت یاں ہوئے خشک چشمے ابل کر

بہت باغ چھانٹے گئے پھول پھل کر

الغرض یہ ایک مختصر سی نظم تھی جو زبان دانی کی طلسم بندیوں اور الفاظ کے آب وتاب سے بالکل معرّا تھی۔ لیکن اس نے شائع ہوتے ہی مسلمانوں میں ایک آگ سی لگادی۔ گھر گھر اس کا چرچا ہوگیا۔ اس نے سوتوں کو جگا دیا اور جاگتے ہوؤں کو مصروفِ عمل کر دیا۔

دیوان خواجہ معین الدین اجمیریؒ

کیا یہ دیوان انہی کی ملکیت ہے؟

کسی زبان کی ادبی تاریخ کے گہرے مطالعہ کے وقت بعض عجیب و غریب باتیں یک محقق کی نظر سے گزرتی ہیں مصنّفین کے سلسلے میں بعض ایسی ہستیاں نظر آئیں گی جو بغیر کسی صحیح استحقاق کے بزم ادب کے مشاہیر میں شمار ہو کر اصلی اور حقیقی ستحقین کے دوش بدوش کھڑی ہیں۔ حقیقتاً اس بزم میں ان کی باریابی کسی نامعلوم بے انصافی یا کسی اتفاقی غلطی اور غلط فہمی کی بنا پر ہوتی ہے۔ جس کی اصلی حقیقت ہمعصر تاریخ کی یاد سے محو ہو کر ہمیشہ کے لیے ایک راز سربمہر بن گئی ہے۔

ان میں بعض ایسے بے رحم ہیں جو نہایت بے دردی اور سنگدلی کے ساتھ یر لوگوں کے کلام پر قبضۂ مالکانہ جما کر ان کی تمام عمر کی محنت اور جانکاہی کے یجہ کو اپنا بنا کر مشہور کر دیتے ہیں۔ ایسے حضرات کو اگر "ادبی قزاق" کے

نام سے موسوم کیا جائے تو موزوں ہوگا۔ بعض وقت ان کا راز طشت از بام ہو جاتا ہے۔ لیکن اکثر اوقات نہیں ہوتا۔ ادبی قزاق ہر قوم اور ہر زبان میں پائے جاتے ہیں۔ صاحب کشف المحجوب کا ایک واقعہ ہے کہ ان کا دیوان جس کی ان کے پاس صرف ایک نقل تھی۔ کسی شخص نے مستعار مانگا اور یہ ستم ظریفی کی کہ مطالعہ کے بعد بجائے واپسی کے اصل کتاب سے ان کا نام خارج کر کے اس کو اپنے نام سے مشتہر کر دیا۔ اسی طرح تصوّف میں آپ کی ایک اور تالیف منہاج الدین نامی ایک شخص نے عاریتاً دیکھنے کو لے کر اپنی طرف منسوب کر دی۔

انوریؔ کا قصّہ مشہور ہے کہ ایک روز بلخ کے بازار سے گزرتے ہوئے کسی مقام پر اس نے لوگوں کا ہجوم دیکھا۔ بھیڑ چیر کر اندر گیا تو دیکھتا ہے کہ خود انوری کے اشعار ایک شخص مجمع میں سنا رہا ہے۔ شاعر نے بڑھ کر اس سے پوچھا۔ کہ "یہ اشعار کس کے ہیں؟" اس شخص نے جواب دیا "انوری کے!" دوبارہ سوال کیا کہ "انوری کو جانتے بھی ہو؟" اس شخص نے جواب دیا "چہ خوش جانتا کیسا میں خود انوری ہوں"۔ انوری نے ہنس کر کہا "شعر دُزد" سنتے آئے ہیں۔ لیکن "شاعر دُزد" آج ہی دیکھا[1]۔

---

[1] لطائف الطوائف علی بن حسین الواعظ کاشفی ص ۱۰۹ طبع آقا محمد شیرازی ملک الکتاب بمبئی ۱۳۱۱ھ؎

یہی انوری اپنے قصیدے میں کسی نامی شاعر کے متعلق گویا ہے ؎

کس دانم از اکابر گردن کشان نظم

کورا صریح خون دو دیوان بگردنست

شادی[1] آبادی اس شعر کی شرح میں لکھتا ہے کہ امیر معزّی نے مولانا احمد سادی اور مولانا حمید اسغانی (؟) کے دیوان پر غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا۔

دوسرا گروہ اس گروہ سے کم خطرناک نہیں۔ لیکن نوعیّت عمل میں بالکل متضاد ہے۔ اخلاقی نظر میں ان کا فعل چنداں مذموم نہ مانا جائے۔ لیکن ادبی اخلاق، اخلاقِ مروّجہ سے مختلف ہیں۔ ادبی نقطۂ نظر سے ان کا جرم اسی قدر سنگین اور اہم ہے۔ جس قدر سابق الذکر گروہ کا۔ اگرچہ نوعیّت کے اعتبار سے ان کے جرم کے مختلف مدارج ہیں۔ جس طرح کوئل کوّے کے گھونسلے میں اپنے انڈے چھوڑ آتی ہے۔ یہ گروہ اپنی تصانیف کو دوسرے کے سر تھوپ دیتا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ قابلِ نفریں وہ طبقہ ہے جو گزشتہ بزرگانِ دین کے نام پر اپنے دماغی کارناموں کو شہرت دیتا ہے۔ کیونکہ اس کا مقصد بعض مذہبی مسائل پر رجحان عام کی تبدیلی ہوتی ہے یا کسی خاص فرقہ کی آراء کو مقبول عام بنانا اصلی مقصد ہوتا ہے۔

بعض امراء اور رئیس ادبیاتِ لطیفہ کے دلدادہ ہوتے ہیں لیکن چونکہ تصنیف کی

---

[1] شرح قصائد انوری از محمد بن داؤد بن محمد علوی شادی آبادی۔

قابلیت کا جوہر اُن میں مفقود ہوتا ہے۔ اس لیے کرایہ کے ٹٹو ان کے لیے یہ کام کرتے ہیں۔ بعض لوگوں کو خبط ہوتا ہے کہ اپنا کلام دیگر مشاہیر کی طرف مضاف کر کے زبان زدِ عام ہوتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ سیاسی اغراض کی تعمیل کی غرض سے اکثر مجہول تصانیف پیدا کی جاتی ہیں۔ سلف پرستی ایک اور شکل ہے۔ جس میں معتقدین اپنے پیر و مرشد کے اصلی جوہر کو زیادہ فروغ اور رونق دینے کی غرض سے ادب و شاعری وغیرہ کے اضافی کمال ان کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔

تیسری صورت مغالطہ ہے جس میں بوجہ ہمنامی یا محض اتفاقیہ غلطی کی بنا پر ایک شخص کا کلام دوسرے کے سر منڈھ دیا جاتا ہے۔ ہمنامی کی وجہ سے تاریخ میں اکثر غلطیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ لیکن مغالطہ اور سلف پرستی کا فرق دریافت کرنا بعض اوقات ایک مورّخ کے لیے نہایت دشوار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ معلول کو دیکھتا ہے اور علّت اس کی نگاہوں میں چھپی رہتی ہے۔ نتیجہ اس کے پیشِ نظر ہے۔ لیکن اس نتیجہ کو بروئے کار لانے والی ہستیاں آنکھوں سے غائب ہیں۔

یہاں مغالطہ یا سلف پرستی کی مثال میں دیوان حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے متعلق ایک تبصرہ پیش کیا جاتا ہے۔

یہ دیوان مطبع نول کشور میں سب سے پہلی مرتبہ ۱۲۸۸ھ مطابق ۱۸۷۱ء میں طبع ہوا۔ جب سے اب تک کئی بار چھپ چکا ہے اور کتب فروشوں کے ہاں عام طور پر ملتا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا جلال الدین الٰہی بخش تاجران کتب لاہور نے

نیا ایڈیشن نکالا ہے۔ اس کے قلمی نسخے بھی وقتاً فوقتاً نظر سے گزرتے ہیں۔ اکثر گزشتہ صدی یا قرنِ ماسبق سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور لوگ خواجہ صاحب کا کلام سمجھ کر نہایت عزیز رکھتے ہیں۔

کارپردازانِ مطبع نول کشور نے اس دیوان کے متعلق اشاعت بار اوّل میں خاتمہ پر یہ بیان دیا ہے:-

"آج تک کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ حضرت خواجہ صاحب قدس سرہٗ باد یگر کمالات صوری و معنوی مذاقِ شعر و شاعری بھی رکھتے تھے حسنِ اتفاق سے ہم کو ایک مختصر دیوان حضرت صاحب کا بمنزلہ کلیات کتب خانۂ متجمع کمالات جناب منشی مردان علی خاں صاحب رعنا نائب دیوان سرکار مارواڑ سے نصیب ہوا اور اس پر مواہیر فیضی و ابوالفضل ثبت تھیں۔ معلوم ہوا کہ وہ کتب خانہ اکبر بادشاہ کا تھا اور شہنشاہ ممدوح ازبس معتقد حضرت خواجہ صاحب قدس سرہٗ کا تھا۔ اس نے اپنے عہد دولت میں بہم پہنچایا۔ اور شکرِ خدا کہ ہم کو گھر بیٹھے بے منّت ہاتھ آیا۔ چونکہ یہ نعمت غیر مترقبہ تھی۔ اس لیے ہم نے واسطے یادگار حضرت کے طبع کیا۔ تاکہ بطور تبرک کے لوگ اسے حرز زبان بنائیں اور ہم بھی اس سعادت سے ثمرۂ خیر پائیں"۔

اس میں پہلا بیان تو صریحاً غلط ہے۔ دیوان ممکن ہے کہ اسی قدر قدیم ہو۔

جیساکہ دعویٰ کیا گیا ہے۔ لیکن یہ بیان کہ اکبر نے کوشش کرکے بہم پہنچایا۔ ثبوت کا محتاج ہے۔ اگر اس قسم کا کوئی ذکر اس نسخہ میں تھا تو کارپردازانِ مطبع کا فرض تھا کہ اسے بھی دیوان کے ساتھ شائع کرتے۔ اس میں شک نہیں کہ بوجہ حضرت شیخ سلیم چشتی شہنشاہ جلال الدین اکبر ایک زمانۂ خاص تک خواجہ اجمیر کا بہت معتقد رہا ہے۔ چنانچہ فتح پور سے اجمیر تک پا پیادہ سفر بھی کیا ہے۔

اس کے بعد کارپردازانِ مطبع کا بیان ہے:۔

"جناب خاں صاحب موصوف سے ہم نے دریافت کیا کہ آپ کو کس جگہ سے یہ نسخۂ اکسیر ہاتھ آیا۔ خاں صاحب ممدوح نے یہ روایت بیان کی کہ ایک شب میں نے حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بمقام لکھنؤ ۱۸۶۵ء رویائے صادقہ میں دیکھا کہ حضرت صاحب میرے مکان پر تشریف لائے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ ایک نقش تبرکاً مجھ کو عنایت ہو۔ چنانچہ حضرت صاحب نے عنایت فرمایا۔ اس کی تعبیر یہ ہوئی کہ اسی کے قریب ایک دست فروش میرے پاس یہ دیوان ایک پرانی ردّی کتاب جان کر گھر بیٹھے فروخت کر گیا۔"

خواب کے متعلق رائے زنی کرنا ایک ادبی نقاد کے منصب میں داخل نہیں کیونکہ اس کے موضوع واقعات ہیں نہ ظنّیات۔ اس لیے راقم اس کی معماکشائی

سے اعراض کر کے اسی گزارش پر اکتفا کرتا ہے۔ کہ ہیں یہ قصہ قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں۔ اس لیے کہ مردان علی خاں رعنا اور منشی نول کشور پہلے حضرات نہیں ہیں۔ جنھوں نے سب سے پیشتر اس دیوان کا سراغ نکالا ہے۔ بلکہ ان کے عہد سے ایک صدی پیشتر تک کے اہلِ علم کو کم از کم اس کا ضرور علم تھا اور جیسا کہ سابق میں گزارش کر چکا ہوں۔ یہ دیوان اس قدر نایاب بھی نہیں تھا۔ چنانچہ اسی دیوان کے متعلق تذکرہ روز روشن صفحہ ۶۳۷ پر حضرت خواجہ معین الدین کے حالات میں مصنف نے یہ دیوان حضرت خواجہ کی طرف منسوب کرتے ہوئے کہا ہے :۔

"دیوانے مختصر از ملفوظات آں قدوۂ عرفائے کرام و اسوۂ اولیائے عظام پیشِ نظر است و ایں چند اشعار منتخب از اں مختصر کہ در وے جائے معین و جائے معینی تخلص مے فرماید۔"

انتخاب میں صاحب تذکرہ نے چھیالیس بیت اور ایک رباعی دی ہے۔ ان میں سے موجودہ دیوان نول کشور میں قریباً سترہ اشعار جو دس مختلف غزلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ موجود نہیں ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ صاحب تذکرہ روز روشن کے زیرِ نظر اس مطبوعہ دیوان کا اصل نسخہ نہیں ہے۔ بلکہ کوئی اور قلمی نسخہ ہے جس میں اس نسخہ سے زیادہ غزلیات ہیں۔

تذکرہ مخزن الغرائب (۱۲۱۸ھ) میں حضرت خواجہ کے نام صرف دو رباعیاں درج ہیں۔ یہ مصنف دیوان کے وجود سے بے خبر معلوم ہوتا ہے۔ وہ

رباعیاں یہ ہیں :-

(۱)

عاشق ہمہ دم فکر رخ دوست کند　　معشوق کرشمہ کہ نیکوست کند
ما جرم کنیم و او لطف و عطا　　ہر کس ہر چیز لائق اوست کند

(۲)

اے بعد نبی بر سر تو تاج نبی　　وے دادہ شہاں ز صولتت باج نبی
آئی تو کہ معراج تو بالاتر شد　　یک قامت احمدی ز معراج نبی

پہلی رباعی روز روشن میں بھی درج ہے۔

مردان علی خاں مبتلا نے اپنے تذکرۂ منتخب الاشعار میں جو ۱۱۶۱ھ میں تصنیف ہوا ہے۔ صرف پچھلی رباعی حضرت خواجہ کے نام پر لکھی ہے اور مصرع دوم کو مصرعۂ اوّل کی بجائے لکھا ہے۔ یعنی ترتیب بدل دی ہے۔

میر حسین دوست تذکرۂ حسینی میں جو ۱۱۶۳ھ میں مرقوم ہوا ہے۔ خواجہ معین الدین چشتی کے حالات بالتفصیل دیتا ہے اور آخر میں ان کے دیوان سے ایک رباعی اور تین غزلوں کے بعض اشعار نقل کرتا ہے۔ آتشکدہ آذر میں صرف گزشتہ دو رباعیاں ملتی ہیں۔ اور مجمع الفصحا میں رباعیوں کے علاوہ یہ دوبیت بھی خواجہ کے نام پر دیے ہیں ؎

سیل را نعرہ از آنست کہ از بحر جدا ست　　وانکہ با بحر در آمیختہ خاموش آمد

نکتہا دوش دلم گفت و شنید از لب یار　　کہ نہ ہرگز بزبان رفت نہ در گوش آمد

کتب خانہ بانکی پور کی فہرست میں اس دیوان کے متعلق یہ الفاظ ہیں:۔

"اس اعتقاد کے تسلیم کرنے کا کہ یہ دیوان مشہور و معروف خواجہ معین الدین چشتی سے علاقہ رکھتا ہے۔ ہمارے پاس صرف یہ ذریعہ ہے کہ تقی اوحدی عرفات میں اور والہ ریاض الشعرا میں اس دیوان میں بعض اشعار نقل کر کے ان کو حضرت خواجہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ لیکن نہ یہ دونوں مؤلف اور نہ کوئی اور مصنف صاف طور پر ذکر کرتا ہے کہ خواجہ کی یادگار کوئی دیوان بھی ہے"۔

اس طرح دیکھا جاتا ہے کہ بعض تذکرہ نویسوں نے بھی یہ دیوان خواجہ معین الدین چشتی کی طرف منسوب کر دیا ہے اور اب وہ عام طور پر انہی کے نام سے مانا جاتا ہے۔ لیکن ایک محقق اور منتقد کی نظر میں یہ شہادت اور بیانات اس دیوان کا تعلق خواجہ اجمیر سے وابستہ کرنے کے لیے کافی معلوم نہیں ہوتے۔ کیونکہ سب سے مقدم یہ سوال پیش آتا ہے کہ حضرت خواجہ کے عہد سے ان بزرگوں کے عہد تک جس کے درمیان پانچ صدیوں سے زیادہ کی مدت حائل ہے۔ یہ دیوان گنج مخفی کی طرح کہاں غائب رہا۔ اور خواجہ کے سوانح نگاروں کی نظروں سے کیونکر بچا

خواجہ معین الدین چشتی کے حالات اور کمالات ان کے زمانے سے لے کر

اب تک ہر عہد میں دنیا کی نظر میں رہے ہیں۔ تمام شائقین کے علاوہ اصحاب تصوّف کو ان کے واقعات و مقالات سے ہمیشہ خاص دلچسپی رہی ہے۔ پھر ایسی مشہور ترانہ آفتاب ہستی کا کلام اس عرصۂ دراز تک دنیا کی نگاہ سے کیونکر پوشیدہ رہا۔ آپ کے دیوان سے گزشتہ قرون کے مصنّفین کا بے خبر رہنا ایک دشوار امر معلوم ہوتا ہے۔ ہر عہد اور ہر دور میں خواجہ کے واقعات لکھے اور پڑھے گئے ہیں۔ لیکن ان تصنیفات میں خواجہ کے دیوان یا شاعری کا مطلق ذکر نہیں آتا۔ آپ کی تصنیف انیس الارواح موجود ہے جس میں آپ نے پیرو مرشد حضرت عثمان ہارونی کے ملفوظات جمع کیے ہیں۔

خود آپ کے ملفوظات حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی قدس سرہٗ نے دلیل العارفین کے نام سے شائع کیے ہیں۔ سیر العارفین ہیں جو نصیر الدین ہمایوں بادشاہ کے عہد میں تصنیف ہوئی ہے۔ آپ کے کافی حالات ملتے ہیں۔ ابوالقاسم فرشتہ نے مشائخ ہند کے احوال میں سب سے مقدم آپ کا ذکر کیا ہے۔ اور آپ کے متعلق تمام واقعات جمع کر دیے ہیں۔ علاوہ بریں اہلِ تصوّف کے تذکروں میں آپ کے حالات اکثر موجود ہیں۔ لیکن ان تمام کتابوں میں نہ صرف آپ کے دیوان بلکہ آپ کے ذوقِ شعر تک کا ذکر نہیں ملتا۔ بابو لال صاحب نے ہدایت المومنین کے ایک حصّے کا ترجمہ ۱۸۷۹ء میں شائع کیا۔ جس میں خواجہ صاحب کے مبسوط حالات ملتے ہیں۔

لیکن آپ کے دیوان سے یہ مصنف بھی اجنبی ہے۔

دیوان فی نفسہٖ اس سوال پر کچھ روشنی نہیں ڈالتا۔ اس میں کوئی ایسی شہادت یا تلمیح موجود نہیں جو اس کو خواجہ صاحب کی ذات سے انتساب دے۔ اگرچہ بعض شہادتیں اس انتساب کی تردید کے حق میں جیساکہ آیندہ معلوم ہوگا، موجود ہیں۔

دیوان ۹۱ صفحات پر ختم ہوجاتا ہے جس میں غزلیات کے سوا کوئی اور صنفِ نظم موجود نہیں۔ غزلوں کی تعداد ایک سو اکیس ہے۔ اور ابیات کا شمار گیارہ سَو بارہ سَو کے درمیان ہے۔ شاعر اپنا تخلص دو طرح سے لاتا ہے۔ یعنی معیّن اور معینؔی۔ متعدّد غزلیں حمد و نعت میں ہیں۔ کلام سرتا پا عشق و عرفان کے رنگ میں ڈوبا ہُوا ہے۔ اور عشق کا جذبہ بہت غالب ہے۔ رندی اور سرمستی کے مضامین خال خال موقعوں پر نظر آتے ہیں۔ خمریات کا جوش جبکہ عراقی اور حافظ کے ہاں بہت غالب ہے۔ یہاں بالکل دبا ہُوا ہے۔ شوخی مطلق نظر نہیں آتی۔ بلکہ متین اور سنجیدہ خیالات قدم قدم پر دامن گیر نظر آتے ہیں۔ مذہب سے عداوت نہیں ہے اور نہ شیخ و زاہد کا استخفاف منظور ہے۔ تجرید اور ترکِ تعلق شاعر کا اصل موضوع ہے۔ یہاں تک کہ بہشت و خلد جو زہاد کی غایت مقصود ہے۔ دام گاہ علائق بنادی گئی ہے۔ کلام میں متانت اور شیرینی نظرافروز ہے۔ خیالات میں

نزاکت اور خوش اسلوبی جو متاخرین کا دست مایۂ ناز ہے۔ غلبہ پائے ہوئے ہے۔ زبان میں کچھ اس قسم کی گھلاوٹ اور لطافت موجزن ہے جو خواجہ معین الدین کے ایام میں قطعی نامعلوم تھی۔ ناتمام بندشیں اور ترکیبیں متاخرین کے طرز کی پائی جاتی ہیں۔ ادائیگی خیالات کے لیے الفاظ کے بوقلموں پیرائے شاعر کے قبضہ میں ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غزل کی زبان اس عہد تک ترقی اور وسعت بدرجۂ کمال پا چکی تھی۔ مثلاً ہستی انسانی باوجود انسانی کا مقصد ادا کرنے کے لیے شاعر نے یہ ترکیبیں اختیار کی ہیں۔

زنگ تن، نقاب حدوث۔ پردۂ تن۔ دلق ہستی۔ زندان تن۔ لباس حدوث۔ پردۂ آب وگل۔ شبستان بدن۔ پردۂ خاک وغیرہ وغیرہ۔

کلام کا عام جوہر سادگی۔ سادہ بیانی اور سادہ خیالی ہے۔ تکلفات سے عام طور پر احتراز ہے۔ خیالات کی بوقلمونی اور تنوع غزل کا تمغائے امتیاز ہے لیکن اس دیوان میں بیرونی اور اجنبی خیالات بہت کم چھیڑے گئے ہیں۔ نفس مضمون پر توجہ مائل ہے۔ اس لیے اشعار میں ایک قسم کا تسلسل پایا جاتا ہے۔ حقائق و دقائق، تصوّف و ارادت سلوک، تجرید و توحید، فنا و بقا، نفی و اثبات، اشتیاق دیدار۔ بیان عشق وغیرہ کے اظہار پر شاعر کی تمام شاعری مبذول ہے۔ مضمون کی اس تنگی سے کلام میں ایک خفیف سی اُداسی کی جھلک نمودار ہے۔ جدت اور آمد اچھے خاصے پیمانے پر ہے۔ بعض ابیات ایسے صاف اور ہموار

نکل آئے ہیں کہ دل میں چٹکیاں لیتے ہیں۔ یہ ایک ایسے شخص کا کلام معلوم ہوتا ہے جو جذباتِ عشقِ الٰہی سے سرشار اور رسولِ عربی کا عاشقِ زار ہے۔ مسافرِ منازلِ طریقت ہے۔ لیکن شریعت کی روشنی میں، عشق ہے لیکن متانت کے ساتھ۔ دیوانگی میں بھی دانائی کی ادا موجود ہے۔ مسائلِ معرفت کے ساتھ فلسفہ، تصوّف کی اصطلاحات کو نہایت بے تکلفی اور خوش اسلوبی کے ساتھ برتا گیا ہے۔ جو عراقی اور حافظ کو بھی نصیب نہیں۔ ان دقائق نے کلام کو بعض وقت دقیق اور پیچیدہ کر دیا ہے۔

حکیم سنائی غزنوی کے ہاں زاہدی اور تصوّف میں کوئی امتیاز نہیں ہے۔ ان کا بیان تصوّف، پند و موعظت، اخلاق و حکم زہد و تقویٰ پر منحصر ہے عطار نے مثنوی کے علاوہ غزل کو خصوصیت کے ساتھ دقائق و نکات، معرفت و سلوک کی اشاعت کا میدان بنایا۔ عطار کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ جذبۂ عشق کیفیاتِ روحانی واردات حقیقت کی ترجمانی کے لیے اپنے ہمعصر شیخ محی الدین ابن عربی کی طرح مجاز کی زبان اختیار کی اور اس غرض سے مے و جام، پیمانہ و میخانہ، بت و مغ، ترسا بچہ و گبر، دیر، بیلذا، ناقوس، چلیپا، شاہد و شمع، زنار و خرابات وغیرہ وغیرہ کو خاص معنی دے کر غزل سے آشنا کر دیا۔ حقیقت و مجاز کے اتحاد نے غزل میں ایک خاص حلاوت و ملاحت پیدا کر کے اس کے خط و خال کو قصیدے سے بالکل ممیز کر دیا۔ حقیقت کا اظہار مجاز کے پیرایے میں فریدالدین عطار سے شروع ہوتا ہے۔ عطار کے تتبع میں مولانا روم نے اس زمین کو زیادہ وسعت دی۔ عراقی نے غزل کی شراب کو زیادہ تیز اور

سرجوش کر دیا۔ حافظؒ نے اس کے رنگ کو شوخ اور کیف کو زیادہ لطیف بنا دیا۔ اگرچہ غزل نے اس طرح خرابات کی آب و ہوا اور تصوّف و عرفان کے آغوش میں پرورش پائی اور حقیقت و مجاز کی دوعملی میں ہوش سنبھالا لیکن فلسفۂ تصوّف کا خلعت اس کو جامیؔ اور مغربیؔ عطا کرتے ہیں۔ یہی آخری رنگ اس دیوان میں عام ہے۔ خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔ دیوان میں مسئلہ ہمہ اوست پر بہت زور دیا گیا ہے۔ ذیل میں بعض مثالیں درج ہیں:-

کسیکہ عاشق و معشوق خویشتن ہمہ اوست — حریف خلوت و ساقی خویشتن ہمہ اوست
اگر تو خرقۂ ہستی خویش پارہ کنی — نظر کنی کہ دریں زیر پیراہن ہمہ اوست
مگو کہ کثرتِ اشیا نقیض وحدت گشت — تو در حقیقتِ اشیا نظر فگن ہمہ اوست
چو نائیے کہ نہد بر زبان نے لب خویش — نہادہ بر دہن عاشقاں دہن ہمہ اوست

چہ جائے بادہ و جام و کدام ساقی مست
خموش باش معینیؔ ودم مزن ہمہ اوست

دیگر

جمالِ یار میخواہی بذرات جہاں بنگر — کہ ہر ذرّہ است مرآتے کزو دیدار می تابد

دیگر

صفات و ذات چو از ہم جدا نمی بینم — بہر چہ می نگرم جز خدا نمی بینم

متعدد موقعوں پر شاعر نے اپنے آپ کو "مسکین معین" لکھا ہے۔ جس سے

واضح ہوتا ہے کہ شاعر مسکین کا لفظ اپنے تخلص یا نام کے ساتھ استعمال کرنے کا عادی تھا۔ اس قسم کی بعض امثال حوالۂ قلم ہیں ؎

درآبہ مجلس مسکیں معین شوریدہ کہ نقل و بادہ زگفت و شنید خود بینی

دیگر

مسکین معینؔ در یک غزل بنمود اسرار ازل بشنو کلام لم یزل در کسوت گفتار او

دیگر

چوں دل مسکیں معین آئینۂ تست اے کریم آئینۂ خود را صفائے دہ ز نور خویشتن

دیگر

گنگ شو مسکیں معینؔ ہم خود ثنائے خود مگو بہتر آں باشد کہ من گویم بدیں ساں حمد تو

دیگر

در مجلس مسکیں معینؔ یکدم نشیں صدرِ نجیں بنگر چہ درہائے ثمیں دادہ است دریائے دلم

دیوان کے تتبع سے اس قدر اور پایا جاتا ہے کہ شاعر اپنی زندگی میں واعظ ضرور رہا ہے۔ کیونکہ بعض مقطعوں میں اس نے ممبر، مجلس اور وعظ کی طرف کئی مقام پر تلمیح کی ہے۔ چنانچہ ذیل کی امثال شاہد ہیں ؎

بزم خاص است معینؔ بادۂ وحدت پیش آر ہاں کہ مستی تو بر مجلسیاں تافتہ است

دیگر

معینؔ برائے بہ منبر بگوئے نکتۂ عشق کہ بلبلِ چمنِ عشق در زمانہ توئی

دیگر

گرچہ شاہاں را بہ تخت و تاج زینت میدہند　　جلوۂ مسکیں معینؔ بر تاج و منبر کردہ اند

دیگر

معینیؔ گر ہمی خواہی کہ سرش بر زباں رانی　　مقام آں سر دار است بر منبر نمی گنجد

دیگر

بیا بوعظ معینیؔ رموز عشق شنو　　کہ از حکایت او بوئے دوست می آید

دیگر

معینؔ را در صغر آنکس بہ بمنبر در سخن آرد　　کہ در گہوارۂ طفلی قرین ابن مریم شد

دیگر

خلق گویندم معینؔ ایں رمز بر منبر بگوئے　　آہ کیں آتش ہزاراں واعظ و منبر بسوخت

ان اشعار سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ شاعر کا پیشہ وعظ گوئی تھا۔

گزشتہ مشاہدات کی روشنی میں اس دیوان کو خواجہ معین الدین چشتی کی طرف منسوب کرنا مستبعد معلوم ہوتا ہے۔ میں اپنے گزشتہ دلائل کو مختصراً یہاں پھر دُہراتا ہوں۔

(۱) تاریخ خواجہ صاحب کی شاعری اور ان کے دیوان سے ناواقف محض ہے۔

(۲) اس دیوان کی زبان خواجہ صاحب کے عہد کی زبان ہرگز نہیں بلکہ متاخرین

کی زبان معلوم ہوتی ہے۔

(۳) دیوان میں کوئی ایسی بات نہیں جس کی رُو سے اس کا تعلق خواجہ صاحب سے قائم کیا جائے۔

(۴) دیوان سے اس قدر ظاہر ہے کہ اس کا قائل کوئی واعظ ہے۔

چونکہ داخلی شہادت سے اس قدر مفہوم ہوتا ہے کہ وہ کسی واعظ کا کلام ہے۔ اس لیے ہمیں واعظین کے سلسلے میں اس کے مصنّف کی تلاش کرنی چاہیے۔ اس غرض سے میں مولانا معین الدین بن مولانا شرف الدین حاجی محمد الفراہی صاحبِ معارج النبوت اور مشہور واعظ کا نام پیش کرتا ہوں۔ مولانا اپنی تصنیفات میں اپنے آپ کو "مسکین معین" لکھنے کے عادی ہیں۔ آپ سلطان ابوالغازی حسین کے عہد کے زبردست فاضل ہیں اور مولانا جامؔی کے ہمعصر۔ آپ اپنے عہد کے مشہور واعظ اور صاحبِ تصنیفات کثیرہ ہیں۔ دنیاوی تعلقات سے اس قدر بیزار تھے کہ جب ۹۰۰ھ میں آپ کے بھائی مولانا نظام الدین قاضی ہرات نے اس عالم فانی سے رحلت کی تو آپ نے سلطان حسین کی استدعا اور اصرار پر بدقّت تمام اپنے بھائی کا منصب قبول کیا۔ اور ایک سال کے بعد ہی اس سے دست کش ہو گئے۔ آپ کا درجہ علم و فضل اور زہد و تورع میں نہایت ممتاز تھا۔ طبیعت میں بلندی اور دنیا کی طرف سے بے پروائی بسی ہوئی تھی۔ جامع مسجد ہرات میں ہر جمعہ کو وعظ فرمایا کرتے تھے۔ آپ کے وعظ

میں اثر، تقریر میں تاثیر اور بیان میں دل کشی تھی۔ ہزاروں مستمعین آپ کے وعظ سے بہرہ اندوز ہوتے تھے۔ ان مجالس تذکیر میں بڑے بڑے جلیل القدر امرا بھی شریک ہوتے تھے۔ اور مولانا ان کی وجاہت دنیاوی کی ذرا پروا نہ کرکے بر سر منبر ان کے افعال قبیحہ پر سرزنش کرتے تھے۔ وہ سنتے تھے اور اُف نہیں کرتے تھے۔ سچ کہا ہے "حق کا مرتبہ دولت اور حکومت سے بالا ہے"۔

تاریخ حبیب السیر میں مولانا معین الدین کے حالات میں (صفحہ ۲۳۰ جلد سوم جزو سوم) میں یہ عبارت ملتی ہے:۔

"مولانا معین الدین الفراہی برادر ارشد قاضی نظام الدین بود بسیارے از فضائل وکمالات اظہار وقوف می نمود۔ در زہد وتقویٰ درجۂ علیا داشت واکثر خطوط را در غایت جودت بر صحیفۂ تحریر می نگاشت در ایام جمعہ بعد از نماز در مقصورۂ مسجد جامع ہرات وعظ در کمال تاثیر می گفت و دُرَرِ غُرَرِ معانی آیات واحادیث را بہ الماس طبع لطیف می سفت با عاظم امرا ونوئینان کہ در مجلس وعظ مے نشستند ملتفت نمے گشت ودر وقت نصیحت آں طائفہ سخنان درشت بر زبانش میگزشت وآں جناب بعد از فوت برادر بموجب تکلیف خاقان والا گہر مدت یک سال صاحب قضا بود آنگاہ ترک آں امر دادہ ہرچند دیگر مبالغہ نمودند قبول نفرمود واز آثار قلم

لطافت نگار مولانا معین الدین، معارج النبوت، درمیان مردم مشہور است و اکثر وقائع و حالات سیّد کائنات علیہ افضل الصلوٰۃ و اکمل التحیات بروایات مختلفہ دراں مسطور و مولانا معین الدین در شہور سبع و تسعمایۃ مریض شدہ در گزشت و در مزار مقرب حضرت باری خواجہ عبداللہ انصاری پہلوئے برادر خود قاضی نظام الدین مدفون گشت"۔

مولانا معین الدین نے چالیس سال کامل وعظ و تذکیر میں صرف کیے ہیں۔ وعظ سے جو وقت بچتا تھا تصنیف و تالیف میں بسر ہوتا تھا۔ آپ نے فنِ تذکیر کو برخلاف ہمارے علمارِ عہد کے رویّہ کے حتی الوسع دلچسپ اور شگفتہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ آپ کے مواعظ اور تصنیفات مذاقِ شعر سے پُر ہیں۔ ان میں عشق و تصوّف کا رنگ نہایت شوخ ہے۔ شعر میں آپ کا پایہ بہت بلند ہے۔ طبیعت میں زود گوئی بہت معلوم ہوتی ہے۔ آپ کا رتبہ شعرائے متصوّفین میں عراقی اور مغربی کے مساوی مانا جائے تو مبالغہ نہیں کہا جا سکتا۔ شعر کا مذاق فن تذکیر کی طرح خاندانی ہے۔ آپ کے والد مولانا شرف الدین حاجی محمد جو مرزا ابوالقاسم بابر کے عہد کے مشاہیر فقہا میں شمار ہوتے تھے۔ خود بھی شاعر تھے۔ میں تبرکاً اُن کے چند اشعار یہاں درج کرتا ہوں ؎

نقاشِ تصرفِ فطرت بے صورت و ہیولیٰ　　　بر صدر لوح حکمت نقشے کشید زیبا

شہباز جاں نشستہ بر قبۂ معانی — عنقائے عقل جستہ بر قاف قرب ماوی
برداشت قبضۂ گل بنگاشت پیکرِ دل — از نور او ست حاصل خورشید اوج اعلیٰ

مجموعۂ عجائب ، اعجوبۂ غرائب
پاک از ہمہ شوائب از جسم و جاں معرّیٰ

مولانا معین الدین تصانیفِ کثیرہ کے مالک ہیں۔ ان کی کتابیں اور رسالے بے شمار ہیں۔ لیکن جو مجھے معلوم ہو سکیں ذیل میں درج ہیں :-

(۱) تفسیر بحر الدُرر ۔

(۲) تفسیر حدائق الحقائق فی کشف اسرار الدقائق ۔

(۳) واضحہ فی اسرار الفاتحہ ۔ سورۂ فاتحہ کی تفسیر ہے ۔

(۴) معارج النبوۃ فی مدارج الفُتوت ۔ یہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کی مفصّل سوانح عمری ہے۔ جس میں آپؐ کے اجداد امجاد یعنی ساتوں انبیاء اعظم کے بھی حالات درج ہیں۔ ۸۹۱ھ میں اس کتاب کی ابتدا ہوئی اور کئی جلدوں میں لکھی گئی ۔ اس میں ایک مقدمہ چار رکن اور ایک خاتمہ ہے۔ کتاب کو جا بجا اقوال، آیات، نکات اور اشعار سے دلچسپ بنانے کی کوشش کی گئی ہے ۔ شعراء میں سنائی ، عطار ، مولانا روم ، اوحدی ، عراقی اور مولانا جامی کے ابیات موقع بہ موقع استعمال کیے ہیں ۔ اس کے سوا شاعر نے اپنے اشعار بھی کثرت کے ساتھ نقل کیے ہیں ۔

(۵) روضۃ الواعظین فی احادیث سید المرسلین چار جلدوں میں ہے۔

(۶) تفسیر سورۂ یوسف علیہ السلام۔

(۷) اعجاز موسوی۔ یہ وہی کتاب ہے جس کو مخزن الغرائب میں معجزات موسوی لکھا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات میں ایک مبسوط تصنیف ہے جو مطبع عمدۃ المطابع میں ۱۲۷۲ھ میں چھپ بھی چکی ہے۔

ان کے علاوہ اور رسالے اور کتابیں کثرت سے ہیں جو مولانا معین الدین کے قلم سے نکلی ہیں۔ جن کی میں سراغ رسانی نہیں کر سکا۔ نظم میں آپ نے بہت کچھ لکھا ہے۔ آپ کا کلام از قسم رباعی و غزل و مثنوی کثرت سے ملتا ہے۔ ایک رسالہ مثنوی میں بھی آپ نے لکھا ہے۔

میرا ایسا خیال ہے کہ اکبری عہد کے مورخین کو مولانا کے متعلق صحیح معلومات تھیں۔ لیکن بعد کے تذکرہ نگاروں نے ان کے حالات سے بہت کم اعتنا کی ہے مجھے صرف ایک مختصر بیان مولانا کے متعلق تذکرۂ مخزن الغرائب میں ملا ہے۔ جس نے میرے تمام شکوک کو یقین کے درجے تک پہنچا دیا۔

مجھے نہایت رنج اور افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ نایاب اور ضخیم تذکرہ اب تک طبع نہیں ہوا ہے۔ مولانا معین الدین کے حالات صاحب تذکرہ کو تین مختلف ذرائع سے ملتے ہیں۔ چونکہ وہ نہایت ہی ناکافی اور غیر معین تھے۔ اس لیے نتیجہ یہ ہوا کہ مخزن الغرائب میں مولانا کی ذات واحد اقانیم ثلٰثہ میں تبدیل

کر لی گئی - اور ایک معین کے تین معین بن گئے - اس تذکرے میں سب سے مقدم

(۱) مولانا معین الدین ہروی ہیں - جن کے واسطے مصنف تذکرہ کے

الفاظ ہیں

"مولانا معین الدین ہروی فاضل تحریر و دانشمند کامل بودہ -

کتاب مدارج النبوۃ و معجزات موسوی (اعجاز موسوی) و تفسیر قرآن

از دور عالم مشہور است و در تفسیر آں قدر نکات و عجائبات بیان کردہ

کہ در ہیچ تفسیر دیدہ نہ شد در نظم و نثر کمال مہارت داشتہ علی الخصوص در

انشائے محمد (کذا) ایں چند بیت از ذہن مستقیم اوست ؎

چو من زیادۂ شوق تو مست و بیخبرم ہمہ جمال تو بینم بہر چہ مے نگرم

تو ہر حجاب کہ خواہی فرو گزار کہ من بہ نعرۂ کہ زنم صد حجاب را بدرم"

یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ غزل جس کا مطلع اور ایک شعر مخزن الغرائب

میں درج ہے - موجودہ دیوان (طبع نولکشور ۱۲۸۸ھ) میں صفحہ ۵۶ پر پائی جاتی ہے -

جس کے کل سات شعر ہیں - یہی غزل مولانا کی تصنیف معارج النبوۃ (مقدمہ فصل

اوّل، تمہید الاوّل) میں پوری کی پوری درج ہے - اس طرح موجودہ دیوان کو

مولانا معین الدین کی طرف منسوب کرنے کے لیے ہمیں یہ پہلا یقینی سراغ ملتا

ہے - دوسرے

(۲) معین فراہی ہیں - جن کے لیے منقول ہے :-

"معین فراہی راست ؎

مگر فصلِ بہار آمد کہ عالم سبز و خرم شد

مگر وصلِ نگار آمد کہ دل با عیش ہمدم شد"

دیوان میں رجوع کرنے سے علم ہوتا ہے کہ یہ پندرہ شعر کی غزل ہے اور صفحات ۲۲ و ۲۳ پر ملتی ہے۔ اس غزل کے آٹھ شعر مع مطلع بالا کتاب معارج النبوۃ (رکن اوّل باب ہفتم، فصل چہارم) میں ملتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ معین فراہی اور مولانا معین الدین ہروی ایک ہی شخص ہیں۔ نیز یہ کہ موجودہ دیوان کے بھی یہی مالک ہیں۔ تیسرے

(۳) مُلا معینی ہیں۔ ان کے متعلق مخزن الغرائب میں تحریر ہے :-

"مُلا معینی در زمان اکبر پادشاہ بودہ است ؎

اگر از خواب غفلت سر برآری آں زماں بینی

کہ خورشید تجلّی بر درو دیوار مے تابد"

دیوان میں یہ غزل ص ۳۵ پر ملتی ہے۔ جس کے چودہ بیت ہیں۔ اس غزل میں شعر بالا بھی موجود ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ قافیہ میں "درو دیوارِ دل بیدار" ہے۔ اس غزل کا مطلع ہے ؎

چنان از روزنِ دل نورِ آں دلدار می تابد

کہ خورشیدِ جمالش از درو دیوار مے تابد

یہ مطلع کتاب معارج النبوۃ (رکن دوم، باب سوم، فصل سوم، صفحہ ۶۷، طبع نولکشور) میں بھی ملتا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ملا معینی اور مولانا معین الدین ایک ہی ہستی ہیں۔ مولانا جیسا کہ دیوان اور ان کی دیگر تصانیف سے معلوم ہوتا ہے اپنا تخلص دونوں طرح لاتے ہیں۔ اس غلط خیال کی کہ وہ اکبر کے عہد میں تھے۔ تردید کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی، اس لیے کہ اس کے متعلق صحیح اطلاع گزشتہ صفحات میں دی جا چکی ہے۔

ذیل میں تذکرۂ حسینی اور تذکرۂ روز روشن کے انتخابیہ اشعار جو خواجہ معین الدین چشتیؒ کی طرف منسوب کیے گئے ہیں مطالعہ کرتا ہوں۔

زپیش خویش برافگن نقاب دعوی را | بہ بیں بدیدۂ صورت جمال معنی را
بحق او کہ بکونین دیدہ نکشایم | کہ تا نخست نہ بینم جمال مولا را
اگر در آتشِ عشقت بسوختم چہ عجب | کہ کوہ تاب نیاورد یک تجلّیٰ را

معینؔ بچشمِ خرد حسن دوست نتماند
بہ بیں بدیدۂ مجنوں جمال لیلیٰ را

دیوان میں اس غزل کے سات شعر ہیں اور ص۵ پر ملتی ہے۔ لیکن اس غزل کا دوسرا شعر یعنی "بحقِ او کہ بکونین" الخ کتاب معارج النبوۃ رکن اول، باب سوم، فصل دوم، لطیفہ رابع عشرہ کے تحت میں مندرج ہے۔ اور دوسرا شعر کتاب اعجاز موسوی (صفحہ ۲۲۹ عمدۃ المطابع ۱۲۷۲ھ) میں ملتا ہے اور ظن غالب یہی ہے

کہ یہ غزل مولانا معین الدین کی ہے۔

تذکرہ روزِ روشن از مظفر حسین صبا، صفحہ ۶۳۸ - ۶۴۰ طبع ۱۲۱۶ھ

اس تذکرہ میں خواجہ معین الدین چشتی کے دیوان سے جو اشعار انتخاب ہوئے اُن میں ایک شعر یہ ہے ؎

ایں چہ نور است کہ بر کون و مکاں تافتہ است
نورِ عشق است کہ از مطلعِ جاں تافتہ است

دیوان میں یہ نو اشعار کی غزل ہے اور صفحہ ۹ پر ملتی ہے۔ کتاب معارج النبوۃ (مقدمہ، فصل اوّل، تحمید عاشر) میں اس غزل کے سات اشعار مع مطلع درج ہیں اور سب سے اہم یہ امر ہے کہ مصنف نے غزل کی ابتدا میں دعویٰ کیا ہے کہ یہ میری غزل ہے۔ چنانچہ اس کے الفاظ ہیں:-

"للعبد الضعیف نور اللہ قلبہ"

یہ غزل ہمیں مصنف کی اپنی شہادت پر معارج النبوہ کے مصنف مولانا معین کی طرف منسوب کرنا چاہیے نہ خواجہ معین الدین چشتی کی طرف۔

درونِ قصرِ دل دارم یکے شاہے کہ گہ گاہے
ز دل بیروں زند خیمہ بہ بحر و بر نمے گنجد

دیوان میں اس غزل کے گیارہ شعر ہیں اور ص ۲۵ پر ملتی ہے اور مطلع ہے ؎

مرا در دل بغیر از دوست چیزے در نمی گنجد
بخلوت خانۂ سلطاں کسے دیگر نمی گنجد

معارج النبوت (رکن اوّل، باب ہفتم، فصل سیزدہم، لطیفۃ الثانیہ) میں اسی غزل کے چار شعر مصنّف نے لکھے ہیں۔ جن میں شعر بالا بھی موجود ہے۔

راہ بکشائے کہ دل میل بہ بالا دارد
پردہ برگیر کہ جاں عزم تماشا دارد

دیوان میں صفحہ ۲۹ پر یہ غزل ملتی ہے۔ جس کے نو شعر ہیں۔ معارج النبوت (مقدمہ، فصل سوم) (النعت التاسع) کے خاتمہ پر کامل غزل مرقوم ہے۔

اندر آئینۂ جاں عکس جمالے دیدم
ہمچو خورشید کہ در آب زلالے دیدم

دیوان میں صفحہ ۸۴ پر یہ غزل ہے جس میں کُلّھم نو شعر ہیں۔ اسی غزل کے نو شعر مع مطلع معارج النبوت رکن اوّل، باب ہفتم، فصل یازدہم، لطیفۂ خامسہ کے اختتام پر موجود ہیں۔

صفات و ذات چو از ہم جدائے بینم
بہر چہ می نگرم جز خدائے بینم

یہ آٹھ ابیات کی غزل ہے اور دیوان میں صد ۵۲ پر ملتی ہے۔ معارج النبوت میں رکن سوم، باب چہارم، فصل بست و چہارم، صد ۲۱۹ (نولکشور) پر اس غزل کے چھ شعر مع مطلع و مقطع مرقوم ہیں۔

مَیں بخوفِ طوالت مضمون، روز روشن کا مطالعہ ختم کرتے ہوئے گزارش کرتا ہوں کہ اس تذکرے کے اشعار کا مولانا معین الدین کی تصانیف میں پایا جانا دلیل ہے۔ اس دعوے کی کہ یہ اشعار مولانا معین الدین کے ہیں نہ خواجہ معین الدین رح کے۔

اب مَیں صرف اُن اشعار کا ذکر کروں گا جو دیوان اور معارج النبوت میں عام ہیں۔ اور ان میں سے بھی، وہی اشعار لوں گا جن کے مصنّف ہونے کا مولانا معین کو دعوےٰ ہے ؎

چشم بکشائے کہ آفاق پر از نور خداست
خالی از نور خدا در ہمہ آفاق کجاست

دیوان میں صفحہ ، پر یہ غزل ہے اور سات شعر کی ہے۔ اسی غزل کے تین شعر معارج النبوت میں مقدمہ فصل اوّل، تحمید السابع میں پائے جاتے ہیں۔ مصنّف اُن کی ابتدا میں لکھتا ہے۔ "لعبد الضعیف"۔

آتشے افروخت عشق و جسم و جانِ من بسوخت
گفتم آہے بر کشم کام و زبانِ من بسوخت

اس غزل کے گیارہ ابیات ہیں اور دیوان میں صفحات ۱۱، ۱۲ پر ملتی ہے۔
اس غزل کے نو شعر مع مطلع کے معارج النبوت میں مقدمہ، فصل اوّل، تجمید العاشر کے خاتمہ پر موجود ہیں۔ ان کے واسطے مصنّف لکھتا ہے۔ "لمؤلفہ غفر اللہ لہ"۔
یہی غزل اس تصنیف کے رکنِ اوّل، باب ہفتم، فصل ہشتم کے اختتام پر پھر پائی جاتی ہے۔ جس میں آٹھ شعر ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزل مصنّف کو بہت مرغوب تھی۔ کیونکہ وہ اس کی دوسری تصنیف اعجاز موسوی میں پھر دہرائی گئی ہے۔ جہاں صفحہ ۹۷-۹۸ پر ملتی ہے اور مصنّف ابتدا میں لکھتا ہے "چنانچہ فقیر گوید"۔ اسی غزل کے چھ بیت اسی اعجاز موسوی میں صفحہ ۴۶ پر پھر پائے جاتے ہیں۔ جن کے لیے دعویٰ کیا ہے۔ "ابیات لمؤلفہ"۔

آتشے آمد پدید و جسم و جاں یکسر بسوخت
دل درون سینہ ام چوں عود در مجمر بسوخت

اس غزل کے سات شعر ہیں اور دیوان میں صفحہ ۱۲-۱۳ پر ملتی ہے۔ اعجاز موسوی میں پوری غزل صفحہ ۹۲ پر موجود ہے اور مصنّف کا اس کے لیے دعویٰ ہے۔ "لمؤلفہ فی ہذا المعنی"۔

کسیکہ عاشق و معشوق خویشتن ہمہ اوست
حریف خلوت و ساقی انجمن ہمہ اوست

یہ گیارہ شعر کی غزل ہے اور دیوان میں صـ۱۳ پر نظر آتی ہے۔ معارج النبوت میں مقدمہ، فصل اوّل، تحمید الثامن کے آخر میں تمام غزل مرقوم ہے اور "لمؤلفہ" مصنف کا دعویٰ ہے۔

یارب ایں صورت، کہ در مرآت جاں پیداست کیست
آنچناں حسنے دریں پردہ نہاں پیداست کیست

دیوان میں صـ۱۲ پر سات شعر کی یہ ایک غزل ہے۔ اعجاز موسوی میں یہی غزل صفحہ ۲۵۹ پر موجود ہے۔ اس کے ابتدا میں صاحب کتاب "لمؤلفہ" کہہ کر اپنی غزل مانتا ہے۔

حمدیکہ ہمچو بحر کرم بیکراں بود
حمدیکہ شکر نعمت ہر دو جہاں بود

دیوان میں صفحات ۱۶-۱۹ پر یہ حمدیہ قصیدہ ملتا ہے جس میں ایک کم پچاس اشعار ہیں۔

یہ تمام قصیدہ معارج النبوت، مقدمہ، فصل اوّل، تحمید الثانی عشر میں پورا

موجود ہے۔ اس کی ابتدا میں صاحب معارج کے الفاظ ہیں۔ "قال مؤلف الکتاب ختم اللہ آمالہ بالرشد والصواب"۔

اسی قصیدے کے چند اشعار اعجاز موسوی کے صفحہ ۵۸ پر نظر آتے ہیں۔ اور ان کی ابتدا میں مصنف کا دعویٰ ہے۔ "چنانچہ فقیر گوید"۔

چشم بکشائے کہ دیدار خدا جلوہ نمود
دیدہ شو یکسر و بر بند در گفت و شنود

یہ چودہ شعروں کی غزل صفحہ ۲۳ پر دیوان میں ملتی ہے۔ فصل پنجم، باب دوم، رکن اوّل، معارج النبوت میں اس غزل کے چار شعر ہیں جن کے واسطے مصنف کہتا ہے۔ "چنانچہ معینؔ دیوانہ تو گوید"۔ اسی غزل کے بارہ شعر مع مطلع و مقطع اسی کتاب کی تمہید الخامس فصل اوّل مقدمہ میں مرقوم ہیں۔

وقت آنست کہ دل واقفِ اسرار شود
جائے آنست کہ جاں طالبِ دیدار شود

دیوان میں صفحہ ۲۷ پر یہ غزل ہے۔ اس میں ۲۱۔ ابیات ہیں۔ اس غزل کے سات شعر معارج النبوۃ، رکن اوّل، باب دوم، فصل پنجم میں آتے ہیں۔ ابتدا میں مؤلف گویا ہے۔ "چنانچہ معینؔ دیوانہ تو گوید" اسی غزل کے پانچ شعر مع مطلع

معارج النبوت (مطبوعہ) میں رکن سوم، باب چہارم، فصل بست و چہارم، در لطائف و اشارات صفحہ ۲۱۹ پر پائے جاتے ہیں اور حسب معمول شاعر ابتدا میں کہتا ہے۔ "چنانچہ فقیر تو گوید"۔

نغمۂ عشق کزاں سوئے جہاں مے آید

بمشام دلم از عالمِ جاں مے آید

یہ صفحہ ۳۴-۳۵ پر دیوان میں سترہ ابیات کی غزل ہے۔ اسی غزل کے چھ بیت مع مطلع، فصل پنجم، باب دوم، رکن اوّل معارج النبوت میں نظر آتے ہیں۔ ان کے لیے مصنّف گویا ہے۔ "چنانچہ فقیر گوید مولوی معینؔ"۔

اگر بے پردہ نتوانی کہ بینی پرتوِ ذاتش

بذراتِ جہاں بنگر کہ ہر ذرّہ است مرآتش

یہ دیوان میں صفحہ ۳۴ پر سات بیتوں کی غزل ہے۔ معارج النبوت، رکن اوّل۔ باب دوم، فصل پنجم میں اس کے دو شعر ملتے ہیں۔ اور یہی اشعار مقدمہ فصل دوم۔ مناجات الثالثہ معارج النبوت میں بھی نظر آتے ہیں۔ یہاں شاعر کہتا ہے۔ "لمؤلفہ"۔

نظر سے گزرے ہیں۔ باقی رکن چہارم اور خاتمہ مجھے دستیاب نہیں ہوئے۔ ممدوح کثیر التعداد تصنیفات کے مالک ہیں۔ اگر ان تالیفات میں پوری کوشش سے باقاعدہ تلاش کی گئی تو مجھے یقین واثق ہے کہ نہ صرف موجودہ دیوان کی ہر ایک غزل کا اس میں پتہ لگ جائے گا۔ بلکہ اس کے علاوہ اور سینکڑوں نئی غزلیں ہاتھ آئیں گی۔ جو دیوان کے حجم کو المضاعف کر دیں گی ؛

فارسی شاعری اور اُس کی قدامت

ایک مدت سے فارسی شاعری اور اس کی قدامت کا مسئلہ معرضِ بحث میں ہے اور اہل الرائے ہمیشہ اس کے متعلق مختلف اور متبائن آرا پیش کرتے رہے ہیں۔ بعض اس کی قدامت کے قائل ہیں اور اغلباً یہی دبستان ہمارے مذہب منصور کا حکم رکھتا ہے۔ مستشرقین مغرب میں صرف چند ذی علم ایسے ہیں جو اس کی قدامت کے قائل نہیں۔ ورنہ اکثر علما نے زیادہ تر آریا پرستی کے اثرات میں اس کی قدامت کی روایات ہی کو تسلیم کیا ہے۔ اس قضیہ کے متعلق مشرق و مغرب میں اس قدر ذخیرہ جمع ہو گیا ہے کہ ایک مستقل تصنیف آسانی کے ساتھ تیار کی جا سکتی ہے۔ لیکن مضمون ہذا کی محدود گنجائش میں اس ذخیرہ پر صرف اجمالی نظر ممکن ہے۔ مغربی مستشرقین اپنی تحقیقات کو اَدِستا کے عہد تک پہنچا چکے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ خود اَدِستا میں نظم جس کو شعر ہجائی کہنا مناسب ہو گا

موجود ہے۔ لیکن میرے خیال میں اوستا کے عہد کو فارسی شاعری سے بالواسطہ کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے میں اس قسم کی تحقیقات کو پس پشت ڈال کر صرف اسی مواد سے بحث کروں گا جس کا براہِ راست فارسی سے تعلق ہے۔ سب سے مقدم وہ آرار ذکر کی جاتی ہیں جو فارسی شاعری کے قدامت کی قائل ہیں۔

ابوطاہر خاتونی کی روایت سے دولت شاہ لکھتا ہے کہ عضدالدولہ بو یہ کے عہد میں قصرِ شیریں واقع خانقین پر فارسی قدیم میں یہ شعر لکھا ہوا تھا ؎

ہز برا بگیہاں انوشہ بدی
جہاں را بدیدار توشہ بدی

اس شعر کے استدلال پر دولت شاہ نتیجہ نکالتا ہے کہ ساسانی عہد میں فارسی شاعری کا پتا چلتا ہے اور اضافہ کرتا ہے۔ "لیکن جب سلطنت اکاسرہ اعراب کے قبضہ میں آگئی۔ چونکہ یہ قوم صرف دین اور شریعتِ محمدی کی اشاعت میں ساعی تھی اور عجمی رسوم اور طریقوں کو محو کر رہی تھی۔ اس لیے ممکن ہے کہ انھوں نے شعر کہنے کی بھی ممانعت کر دی ہو"۔ اور اپنی حجت کو زیادہ سنگین اور مضبوط کرنے کے لیے کتاب 'وامق و عذرا' کا حوالہ دیتا ہے اور لکھتا ہے کہ:۔

"جب امیر عبداللہ بن طاہر۔ ۔ ۔ ۔ امیر خراسان تھا۔ نیشاپور میں ایک شخص اس کے پاس ایک کتاب لایا۔ امیر نے دریافت کیا۔ کیا ہے؟ اس شخص نے جواب میں کہا۔ یہ وامق و عذرا کا قصہ ہے اور امیر کی

خدمت میں بطور تحفہ کے لایا ہوں ۔ یہ کتاب نوشیرواں کے حکم سے لکھی گئی تھی ۔ امیر عبداللہ نے جواب دیا کہ ہم قرآن خواں قوم ہیں ہمیں اس قسم کی کتابوں کی ضرورت نہیں ہے ۔ اور چونکہ یہ کتاب مجوسیوں کی تصنیف ہے اس لیے ہمارے نزدیک مردود ہے چنانچہ اسی وقت حکم دیا کہ کتاب دریا برد کر دی جائے اور عام منادی کرادی کہ جہاں کہیں عجمی کتابیں دستیاب ہوں جلادی جائیں ۔ اس قسم کے احکام کا نتیجہ یہ نکلا کہ آل ساسان کے عہد تک ایران میں شاعری کا چرچا نہیں ہوا ۔"

محمد صالح کنبوہ اپنی تصنیف 'بہار سخن' میں نہ صرف قدامتِ شعر بلکہ فنِ شعر اور تمام اقسام نظم کے وجود کے قائل ہیں ۔ صاحب بہارِ سخن کی رائے چونکہ عام طور پر معلوم نہیں ہے ۔ اس لیے میں بجنسہٖ انھیں کے الفاظ میں حوالۂ قلم کرتا ہوں :-

" در زمانِ پیشیں پارسی دانان سخن سنج را از ہر مصرعہ و بیت و قصیدہ و رباعی و قطعہ و مثنوی و اقسام دیگر نامہا بودہ بپارسی و ہمچنیں بحر و وزن و قافیہ و ردیف را القاب جداگانہ بودہ بہ عبارت دری چوں نامہائے ایشاں مندرس شد اسامی و القاب نیز اندراس یافت علی الخصوص در زمانِ خلفائے عباس کہ اسلامیان بر عجم استیلا یافتند

چوں بزبان پارسی آشنا بودند، عجمیاں را بکفر منسوب می داشتند کتابہائے ایں طائفہ راچہ نظم ونثر لختے درآب انداختند و پارۂ را بہ سوختند وازیں رہ گزر سخنانِ آبدار گلوسوز پاستان درآب و آتش افتاد۔ چوں درعہد آل طاہر بعضے از اہل طبع خواستند کہ بزبان پارسی شعر گویند و قدرت بر ایجاد قوانین و اختراع اسامی والقاب شعر و ماتیعلق بہا نداشتند ونامہائے پاستانی کہ پیشنیاں دریں فن نگاشتہ بودند درمیاں نماندہ وآئین شعر پارسی گفتن نیز برافتادہ وہیچ یکے را آں اسامی والقاب برخاطر نہ بود۔ ناچار اسامی والقاب کہ شعرائے عرب قرار دادہ بودند استعمال نمودند واکنوں بآں معروف است"۔

مؤلف مجمع الفصحاء کا قول ہے :۔

"ظاہر است کہ اشعار قدیم شعرائے عجم بہ سبب غلبۂ عرب ازمیاں رفتہ چناں کہ مشہور است کہ تمام کتب وتواریخ عجمیاں را عرب سوختند ..... از کتب قدیم چیزے برجا نہ گزاشتند الا قلیلے کہ پنہاں داشتند چوں مردم راقدغن بلیغ نمودند قاعدۂ سخن فارسی وشعر متروک شد"۔

یہی مصنف اپنی ایک اور تصنیف فرہنگ آرائے ناصری میں ایک سمرادی حکیم کے ذکر میں جس کا ظہور ضحاک کے عہد اساطیری میں بتایا جاتا ہے ۔ یوں

لکھتا ہے :۔

"ازاں جملہ یکے فرابرج نام داشت واز روسائے سمرادیان بودہ وشعر فارسی نیز می گفتہ ایں دوبیت ہنوز از اشعار او درایں سرائے پاستانی باقی ماندہ است کہ گفتہ ؎

"جہاں دانی ہمہ سمراد باشد   ترا گر فرّ یزداں داد باشد
زسمراوست گفتن نام سمراد   ہماں سمراد ہم سمراد باشد"

خان آرزو نے بحوالہ دبستان المذاہب نقل کیا ہے کہ آبادیوں کے دور میں ایک بادشاہ تھا فرہوش نام، اس کے عہد میں سخن پیوند یعنی شعرا بے قیاس تھے ان میں سے سات شاعر ایسے تھے کہ ہفتہ میں ایک ایک روز اس کے سامنے اشعار گزرانتے تھے۔ چنانچہ یک شنبہ کے دن جب بادشاہ پرستش سے فارغ ہو کر گھر آیا شیدوس شاعر اس کے ہمراہ آیا۔ بادشاہ کے سامنے اس روز خشکہ اور اُڑد کی مقشر دال کھانے پر آئی۔ بادشاہ نے شیدوس کی طرف اس غرض سے دیکھا کہ دال کی تعریف میں کچھ کہے۔ شاعر نے ایک شعر پڑھا۔ جس کا مطلب کچھ اس قسم کا تھا کہ دال کفارہ گناہ کے لیے برہنہ ہو گئی ہے۔ بادشاہ بہت خوش ہوا اور شاعر کا منہ جواہرات سے بھر دیا۔ بادشاہ کی ملکہ جس کا نام شکر تھا شاعر کی اس شیوہ زبانی پر عاشق ہو گئی اور رات کو شاعر کے گھر پہنچ کر طالب وصل ہوئی۔ شیدوس نے انکار کیا اور کہا کہ عورت کسی سے نہیں ڈرتی اس سے ڈرنا چاہیے۔

تو فرہوش جیسے بادشاہ ذی جاہ کو چھوڑ کر اس کے ادنیٰ ملازم کی شیدائی ہوئی ہے۔
قصّہ مختصر ملکہ مایوس ہو کر اپنے گھر لوٹی۔ صبح کے وقت دربار میں بادشاہ نے جو پوشیدہ ملکہ شکر کے پیچھے پیچھے جا کر اس کی اور شاعر کی تمام گفتگو سن آیا تھا، شبدیس سے ماجرائے شب دریافت کیا۔ شاعر نے جواب میں یہ شعر پڑھا ؎

زن شاہست در داور گرد ا   گوز گرد ندارد بیم از کس

بادشاہ یہ شعر سن کر پھڑک اٹھا اور انعام میں ملکہ شکر کو اس کے حوالے کر دیا۔
محمد صالح اور رضا قلی خاں کے پیرو شمس العلماء محمد حسین آزاد مرحوم تھے۔
مرحوم سخندان پارس میں لکھتے ہیں :۔

"میرا قیاس یہ کہتا تھا کہ جس طرح ہر ولایت میں اپنی اپنی طبیعت کے بموجب نظم اور نظم کی خوبی ہے اسی طرح فارس بھی اس فن سے بے بہرہ نہ ہوگا۔ انقلابِ زمانہ نے جس طرح اس کے علوم و فنون کو فنا اور کتابوں کو برباد کیا نظم کی لڑیاں بھی توڑ ڈالیں اور دیوان درہم برہم کر دئے۔ پھر بھی خوشحالی یا بدحالی میں قوم قائم تھی۔ ٹوٹے پھوٹے شعر گیتوں کی آواز، شادی کے سہاگ یا بچوں کی لوریوں میں مدت تک زبان بزبان چلے آئے ہوں گے"

آزاد مرحوم وہ اصطلاحات شاعری بھی بیان کرتے ہیں جن کا فارسی قدیم میں رواج تھا۔ وہ حسب ذیل ہیں :۔

نظم = پیوستہ　　　نثر = پراگندہ　　　شعر = سردارہ

دم = وزن شعر　　　چامہ = غزل　　　جگامہ = قصیدہ

سردارہ = قافیہ　　　پساوند = ردیف　　　داغ = تخلص

اور فرماتے ہیں کہ یہ ظاہر ہے کہ ہر قوم کی زبان میں پہلے اشیا اور کام ہوتے ہیں۔ پھر ان کے لیے لفظ یعنی اسمار، اور افعال ہوتے ہیں۔ مگر عہد پاستانی میں اہلِ فارس کو شعر کہنا نہ آتا تھا تو الفاظ مذکور کیوں تھے؟"

میرزا عباس خاں آشتیانی معروف بہ اقبال پروفیسر دار الفنون طہران کا بیان ہے کہ :-

"شعر در دورۂ ساسانیاں وجود داشتہ و بالنسبہ دائرہ آں ہم وسیع بودہ ولے از حیثیت وزن و سبک با اشعار امروزہ فرق داشتہ چیزے کہ ہست حملۂ عرب اثرے ازاں باقی نگزاردہ و اشعار آں دورہ را مانند آثار دیگر محو و نابود ساخت۔"

" از نکاتیکہ باعث انکار وجود شعر در عصر ساسانی شدہ و منکرین را جسور نمودہ باقی نماندن اسم شعرائے آں دورہ است۔ مدعیان گویند اگر شعر در دورۂ ساسانی وجود داشت البتہ نام یکے دو نفر از شعرائے عصر مزبور بجامی ماند۔ چنانچہ یک دو سہ نفر از حکما و اطبا چند نفر از موسیقی و آنہا دلیل وجود حکمت و طب و موسیقی است و

نماندن نام شاعر دلیل بر عدم وجود شعر۔

"لغات چارہ وچکامہ وسرداد دپساد ندکہ یقیناً بعضے از آنہا باقی ماندۂ دورۂ ساسانی است برائے اثبات ادعائے ما درین امور د شواہد دیگری باشند"

یہ آرا اُن اساتذہ کی ہیں جو فارسی شاعری کو اسلامی دَور سے قدیم مانتے ہیں اور عربی اثرات میں اس کی ولادت اور نشو ونما کے بالکل منکر ہیں قصّہ مختصر شاعری ان کے نزدیک ایران میں قدیم زمانے سے تھی۔ اور ایرانی جملہ اقسام و فنون شعر سے واقف تھے۔ ذیل میں ناظرین کی معیّت میں ان اسناد کے دعاوی پر غور کیا جاتا ہے۔

ابوطاہر خاتونی کے شعر کے متعلق یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے اشعار شاہنامہ میں دعائیہ موقعوں پر فردوسی اکثر لکھتا ہے۔ چنانچہ شاپور اپنے باپ اردشیر بابکان سے اپنے فرزند اور مژدہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

بدو گفت شاپور انوشہ بدی   جہاں را بدیدار توشہ بدی

اس مثال میں ہم دیکھتے ہیں کہ قصر شیریں کے شاعر کو فردوسی کے آخری مصرع سے بالکل توارد ہو گیا ہے۔ دختر اردوان سے جب اردشیر کے فرزند ہوتا ہے تو اس کا وزیر کہتا ہے:۔

بدو گفت شاہا انوشہ بدی   روانرا بہ فرہنگ توشہ بدی

یہ امر ظاہر ہے کہ فردوسی کے عہد کی زبان شیریں کے زمانے کے شعرا کی زبان نہیں ہو سکتی۔ اس لیے قصر شیریں کی تعمیر کے ساتھ ساتھ فارسی شاعری کا سنگِ بنیاد نہیں رکھا جا سکتا۔

میں دولت شاہ کے اس عقیدے کی بھی تائید نہیں کر سکتا کہ جس طرح عربوں نے عجمیوں کے اور رسوم اور طریقے محو کیے۔ اسی طرح ممکن ہے کہ شاعری کی بھی ممانعت کر دی ہو۔ دولت شاہ کی تاریخ دانی اس ایک امر سے معلوم ہو سکتی ہے کہ اس کے نزدیک آل ساسان کے زمانے میں شاعری دوبارہ رواج پاتی ہے۔ داستان وامق و عذرا کا ہم نہیں جان سکتے کہ فارسی شاعری سے کیا تعلق ہے۔ وہ کوئی منظوم داستان نہیں تھی۔ کیونکہ خود دولت شاہ اس کی منظومیت کا دعویٰ نہیں کرتا۔ وامق و عذرا کی داستان کا ضائع ہونا بجا وہ تو آج بھی موجود ہے۔ اس امر میں شک نہیں کہ افسانہ کی کتابوں سے مسلمان حلقوں میں بالخصوص نو عمر اولاد کے واسطے ضرور تعصب رہا ہے اور وہ اسی غرض سے تھا کہ مبادا وہ ان افسانوں میں مستغرق ہو کر ضروری باتوں سے غافل ہو جائیں۔ اس قسم کی کتابوں کی ممانعت اسی بنا پر آج بھی ماں باپ کرتے ہیں۔ اور کون ایسا دل سوز باپ ہو گا جو اپنی کم عمر اولاد کو عشقیہ افسانوں، ناولوں اور مخرب اخلاق کتابوں کے مطالعہ کی اجازت دے گا۔ اسی بنا پر بحر الفوائد میں جو چھٹی صدی ہجری کی تصنیف ہے اور ابی سعد ارسلان آبہ بن آق سنقر کے لیے ملک شام میں

فارسی زبان میں تصنیف ہوئی تھی۔ مصنّف نے تربیت اولاد کے فرائض بیان کرتے وقت والدین کو تاکید کی ہے کہ اس قسم کی کتابیں بچّوں کے ہاتھ میں نہ آنے دیں۔ مصنّف کہتا ہے:۔

"نگاہ باید داشت . . . . از خواندن کتب پارسی کہ نہ بہ شریعت تعلّق دارد ومانند دیس ورامین وحکمت جاماسپ و لہراسف و وامق وعذرا کہ خواندن این کتاب ہا فسق است"۔

یہ بھی یاد رہے کہ مصنّف مذہبی حلقہ کا آدمی ہے جس نے قرآن اور شریعت کے سوا تمام چیزوں سے آنکھ بند کر رکھی ہے۔ بہرحال اس قسم کی کتابوں سے مسلمان حلقوں میں احتراز کے یہ معنی نہیں لیے جاسکتے کہ جب کبھی مسلمان ایرانی تصانیف کے رو در رو آئے نیست کر دی گئی۔

حکیم فرایرج کا قطعہ اکثر متاخر اساتذہ کے ہاں منقول ہے۔ لیکن اس کا قدیم راوی صاحب بستان المذاہب ہے جس نے کا مجوی نامی ایک سمراوی سے ۱۰۴۸ھ میں شہر لاہور میں سنا تھا۔ یہ قطعہ اس حصّۂ فارسی ادبیات مجعول سے تعلق رکھتا ہے جو غالباً عہدِ اکبری میں کسی خاص تجویز کے زیرِ اثر تیار کیا گیا تھا۔ اِسی سلسلے میں دساتیر وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے اور نہ اس قطعہ کو اکبری دَور سے پیشتر کا تصوّر کیا جاسکتا ہے۔ غالباً اس سے زیادہ اس کی تنقید کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

میں اس نظر سے شیدوش کے شعر کو دیکھتا ہوں۔ اس کی خصوصیت یہی ہے کہ اس میں چند غیر مستعملہ اور نامعلوم الفاظ درج ہیں۔ اس کے جملوں کی ترکیب بالکل زمانۂ حال کی سی ہے اور تعجب نہیں اگر کسی با مذاق ایرانی یا پارسی نے ہم ہندی نژادوں کو فقروں میں اُڑانا چاہا ہو۔ میں اس نمونے کو بھی دساتیری عہد کا مانتا ہوں۔

یہاں اُن اصطلاحات سے بحث کی جاتی ہے جو پروفیسر محمد حسین آزاد اور علامہ میرزا عباس خاں آشتیانی نے اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کی ہیں۔ ان کے متعلق ہمیں اس قدر معلوم کرنا ہے کہ آیا یہ اصطلاحات ساسانی دَور کی یادگار ہیں یا عہد مابعد اسلام میں بغرض ترجمہ ایجاد ہوئی ہیں۔ مثال میں عربی لفظ نظم پیش کیا جاتا ہے۔ فارسی میں اس کا مرادف پیوستن، عربی میں قاعدہ ہے۔ کہ مصدر بمعنی اسم مفعول آجاتا ہے۔ اس طرح لفظ نظم بحالت مفعولی بمعنی کلام منظوم آگیا۔ فارسی دانوں نے اسی قاعدے کو مدِّ نظر رکھ کر پیوستن کے اسم مفعول پیوستہ سے وہی معنی استخراج کیے اور جب ہم ان کے معنی پر غور کرتے ہیں تو رہا سہا شبہ اور بھی رفع ہو جاتا ہے۔ عربی مصدر نظم کے معنی ملانا ترتیب دینا اور نظم کرنا ہیں۔ کیا یہ ضروری ہے کہ اس کا مرادف پیوستن اس کے تمام معنی پر حاوی ہو۔ یہی کیفیت بعینہٖ پراگندہ اور نثر کی ہے۔

نظم کا ترجمہ بہ حیثیت اصطلاح پیوستہ مان لیا گیا ہے۔ اور ہم سے

کہا جاتا ہے کہ یہ لفظ ساسانی دور کی یادگار ہے۔ لیکن خود فردوسی جس کے عہد میں عربی زبان کا فارسی پر اثر بہت کچھ دھندلا اور غیر نمایاں تھا۔ اس اصطلاح کو تسلیم نہیں کرتا۔ اگرچہ وہ اس کے مصدر پیوستن کو بصورتِ فعل بلا تامل قبول کر لیتا ہے مثلاً

به پیوستم این نامه بر نام اوے
همه بهتری باد فرجام اوے

(دیگر) به پیوستم این نامهٔ پاستان
پسندیده از دفتر راستاں

(دیگر) به پیوند و باغ بے خو کنم
سخن ہائے شاہنشہاں نو کنم

(دیگر) ....
نه بروے به پیوند او کس گماں

لیکن بصورت اسم بمعنی اصطلاح وہ عربی ذخیرے سے لفظ نظم مستعار لیتا ہے۔ امثال ؎

نگه کردم این نظم سست آمدم
همه بیت نا تندرست آمدم

(دیگر) پے افگندم از نظم کاخ بلند
که از باد و باراں نیابد گزند

(دیگر) زگاہِ کیومرث تا یزدجرد
به نظمِ من آید پراگنده گرد

(دیگر) به نظم آرم این نامه را گفت من
ازو شادماں شد دلِ انجمن

اس سے ظاہر ہے کہ فردوسی پیوستہ کو بمعنی کلام منظوم تسلیم نہیں کرتا۔ قریب قریب یہی حالت پراگندہ کی ہے۔ فردوسی کے ہاں اگرچہ یہ اصطلاح مل جاتی ہے۔ لیکن وہ اس کا استعمال زیادہ تر بہ سبیل تشریح کرتا ہے۔ ایک موقع پر اس کو حدیثِ پراگندہ کہا ہے۔ دوسرے موقعہ پر اس کے ساتھ "گویا" کا لفظ استعمال کیا ہے اور ایک مقام پر عربی لفظ "منشور" لکھا ہے۔ امثال ؎

حدیثِ پراگندہ بپراگند — چو پیوستہ شد مغز جاں آگند
بہ پیوست گویا پراگندہ را — بہ سُفت این چنیں دُرِّ ناسفتہ را
فسانہ کہن بود و منشور بود — طبائع ز پیوند او دُور بود

اسی طرح لفظ پساوند ہے جو اصل میں پس۔ آ۔ وند۔ بہ ترکیب خداوند خویشاوند ہے اور حقیقت میں قافیہ کا ترجمہ ہے۔ چنانچہ اسدی نے لغت فرس میں یہی معنی دیے ہیں۔ لبیبی ؎

ہمہ بادہ ہمہ جام و ہمہ شست — معانی یا حکایت یا پساوند

سروا، سرداد، اور سردادہ اصل میں ایک ہی لفظ معلوم ہوتا ہے اور اس کا

اطلاق بات چیت، افسانہ، شعر اور قافیہ شعر کے معنوں میں ہوتا ہے اور جس طرح سرداد کلام منظوم کے معنوں میں آتا ہے۔ ان ہی معنوں میں چگامہ اور چغامہ بھی مستعمل ہوتا ہے۔ پس وہ امتیاز جو شعر اور قصیدہ میں پایا جاتا ہے۔ ان کی ان فارسی مرادفات سے اٹھ جاتا ہے اور اس پر شعر و قصیدہ کا اطلاق غالباً عربی اتباع میں کیا گیا ہے اور اسدی نے اپنی لغت میں سرداد کی تشریح میں صاف لکھ دیا ہے کہ وہ شعر کے معنوں میں آتا ہے جس کو چگامہ اور چغامہ بھی کہا جاتا ہے۔

داغ اور دم کی مثال کا کوئی شعر نہیں ملتا۔ تخلص اور وزن شعر کے معنوں میں ان کا اطلاق بر سبیل مجاز ہے۔ لیکن ایک بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اگرچہ یہ مصطلحات ایرانی اور ایران زا ہیں۔ لیکن خود اہلِ ایران نے ان کا استعمال ترک کر کیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ضرورتاً یہ الفاظ وضع کیے گئے۔ لیکن قبولیت عام کا خلعت نہیں ملا۔

چامہ کے معنی ہمارے لغات میں غزل کے دیے جاتے ہیں۔ مگر شاہنامہ میں وہ زیادہ تر گیت کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ فردوسی ؎

مے آورد برخواں و رامشگراں ہمی چامہ بود از کراں تاکراں

(آمدن شنگل با ہفت بادشاہ نزد بہرام)

بہرحال شاعری اگر ایران میں قدیم تھی تو فردوسی ایسا شخص نہیں تھا جو اس کا ذکر نہ کرتا یا اس کے چھپانے کی کوشش کرتا۔ اور اس ملک میں چامہ کا دستور

ہے۔ اور اس کا ذکر شاہنامہ میں کئی مقام پر آتا ہے۔ مثلاً
بہرام گور جب شیر مار کر بوڑھے مہیار کے گھر بہ تبدیل نام مہمان ہوتا ہے۔ تو میزبان مہمان سے اپنی لڑکی کا تعارف کراتے وقت کہتا ہے کہ میری دختر میں کئی خوبیاں ہیں ؎

ہم او میگسار ست و ہم چنگ زن
ہم او چامہ گوے ست دانندہ شکن

لڑکی سامنے آکر مہمان کا خیر مقدم کرتی ہے۔ بہرام چامہ کی فرمائش کرتا ہے۔

بدو گفت بنشیں و بردار چنگ ۔ یکے چامہ باید مرا بے درنگ
شود پیر مہیار امشب جوان ۔ گر دگاں کند پیشِ مہماں رواں

لڑکی چنگ ہاتھ میں لے کر سب سے پہلے اپنے باپ مہیار کا چامہ گاتی ہے۔ فردوسی اسے یوں بیان کرتا ہے ؎

بزد چامۂ باب خود ماہیار ۔ تو گفتی بنالد ہمی چنگ زار
پدر را چنیں گفت کاے ماہیار ۔ چو سروِ سہی بر لب جوئبار
چو کافور گرد گل سرخ موئے ۔ زباں گرم گوئی و دل آزرم جوئے
ہمیشہ بد اندیشت آزردہ باد ۔ بدانش روانِ تو پروردہ باد
توئی چوں فریدونِ آزادہ خوئے
منم چوں پرستار و نام آرزوئے

اس موقعہ پر باہیار کا چامہ ختم ہو جاتا ہے اور مہمان کا چامہ اس طرح شروع ہوتا ہے :-

چو ایں گفتہ شد سوئے مہماں گزشت | ابا چامۂ وچنگ نالاں گزشت
به مہماں چنیں گفت کاۓ شاہ فش | بلند اختر و یک دل و کینہ کش
کسے کو ندیدہ است بہرام را | ستودہ سوار دل آرام را
نگہ کرد باید بروے تو بس | جز او را نمانی ز لشکر بہ کس
میانت چو غرو ست و بالا چو سرو | خراماں شدہ سرو ہمچوں تدرو
بہ دل نرہ شیری بہ تن ژندہ پیل | بہ آورد خشت افگنی بر دو میل
رخانت بہ گلنار ماند درست | چہ گوئی ہمی برگ گل را کہ شست
دو بازو بہ کردار رانِ ہیوں | ز پا اندر آری کہ بیستوں
برنج آفریند فلک چوں تو مرد | نہ دیدم بسان تو اندر برد

تن آرزو خاک پائے تو باد
ہمہ سالہ زندہ برائے تو باد

دہقان برزین کے ہاں بھی بہرام گور ایک مرتبہ جا نکلتا ہے۔ برزین کی تین لڑکیاں تھیں۔ جن میں ایک چامہ گو ہے۔ دوسری چنگ زن اور تیسری رقاصہ برزین بہرام سے انھیں ملاتے وقت کہتا ہے :-

چناں داں کہ ایں دختران منند | پسندیدۂ و دلبران منند

یکے چامہ گوئے دگر چنگ زن   سوم پائے کوبد شکن بر شکن
ز چیزے مرا نیست شاہا کمی   درم ہست و دینار و باغ و زمی
سہ دختر بکردار خرم بہار
بدیساں کہ بیند ہمی شہریار

اس کے بعد برزین اپنی لڑکیوں سے کہتا ہے کہ تیار ہو جاؤ اور بادشاہ کو اپنا کمال دکھاؤ۔ ؎

بداں چامہ زن گفت کائے ماہروے   ببرد از دل چامہ شاہ گوے
بتاں چامہ و چنگ در بر ساختند   بیکایک دل از غم بپرداختند

اور چامہ یوں شروع ہوتا ہے :- ؎

نختیں شہنشاہ را چامہ گوئے   چنیں گفت کائے خسرو ماہروے
نہ مانی مگر بر فلک ماہ را   تشائی مگر خسروی گاہ را
بہ دیدار ماہ و بہ بالائے ساج   بنازد بتو تخت شاہی و تاج
خنک آنکہ شبگیر بنیدت روئے   خنک آنکہ یابد ز موئے تو بوئے
میاں تنگ چوں ببر و بازو سطبر   ہمی فرّ تاجت بر آید بابر
بگلنار ماند ہمی چہر تو   ز شادی بخندد دل از مہر تو
دلت ہمچو دریا و دستت چو ابر   شکارت نہ بینم ہمی جز ہزبر
ہمی موئے کافی بہ پیکان تیر   ہمی آب گردد ز دادِ تو شیر

سپاہی کہ بیند کمندِ ترا　　　ہمی بازوئے زور مندِ ترا

بدرد دل و مغز جنگ آوراں　　　اگر چند باشد سپاہ گراں

چو آں چامہ بشنید بہرام گور

بخورد آں گراں سنگ جامِ بلور

چامہ کی ان مثالوں سے جو اوپر دی جا چکی ہیں ناظرین سمجھ سکتے ہیں کہ فردوسی کے نزدیک چامہ کی نوعیّت کیا ہے۔ ابتداءً وہ ایک گیت ہے جو عموماً موسیقی ساز کے ساتھ ساتھ گایا جاتا ہے اور چونکہ مہمان کی آمد کے وقت آسانی کے ساتھ یہ بنایا جا سکتا ہے۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ فقرات موزوں کی شکل میں ہوتا ہوگا۔ بلحاظِ مضمون وہ غزل سے بالکل مختلف ہے۔ فردوسی نے جو نمونے دئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ چامہ اکثر تعریف میں ہوتا تھا۔ اس لحاظ سے چامہ پر اگر قصیدے کا اطلاق کیا جائے تو مناسبت سے خالی نہیں۔ غزل میں اور چامہ میں البتہ ایک بات عام ہے یعنی چامہ کے خاتمہ پر تخلص کی بجائے چامہ گوئی کا نام ہوا کرتا تھا۔

یہاں مجھ کو الفاظ شعر و شاعر کے متعلق بھی کچھ کہنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ ان الفاظ کا فارسی میں کوئی مرادف نہیں ہے۔ سخن بمعنی کلام منظوم فردوسی کے عہد کے بعد استعمال میں آتا ہے۔

رہا لفظ شاعر اس کے متعلق یہ معلوم رہے کہ فارسی میں کوئی قدیم اور مخصوص لفظ

اس کا قائم مقام موجود نہیں۔ اگرچہ ترکیبی اسما کئی موجود ہیں۔ مثلاً سخنور، سخن، پیوند، سخن سرائے، سخن گوئے، سخن سنج، چامہ گوئے اور چامہ ساز اور نظم پیرائے وغیرہ اور متاخرین ان کے واضع ہیں۔ جن سے قدما کو کوئی سروکار نہیں۔ فردوسی کے ہاں شاعر کا مرادف "گوینده" ہے۔ امثال ؂

تو نیز آفریں کن کہ گویندۂ　　بدو نام جاوید جویندۂ

(دیباچہ شاہنامہ در ستائش سلطان محمود صہ۲ طبع بمبئی سلمہ ۱۲)

چناں دید گوینده یک شب بخواب　　کہ یک جام مے داشتے چوں گلاب

(افتتاحیہ جلد سوم)

گرفتم بگوینده بر آفریں　　کہ پیوند را راه داد اندریں

(جلد سوم صہ ۱۲ انجام شدن گفتار دقیقی)

کیا یہ امر قابلِ استعجاب نہیں کہ فارسی زبان جو بقول محمد صالح، مولانا آزاد، و میرزا عباس آشتیانی فن شعر کی تمام اصطلاحات کی مالک تھی۔ شاعر کے لیے خاص لفظ نہیں بتاتی۔ عرب تمام ایرانی کتابیں برباد کر سکتے تھے۔ امیر عبداللہ اور خلفائے عباسیہ ان کے تمام دفتر تاراج کر سکتے تھے۔ لیکن شاعر کا لفظ اگر فارسی زبان میں اس کے لیے کوئی لفظ تھا تو نہ تباہ ہو سکتا تھا نہ برباد۔

ہمیں اس امر پر بھی غور کرنا چاہیے کہ خود ایرانی اس باب میں کیا کہتے ہیں فخری گرگانی قصۂ ویس ورامین کے ذکر میں کہتا ہے۔ ؂

ندیدم زاں نکوتر داستانے — نماند جز بہ خرم بوستانے
ولیکن پہلوی باشد زبانش — نداند ہر کہ برخواند بیانش
نہ ہر کس آں زباں نیکو بخواند — دگر خواند ہمی معنی نداند
فراواں وصف چیزے برشمارد — چو برخوانی بسے معنی ندارد
کہ آنگہ شاعری پیشہ نبود است — حکیم چابک اندیشہ نبود است
کجا اند آں حکیماں تا بہ بینند — کہ اکنوں چوں سخن می آفرینند

معانی را چہ گونہ برکشادند
بر و وزن و قوافی چوں نہادند

فخری کے نزدیک پہلوی میں شاعری کا فن نہیں تھا اور نہ وہ ایسے اشعار لکھتے تھے جن میں وزن و قافیہ کی قید ہو۔ شیخ نظامی بہرام گور کے چینیوں کی فتح کے موقع پر یہ دو شعر لکھتے ہیں ؎

پہلوی خوان پارسی فرہنگ — پہلوی خواند بر نوازش چنگ
شاعران عرب چو در خوشاب — شعر خوانند بر نشید رباب (بہرام نامہ)

اس سے بھی زیادہ صاف بیان محمد عوفی کا ہے۔ وہ کہتا ہے :-

"در عہد پرویز نوا ر خسروانی کہ آں را باربد در صورت آوردہ است بسیار است فاما از وزن شعر و قافیت و مراعات نظائر آں دور است بداں سبب تعرض بیان آں کردہ نیامد۔ تا نوبت بدور آخر زماں رسید و آفتاب ملت

حنفی و دین محمدی سایہ بر دیار عجم انداخت و لطیف طبعان فرس را با فضلاء عرب اتفاق محاورہ پدید آمد و از نواز فضائل ایشاں اقتباس کردند و بر اسالیب لغات عرب وقوت گرفتند و اشعار مطبوع آبدار حفظ کردند و بغور آں فرو رفتند و بر دقائق بحور و دوائر آں اطلاع یافتند و تقطیع و قافیہ و ردف و روی و ایطاد سناد و ارکان و فواصل بیاموختند و ہم بر آں منوال نسائج فضائلے کہ نتائج طبع ایشاں بود بافتن گرفتند"۔

محمد عوفی کو اعتراف ہے کہ شاعری ایرانیوں نے عرب سے سیکھی ہے۔ کہتا ہے:۔ ؎

سوارانِ تازندہ را نیک بنگر ۔۔۔ دریں پہن میدانِ تازی و دہقاں
عرب بر رہِ شعر دارد سوارے ۔۔۔ پزشکی گزیدند مردانِ یوناں
رہِ ہندواں سوئے نیرنگ افسوں ۔۔۔ رہ رومیاں زی حسابست والحاں
مصوّر بکار است مر چینیاں را ۔۔۔ چو بغدادیاں را صناعات ایواں

انوری کہتا ہے:۔

شاعری دانی کدامی قوم کردند آنکہ بود ۔۔۔ اول شاں امراء القیس آخر شاں بونواس

منوچہری کا اعتقاد ہے۔

شاعری عباس کرد و حمزہ کرد و طلحہ کرد ۔۔۔ جعفر و سعد و سعید و سید ام القریٰ

ایرانیوں کے علاوہ خود عرب مورخین کے بیانات بھی اسی عقیدے کے موید ہیں۔ مثلاً جاحظ (کتاب الحیوان جلد اوّل ص ۳۶) فضیلت شعر کے بیان میں کہتا ہے کہ:-

"ہر ملتے در پایدار کردن آثار و مناقب خود بیک شکل و راہ دیگر متوسل شدہ مثلاً عربہا در جاہلیت ایں کار را بشعر موزوں و کلام مقفیٰ انجام می دادند و ایرانیاں با بناہا آثر خود را ثبت می نمودند مانند گرد بیدا رد بنائے اردشیر بیدائے اصطخر را بعد عرب ہا خواستند کہ با عجم در کار بنائے ابنیہ مشارکت کردہ در باب شعر منفرد شوند پس غمدان و کعبۂ نجران و قصر مآرب را بنا کردند ...."

اسی تصنیف کے ص ۳۷ پر کہتا ہے:-

"و فضیلت شعر منحصر است بعرب و بر آنانکہ بعربی متکلم اند و شعر قابل ترجمہ نیست و نمی تواں آنرا نقل بزبان دیگر کرد و رنہ نظم آں گسستہ میشود و وزنش باطل گردد حسنش میرود۔"

یہی جاحظ اپنی ایک اور تصنیف کتاب البیان والتبیین (طبع مصر جلد اوّل ص ۱۴۵) میں عجم پر عرب کی مفاخرت کے ذکر میں کہتا ہے:-

"و چیست فرق بین اشعار عرب و آں کلامے کہ آنرا ایرانیاں و رومیاں شعرے نامند۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ایران میں جو تصنیف از قسم نغمات شائع تھی عربوں کی نگاہ میں شعر کی مستحق نہیں تھی۔ فرخی جب شاعری کے میدان میں مشاہیر کا ذکر کرتا ہے تو شہید بلخی اور رودکی اور بو طلب کے سوا کوئی قدیمی نام پیش نہ کر سکا۔ چنانچہ ؎

زدلآویزی و تری چو غزلہائے شہید   وز غم انجامے و خوشی چو ترانہ بوطلب

دیگر

شاعرانت چو رودکی و شہید   مطربانت چو سرکش و سرکب

ساسانی عہد میں شعر کے اصلی نمونوں کی غیر حاضری اور جملہ مورخینِ ایران کی اس بارے میں خاموشی دلیل ہے اس امر کی کہ ساسانی ایرانی اس فن سے واقف نہیں تھے۔ البتہ نوائے خسروانی یا نوائے باربدی مشہور ہیں جو زیادہ تر گیت اور نغموں کے مشابہ ہیں۔ ان میں وزن اور قافیہ کی قید نہیں ہے۔ اسی لیے عوفی کہتا ہے کہ میں اپنے ذکر سے احتراز کرتا ہوں۔ صاحب المعجم کا بیان ہے کہ باربار جرمی نے اپنی خسروانی کی بنا نثر پر قائم کی ہے اور اس میں کلام منظوم نہیں آتا ہے۔ اگرچہ مضمون کے لحاظ سے خسرو پرویز کی مدح ہے۔ یہ غالباً اسی قسم کی چیز ہے جس کو فردوسی چامہ کے نام سے یاد کرتا ہے۔ محقق طوسی اس کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کے اوزان میں مناسبت تامہ نہیں ہوتی۔ صاحب تاریخ سیستان کہتے ہیں کہ خسروانی کو رود کے ساتھ جاتا تھا۔

جب اسلام کے ساتھ عربی زبان ایران میں شائع ہوئی اور ایرانی اسلام لاکر عربی علوم و فنون سیکھنے لگے۔ اس وقت قومیت کے لحاظ سے وہ ایران ساسانی ایران نہیں تھا۔ عرب قبائل ایران میں آباد ہوکر ایرانی بن گئے تھے۔ عرب و عجم اور ترک کے اختلاط نے ایران کو ایک نئی قوم دے دی تھی۔ جس کے لیے وطن پرست فردوسی حقارت کے لہجہ میں کہتا ہے :۔

از ایران و از ترک و از تازیاں　　نژادے پدید آید اندر میاں
نہ دہقاں نہ ترک و نہ تازی بود　　سخنہا بہ کردار بازی بود

اس میں شک نہیں کہ عربیت ان کی مدنیت اور معاشرت کی ہر صف پر پیوست ہو گئی تھی۔ عربی زبان ان کی مذہبی علمی اور سیاسی زبان بن گئی تھی عربی تقلید میں ایرانیوں میں بھی شاعری کا شوق ہو چلا تھا۔ اچھے اچھے ایرانی نژاد شاعر پیدا ہونے لگے جو عربی میں شعر کہہ سکتے تھے۔ اب فارسی زبان میں اس جدید طرز شاعری کا رواج دینا کیا مشکل تھا۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں فنون و اشیا کے آغاز و ابتدا کے متعلق ایک عجیب قسم کا نظریہ قائم کر لیا گیا ہے۔ جو یہ ہے کہ ہر شے اور چیز کا موجد کوئی نہ کوئی خاص شخص ہوا ہے۔ ہم ایک چیز کے اتفاقیہ ظہور میں آنے اور تدریجی ارتقا کے ذریعہ سے اس کے کمال پانے کی تمام تحسین ایک ذاتِ واحد کے سر تھوپ دیتے ہیں چنانچہ حضرت آدم صفی اللہ کو سریانی کا اور یعرب ابن قحطان کو عربی کا پہلا شاعر فرض کر لیا گیا ہے اور فارسی میدان میں بہرام گور کے نام پر اول شاعر ہونے کا قرعہ فال ڈالا

گیا ہے۔ میں بہرام کی روایت کو بھی اسی فہرست میں داخل کرتا جس میں فارسی شاعری کی قدامت کی روایات کو شامل کر چکا ہوں۔ لیکن اس کی عام مقبولیت اور اس کی قدامت اور عام مورخین کا اس پر اجتماع قابلِ تامل ملحوظات ہیں۔ جن کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی اساس پر قائم ہے۔ صرف دولتِ شاہی اس کا راوی نہیں ہے بلکہ اس سے مقدم محمد عوفی اس کا ناقل ہے۔
عوفی کے ہاں بہرام گور کا شعر یوں منقول ہے :- ؎

من آں شیرِ گلہ منم آں پیل یلہ
نام من بہرام گور و کنیت من بوجبلہ

شمس الدین محمد بن قیس نے المعجم میں یوں لکھا ہے ؎

من آں پیلِ دماں و منم آں شیر یلہ
نام من بہرام گور کنیتم بوجبلہ

(المعجم فی معابیر اشعار العجم ص ۱۶۹)

غرر ملوک الفرس ثعالبی میں یوں ملتا ہے ؎

من آں شیر شلہ منم آں بیر یلہ
منم آں بہرام گور منم آں بوجبلہ

مسعودی نے بھی مروج الذہب ۳۳۶ھ میں بہرام گور کے عربی و فارسی اشعار کا ذکر کیا ہے۔ اگرچہ کوئی شعر اپنی تصنیف میں نقل نہیں کیا۔ ابن خردادبہ نے اپنی

تصنیف کتاب المسالک و الممالک حدود ۳۳۰ھ (چھاپ لیڈن صفحہ ۱۱۸) میں اسی شعر کو نقل کیا ہے۔ جہاں وہ اس کو نثر مسجع بہرام گور لکھتا ہے۔ چنانچہ

منم شیر شلنبہ و منم ببر تلہ

کتاب ہفت قلزم (بحر سوم قلزم ہفتم) میں اسی شعر کو قاسم بن سلام بغدادی متوفی ۲۲۲ھ کی سند پر اس طرح لکھا ہے ؎

منم آں پیل دماں و منم آں شیر یلہ
نام بہرام مرا و پدرم بوجبلہ

جب اس قدر مورخین اس کا ذکر کر رہے ہیں تو ظاہر ہے کہ اس کی اصلیت کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔ لیکن کئی امور قابلِ لحاظ ہیں۔ بہرام گور ۴۲۰ھ تا ۴۳۸ھ میں برسر تخت تھا۔ اس عہد میں عربی شاعری وجود میں آ چکی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ بہرام نے نعمان بن منذر کے ہاں پرورش پائی تھی۔ عربی زبان سے واقف تھا۔ لیکن روایت ان ہی ماخذ سے آ رہی ہے۔ جس میں یعرب بن قحطان کو عربی کا اور حضرت آدم کو سریانی کا پہلا شاعر مانا گیا ہے۔

عوفی نے عباس مروزی ۱۹۳ھ کو فارسی کا شاعر مانا ہے۔ جسے کہا جاتا ہے خلیفہ مامون الرشید کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا جس کے اوّل اور آخر کے دو بیت عوفی نے نقل کیے ہیں۔

بعض اسناد نے حکیم ابوحفص سعدی کو پہلا فارسی شاعر مانا ہے۔ اس کا

شعر یہ ہے ؎

آہوئے کوہی در دشت چگونہ دودا
یار ندارد بے یار چگونہ دودا

ایک جدید نظریہ وہ ہے جو میرزا عباس خاں آشتیانی نے پیش کیا ہے۔ ایک نامعلوم تاریخ سیستان کے حوالے سے جو منتصف قرن سابع ہجری میں تصنیف ہوئی تھی۔ میرزائے موصوف محمد وصیف سنجری کو جو ابو یوسف یعقوب بن لیث صفار کا دبیر تھا، فارسی کا پہلا شاعر مانتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ جب یعقوب بن لیث نے ۲۵۳ھ میں ہرات پر قبضہ کر لیا اور امیر محمد طاہری کو مغلوب کر کے اور سیستان، کابل، کرمان و فارس کی ریاست اپنے نام لکھوا کر واپس سیستان لوٹا تو سیستانیوں نے بڑے جوش اور اہتمام کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ امام ابو احمد عثمان بن عفان سنجری (متوفی ۲۵۵ھ) نے نماز جمعہ میں اس کا خطبہ پڑھا۔ شعرا نے مبارک بادیں قصائد لکھے۔ یہ قصائد عربی زبان میں تھے۔ یعقوب عربی زبان سے امی تھے۔ یہاں سے میں مصنّف کی عبارت نقل کرتا ہوں:۔

"پس یعقوب گفت چیزے کہ من اندر نیابم چرا باید گفت۔ محمد بن وصیف پس شعر فارسی گفتن گرفت و اول اندر عجم او گفت پیش از و کسے نہ گفتہ بود کہ تا پارسیاں بودند سخن پیش ایشاں بررد۔ بار گفتندے

بطریق خسروانی و چوں عجم پراگندہ شدند و عرب آمدند شعر میان ایشاں بتازی بود و ہمگناں را علم و معرفت شعر تازی بود و اندر عجم کسے برنیامد کہ او را بزرگی آں بود و پیش از یعقوب کر اندر او شعر گفتندے مگر حمزہ بن عبداللہ الخارجی (افتاری) داد عالم بود و تازی دانست شعرائے او تازی گفتند و سپاہ او بیشتر از عرب بودند و تازیاں بودند چوں یعقوب رتبیل و عمار خارجی را بکشت و ہری بگرفت و سیستان و کرمان و فارس او را دادند۔ محمد وصیف ایں شعر بگفت:"

اے امیرے کہ امیران جہاں خاص و عام — بندہ و چاکر و مولائے و سگ بندہ غلام

ازلی خطے در لوح کہ ملکے بدہید — بے ابی یوسف یعقوب بن لیث غلام

بسام آمد رتبیل و لے خورد پلنگ — لرزہ شد لشکر رتبیل و ہبا گشت کنام

لمن الملک بخواندی امیرا بیقین — باقلیل الفئۃ کت داد دراں لشکر کام

عمر عمار ترا خواست و زو گشت بری — تیغ تو کرد میانجی بمیاں دو دام

عمر او نزد تو آمد کہ تو چوں نوح بزی

در آکاس تن او سر از باب طعام

محمد بن وصیف قرن سوم کے اختتام تک معلوم ہوتا ہے، شعر کہتا رہا ہے، چنانچہ صفاریوں کے زوال پر ۲۹۶ھ میں قطعۂ ذیل لکھتا ہے:۔

مملکتے بود شد بے قیاس — عمرو بر آں ملک شد بودر اس

از حدِ ہند تا بحدِ چین و ترک
از حدِ زنگ تا بحدِ روم و کاس

راس و ذنب گشت و بشد مملکت
زر زدہ شد ز نحوست نحاس

دولتِ یعقوب دریغا برفت
ماند عقوبت بہ عقب بر حواس

عمرو عمر رفت و زد ماند باز
مذہب روباہ ہنس و نواس؟

اے چہ غما آمد و شادی گزشت
بود دلم دایم ازیں پر ہراس

ہر چہ بکردیم بخواہیم دید
سود نہ دارد ز قضا احتراس

ناس شدند نسناس آنگہ ہمہ
وز ہمہ نسناس بگشتند ناس

دَورِ فلک گرداں چوں آسیا
لاجرم ایں رس ہمہ کرد آس

ملک ابا ہزل نہ کرد انتساب
نور ز ظلمت نکند اقتباس

جہد و جد یعقوب باید ہمے
تا کہ زجدۃ بدر آید ایاس

(منقول از کادہ)

محمد بن وصیف اور اس کی شاعری اگرچہ فارسی ادبیات کا ایک فراموش شدہ ورق مانے جا سکتے ہیں لیکن نہ محمد وصیف اس زبان کا پہلا شاعر ہے اور نہ اس کی نظمیں فارسی کی اولین نظمیں مانی جا سکتی ہیں۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ سیستان میں وہ پہلا شاعر ہو۔ بات یہ ہے کہ اس کی شاعری ایسے دَور کی یادگار ہے جبکہ فارسی عروض نے عربی اوزان کے اتباع سے آزادی حاصل کرکے اپنے لیے

مختلف شاہراہ اختیار کرلی ہے۔

میری رائے میں ایسی کوشش جس کے ذریعے سے ہم کسی خاص شخص کو شعر کی اولیت کی عزت دیں بے سود ہے۔ ہمارے لیے مفید تر یہ امر ہے کہ ہم یہ دریافت کرنے کی سعی کریں کہ شاعری کی ابتدا کس عہد سے ہوئی ہے۔ نیز یہ کہ اس کے قدیمی نمونے کس قسم کے تھے۔

میرا ایسا اعتقاد ہے کہ جب عرب فاتحین ایران میں آباد ہو گئے ہیں اور ان کی بستیاں مختلف مقامات پر قائم ہو گئی ہیں تو یہ نو آباد کار اپنے وطنی نغمہ یعنی شعر کو نہیں بھولے اور جب کچھ مدت کے بعد انھوں نے نئے وطن کی زبان سیکھ لی تو تفننِ طبع کی خاطر اپنے قدیمی وطن کے نغمات کو اس زبان میں بھی منتقل کرنے لگے۔ اس لیے یہ عرب ہیں جو فارسی میں شاعری کو رواج دیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ابن مفرغ کا قصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

ابن قتیبہ (طبقات الشعراء طبع لیڈن ص ۲۱۰) وطبری تاریخ کبیر سلسلہ ۲، صفحہ ۱۹۲ و صفحہ ۱۹۳) اور ابوالفرج اصفہانی (کتاب الاغانی ج ۱۷، صفحہ ۵۶) پر ذکر کرتے ہیں کہ "جب عباد بن زیاد برادر عبیداللہ بن زیاد (خلافت یزید بن امیر معاویہ) حکومتِ سیستان پر مقرر ہوا تو یزید بن مفرغ شاعر نے بھی ارادہ کیا کہ اس کی مصاحبت میں سیستان چلا جائے۔ روانگی کے وقت ابن زیاد یعنی عبیداللہ نے شاعر کو خلوت میں بلا کر کہا کہ میں اس بات سے خوش نہیں ہوں کہ تو میرے بھائی

کے ہمراہ سیستان جائے۔ اس لیے کہ میرا بھائی وہاں جاکر تدابیر جنگ و تحصیل و خراج کے معاملات میں مصروف ہو جائے گا۔ ان مشاغل کی بنا پر ممکن ہے کہ تیری طرف سے غفلت برتے اور اگر اس نے تیری منشا کے مطابق تیری آؤ بھگت نہیں کی تو مجھ کو اندیشہ ہے کہ تو اپنے اشعار کے ذریعہ سے ہمارے خاندان کو بدنام کر دے گا۔ ابن مفرّغ نے عرض کی۔ اے امیر آپ کی یہ بدگمانی درست نہیں۔ آپ کے بھائی کے احسانات مجھ پر اس قدر ہیں کہ میں کسی حالت میں ان کو فراموش نہیں کر سکتا ہوں۔ ابن زیاد نے کہا کہ اگر واقعی تو جانا چاہتا ہے تو مجھ سے عہد کر کے جا کہ اگر کسی وقت میرا بھائی تجھ سے تغافل کرے تو تُو اس صورت میں جلد بازی سے کام نہ لے اور قبل از وقت مجھ کو اطلاع دے۔ ابن مفرّغ نے کہا کہ بیشک میں اسی عہد کا پابند رہوں گا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ جب یہ لوگ سیستان پہنچے، عبّاد امور ریاست میں اس قدر مصروف رہا کہ اس کو شاعری کی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہیں ملی اور نتیجہ یہ نکلا کہ ابن مفرّغ ملول رہنے لگا۔ آخر اس قدر تنگ ہوا کہ ابن زیاد کے ساتھ اپنا عہد و پیماں فراموش کر کے عباد کی مذمّت پر قلم اٹھایا۔ ابن مفرّغ ایک روز عباد کے ہمرکاب چل رہا تھا۔ ایک اور شخص بھی ہمراہ تھا۔ عباد کی داڑھی جو گھاس کے پُولے کی طرح لمبی تھی، ہوا سے پریشان ہو کر ہر طرف حرکت کرنے لگی۔ ابن مفرّغ اس پر مسکرایا اور اپنے ہمراہی سے کہنے لگا۔

الا لیت اللحیٰ کانت حشیشا

فنعلفها خیول المسلمینا

(یعنی کاش داڑھیاں گھاس ہوا کرتیں تاکہ مسلمانوں کے گھوڑوں کا چارہ بنتیں)

اس شخص نے یہ شعر عباد کو سنا دیا۔ وہ بہت برہم ہوا۔ لیکن ابن مفرّغ سے کچھ نہیں کہا۔ ایک روز عباد گھوڑ دوڑ میں اوّل رہا۔ شاعر نے اس کارنامے کو اس طرح شہرت دی ؎

سبق عبّاد وصلت لحیتہٗ

(یعنی عباد اوّل رہا اور اس کی داڑھی دوسرے نمبر پر رہی)

بالآخر عباد نے اس کی ہجووں سے تنگ آکر بے مروّتی سے کام لیا اور لوگوں سے اس پر دعوے کرا دئے۔ جب وہ اپنے قرضہ کی ادائگی سے عاجز آگیا قید خانہ میں بھیج دیا گیا۔ اس کے غلام اور کنیز سے اس کو بیحد محبّت تھی۔ جبراً فروخت کر دئے گئے۔ ابن مفرّغ قید سے بھاگ کر بصرہ پہنچ گیا۔ وہاں سے شام اور پھر شہر بہ شہر بھاگتا پھرا۔ اوّل زیاد کی ہجوان کے نسب میں طعن وطنز، زیاد کی ماں سُمیّہ کی بد کاری اور اس کے ناجائز تعلقات کے قصّوں کی اپنی نظموں میں برابر اشاعت کرتا رہا۔ آخر کار بہ دشواری تمام ابن زیاد نے اس کو گرفتار کیا اور بصرہ میں قید کر دیا۔ اور یزید سے اس کے قتل کی اجازت مانگی۔ یزید نے لکھا کہ اس کو جس قدر دل چاہے اذیت دو۔ لیکن خبردار اس کے قتل کا ارادہ نہ کرنا۔ کیونکہ اس کی قوم و قبائل بہت ہیں اور سب میری فوج میں ملازم ہیں۔ اگر تم نے اس کو قتل کر ڈالا تو وہ سب کے سب بالاتفاق تمہارے خون کے طالب ہوں گے۔ جب ابن زیاد کے پاس یہ حکم پہنچا

اس نے ابن مفرّغ کی آواز رسانی کے خیال سے اس کے ساتھ ایک بلّی ایک سؤر اور ایک کتا باندھ دیے اور نبیذ شیریں شبرم میں ملوا کر اس کو پلوا دی جس سے اس کی طبیعت میں سرور اور روانی پیدا ہو گئی۔ اس حال سے شہر کے کوچہ و بازار میں اس کی تشہیر کی گئی۔ لڑکوں کا غول اس کے پیچھے تھا۔ وہ شور مچاتے تھے اور تماشائی فارسی زبان میں پوچھتے تھے کہ "ایں چیست" ابن مفرّغ جو فارسی زبان سے واقف تھا۔ فارسی نظم میں جواب دیتا تھا۔

آب است نبیذ است   عصارات زبیب است

سُمیّہ رو سپید ست

آخر الامر قید کی سختیوں سے شاعر کی صحت برباد ہونے لگی۔ ابن زیاد کو اس کے مر جانے کا اندیشہ ہو گیا۔ اس لیے سیستان اس کو مقید روانہ کر دیا۔ اس وقت قبائل یمن کو جو شام میں مقیم تھے اس کی اطلاع پہنچی۔ ان کے رؤسا یزید کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شاعر کی رہائی کی درخواست کی جب ان کی التجا نے تہدید کا رنگ اختیار کر لیا۔ یزید نے درخواست منظور کر لی اور ابن مفرّغ کو قید سے آزادی دلوا کر موصل میں جگہ دے دی۔

(از رسالہ کادہ)

یہ واقعہ یزید بن معاویہ ۶۰ و ۶۴ ھ کے عہد میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ ابن مفرّغ کی یہ نظم فارسی نظم کی مثالوں میں قدیم ترین نمونہ مانا جا سکتا

ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں وزن اور قافیہ موجود ہے۔ اور عربی اوزان سے اس کا تعلق ہے۔ علاوہ بریں اس کا قائل ایک عرب شاعر ہے۔ اس لیے اس کو فارسی کے قدیم ہجائی طرز کے نمونوں سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔ اس کا وزن ہے۔

آبست مفعول بہ بذست مفاعیل عصارات مفاعیل زبیب است مفاعیل سمیۂ رو مفاعلن بپندست مفاعیل۔

یہاں پہلے شعر کے صدر و ابتدا میں موفور اور اخرب جمع ہو گئے ہیں۔ جو قدما کے نزدیک بالکل جائز تھا۔

طبری کی تاریخ کبیر میں ۱۰۸ھ کے وقائع کے ذیل میں ایک اور تاریخی واقعہ جو ہماری تلاش پر کسی قدر روشنی ڈالتا ہے نظر افروز ہوتا ہے جس کو مختصراً یہاں درج کیا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ :-

اس سال ابو منذر اسد بن عبداللہ القسری والیے بلخ نے ختلان پر لشکر کشی کی اور خاقان ترک کے ساتھ مصروف کارزار ہوا۔ خاقان نے اس کو شکست فاش دی۔ اسد بن عبداللہ بحالت تباہ واپس بلخ آ گیا۔ بلخیوں نے جن کے جذبات ہمدردی صریحاً خاقان کے ساتھ معلوم ہوتے ہیں۔ اپنے والی کی اس ہزیمت کو فارسی اشعار میں شہرت دی۔ اور لڑکے کوچہ و بازار میں یہ نظم گاتے پھرتے تھے :-

زخستلاں آمدیہ　　بروتباہ آمدہ

ابار باز آمدہ　　خُنگ نزار آمدیہ

یہ بحر برج مربع مجنوں ہے۔

کتاب المسالک والممالک ابن خردادیہ (حدود ۲۳۰ھ ص ۲۶ طبع لیڈن)

ابوالتقی العباس بن طرخان ؟ کے شہر سمرقند کے متعلق یہ اشعار ملتے ہیں جو مثنوی کی طرز میں ہیں :-

سمرقند کند مند　　بزینت کی فگند

از شاش نہ بہی　　ہمی شہ نہ جہی

ابوالتقی عباس کے حالات معلوم نہیں کہ کس زمانے سے اس کا تعلق ہے۔ اور عربی کاتبوں نے ان اشعار کا ستیاناس کردیا ہے کہ وزن کا سراغ لگانا بجائے خود ایک دشوار کام ہے۔

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جاچکا ہے۔ عربی طرز میں فارسی نظموں کا رواج غالباً عربوں سے شروع ہوتا ہے۔ ابن المفرّغ کے علاوہ ایک اور شاعر محمد بن البعیث بن جلیس متوفی ۲۳۵ھ ہے۔ جس کے لیے طبری (سلسلہ ۳، صفحہ ۱۳۸۸) کہتا ہے :-

"حکایت کرد مرا کہ در مراغہ جمعے از پیراں آنجا اشعار فارسی از ابن البعیث برائے او خواندند"

ابوالاشعث قمی کے فارسی ابیات کا ذکر معجم الادبا (طبع لیڈن جلد ۶ صفحہ ۱۲۳) میں آتا ہے۔ جہاں کہا گیا ہے کہ ابو مسلم محمد بن بحر اصفہانی نے (صفحہ ۲۵۴، صفحہ ۳۵۴) ان اشعار کے متعلق چند بیت لکھے تھے:

میر قدرت اللہ خاں قاسم

اور

اُن کی تالیف مجموعہ نغز

ان کی کنیت ابوالقاسم عرف میر قدرت اللہ خاں قادری قاسم تخلص ہے۔
[...]ر تذکرہ نگار "خان" کا لفظ ان کے نام کے ساتھ اضافہ کرتے ہیں۔ حضرت امام
[...]ضا کی اولاد سے ہیں۔ ان کے سر برآوردہ بزرگوں میں ایک تو سید اسمٰعیل
[...]ر بندی ہیں۔ دوسرے سید فاضل گجراتی ہیں جو قصبۂ گجرات شاہ دولہ پنجاب
[...] تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا مکان گجرات میں لوہاروں کے محلے میں تھا اور قبر
[...]ی وہیں ہے جو زیارت گاہ خلائق ہے۔ مصنف کا بیان ہے کہ "یزارد
[...]رک بہ" (صفحہ ۹۳ جلد دوم، مجموعۂ نغز)
حکیم صاحب نے اپنے خاندانی حالات کا مطلق ذکر نہیں کیا ہے۔ صرف

اسی قدر کہا ہے کہ اب صرف فتح علی خاں حسینی جو ایک شیخ باکمال ہیں اور جن کا ذکر اس تصنیف کے علاوہ کرامات پیرانِ پیر میں بھی آتا ہے۔ ان کے بزرگوں کے جاننے والوں میں باقی رہ گئے ہیں۔ چنانچہ کرامات پیرانِ پیر میں ہے۔ ؎

نہیں کوئی اس کے سوا آج کل　　بزرگوں سے واقف مرے اے اجل
شناسا بڑوں کا اب اس کے سوا　　نہیں کوئی باقی رہا دوسرا
وہی آج آگاہ ہے بے گماں　　حسب اور نسب کا مری دوستاں

اس اشارے سے ہم اس قدر اخذ کرتے ہیں کہ وہ ایک شریف اور ممتاز خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے۔ تذکرہ نگار ان کے نام کے ساتھ "خان" کا لفظ بھی ضم کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ سرکار شاہی سے یہ خطاب ان کے بزرگوں کو عطا ہوا ہے۔ اور وراثتاً ان تک پہنچا ہے یہ امر بھی ان کی شرافت خاندانی کی دلیل ہے۔ ان کا آبائی پیشہ درس و تدریس و تعلیم و تعلم کے علاوہ درویشی اور پیری مریدی تھا۔ شیخ عبدالقادر جیلانی سے ان کے خاندان کو خاص ارادت تھی اور ان کے والد کی بھی انھیں یہی نصیحت تھی کہ وہ ہمیشہ قادری رہیں۔ چنانچہ حکیم صاحب اپنی مثنوی کرامات پیرانِ پیر میں فرماتے ہیں ؎

کہ بادا بروز رحمتِ کردگار　　ہمیشہ اسے والدِ نامدار
جو بعد ائمہ تو اے نیک خو　　یہ کرتا نصیحت بدل دوستو

شہنشاہِ بغداد کو راہ بر ۔ دل وجان سے جانِ جانِ پدر
کہ ہیں تیرھویں وہ امامِ ہدیٰ ۔ سدا بوجھ سب کا انھیں پیشوا

حکیم صاحب اس نصیحت پر مدّت العمر عامل رہے اور ہر بارھویں تاریخ کو بڑے پیر کی فاتحہ دلواتے رہے۔ مصنّف نے اپنے والد کے ذکر کے متعلق بھی خاموشی سے کام لیا ہے۔ صرف اسی قدر کہا ہے کہ میری عمر کے آٹھویں سال میں ان کا انتقال ہوتا ہے۔ چنانچہ

ہوا اور برس آٹھویں یہ یتیم ۔ گیا جب جہاں سے وہ ناصح کریم

والد کی رحلت سے تین سال بعد میر فتح علی خاں حسینی ان کو لے جا کر مولانا فخرالدین کے مدرسہ میں داخل کرا دیتے ہیں۔ چنانچہ کرامات پیرانِ پیر میں ہے ؎

جہاں تھے وہ صد فخر قطب کبیر ۔ مجھے لے گیا وہ جوانمرد پیر
مری آمد و شد ہوئی گرم یار ۔ جب اس مدرسہ میں بصد انکسار

حکیم صاحب چونکہ ابھی کم سن تھے۔ ان کی عمر مشکل سے گیارہ سال کی ہوگی اس لیے مولانا فخرالدین نے انھیں سیّد احمد ابا حسن کے حوالے کر دیا تھا جو اسی مدرسہ میں ایک مدرس اور مولانا کے مرید و جانشین تھے۔ کرامات پیرانِ پیر:۔

مجھے حضرت شیخ نے جان خرد ۔ وہ استاد جن کے کیا تھا سپرد
نہایت بزرگ و بزرگی شعار ۔ وہ تھا سیّد پاک و عالی تبار

وہ رکھتے تھے از بسکہ خلق حسن — بکنیت تھے کہتے انھیں باحسن
فنا شیخ میں تھے ہوئے مو بمو — گویا حضرتِ فخر تھے ہو بہو
پس از رحلتِ شیخ قربت دثار — خلافت ہوئی ان کو صدیق وار
باجماع یاران و پاکیزہ دین — محب نبی کے ہوئے جانشین

اس عہد کے طلبا کی سادہ زندگی کا ہم ایک امر سے اندازہ کر سکتے ہیں۔ جو مصنّف نے اپنی اسی نظم میں اتفاقیہ ذکر کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں صبح سے لے کر شام تک ایک لمحہ کے لیے بھی کتاب کو اپنی آنکھ سے اوجھل نہیں ہونے دیتا تھا۔ علی الصباح اٹھا۔ آٹا گوندھا۔ اس کا ایک پیڑا بنایا اور جا کر تنور پر لگوا لیا۔ اور کھا پی کر دن بھر پڑھنے میں مصروف رہا۔

نہ چھٹتی تھی مجھ سے کتاب ایک پل — کہ کرنا تھا مشکل مسائل کو حل
غرض شام سے صبح تک میں بکد — مطالعہ کناں تھا اے اہلِ خرد
لے ایک ساتھ آٹے کا پیڑا میں خام — علی الصبح پڑھنے کو جاتا مدام
پکا اُس کو تنور سے اور کھا — میں تا شام پڑھتا پڑھاتا سدا
مجھے بس کہ مقصود میاں علم تھا — میں تھا پیچھے باندھ اس کے آٹا پڑا
کبھو ہی میں ناغہ نہ کرتا سبق — بلا ناغہ پڑھتا ورق دو ورق

ان ایام میں حکیم صاحب اپنا اکثر وقت اپنے استاد اور مولانا فخرالدین کی معیّت میں گزارتے۔ جب یہ بزرگ زیارات کے لیے جاتے۔ یہ اپنے سبقوں میں

ناغہ ہو جانے کے ڈر سے ساتھ ساتھ رہتے۔ زیارتیں بھی کرتے اور موقع پاکر سبق بھی پڑھ لیتے۔

توجوں سایہ ہمراہ شیخ اے جواں — زیارت کو پیروں کی پھرتے دواں
سمجھ اپنی تحصیل میں یہ فتور — سدا ساتھ رہتا میں باصد سرور
جہاں وقت فرصت کا ملتا مجھے — میں لیتا سبق پڑھ وہیں لطف سے
زیارات تھے مجکو مفت اے پسر — میسّر بہم تھے یہ شیر و شکر

اسی زمانے میں حکیم صاحب کے نانا کو امیر الامرا نجیب الدولہ بہادر کی سرکار سے توسل تھا۔ نانا کی کوئی جاگیر تو تھی نہیں۔ مگر امیر الامرا ان کے ساتھ مروّت سے پیش آتے اور سلوک کرتے رہتے تھے اور ایام طالب علمی میں یہی نانا ہمارے مصنّف کے کفیلِ معاش تھے۔

نجیبِ زماں تھا وہ خانِ زماں — کہ تھی دولت و جاہ کی اس کے شاں
وہ تھا دیندار اس قدر اے عزیز — کہ عہد اس کے میں با ہزاراں تمیز
ہوئے لاکھا حافظِ باوقار — ہزاروں ہی فاضل ہوئے نامدار
یہ قاسم بھی میاں اس کے ہی جود سے — ہوا ہے کچھ آگاہ شد بود سے
کہ نانا سے اس کے وہ صاحب کرم — مروّت سے کرتا تھا کچھ بیش و کم
عوض اس کی جاگیر کے یہ امیر — کرے تھا تواضع قلیل و کثیر
یہ تھا حال پر اس کے حد مہرباں — وہ تھا اس کے الطاف سے کامراں

میں سدرمق کھا کے نانا کے ساتھ　　　شب و روز مشغول تھا علم ساتھ

نجیب الدولہ کے متعلق ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ وہ علی محمد خاں کے زمانہ میں روہیلکھنڈ پہنچے۔ کچھ عرصے بعد وہاں سے قطع تعلق کر کے وزیر غازی الدین کی وساطت سے دہلی آ گئے۔ جب نواب صفدر جنگ نے دربارِ دہلی سے مخالفت کی ۱۱۶۷ھ میں نجیب الدولہ نے صفدر جنگ پر حملہ کر کے اس کو دریائے گنگا عبور کرنے پر مجبور کیا۔ اس معرکے میں نجیب الدولہ خود بھی زخمی ہوئے تھے۔ احمد شاہ بہادر نے اس حسن خدمت کے صلہ میں ان کو نجیب الدولہ کا خطاب دیا۔ عالمگیر ثانی کے دور میں احمد شاہ ابدالی نے انھیں بادشاہِ دہلی کا امیر الامرا مقرر کیا۔ لیکن شاہ موصوف کی واپسی قندھار پر جو ۱۱۷۰ھ میں ہوئی۔ غازی الدین خاں وزیر نے یہ منصب ان سے لے کر احمد خاں بنگش والی فرخ آباد کو تفویض کر دیا۔ نجیب الدولہ ۱۱۷۴ھ کی جنگ پانی پت میں بھی شریک تھے۔ اس جنگ کے اختتام پر احمد شاہ ابدالی نے بوقت واپسی دوبارہ ان کو امیر الامرا بنا دیا۔ اور شہر دہلی اور شاہی خاندان کی حفاظت ان کے سپرد کر دی۔ نجیب الدولہ نے اپنے زمانۂ امیر الامرائی میں دہلی اور بقیہ اضلاع کا جو اس وقت شاہانِ دہلی کے قبضے میں تھے بوجہ احسن انتظام کیا اور رجب ۱۱۸۴ھ میں اس دارِ فانی سے رحلت کی۔

اس بیان سے ظاہر ہے کہ نجیب الدولہ ۱۱۷۴ھ سے دہلی میں رہنے لگے ہیں۔

اور اپنی وفات کے سال ۱۲۸۴ھ تک یہیں رہے۔ یہی زمانہ ہے جب ہمارا مصنّف شہر دہلی میں اپنی طالب علمی کا زمانہ مولانا محمد فخر الدین کے مدرسہ میں گزار رہا ہے۔ جب ان ایّام میں وہ طالب علم ہے اور ۱۲۴۶ھ میں انتقال کرتا ہے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ ایک بڑی عمر کا جو تقریباً اسّی سال ہوگی مالک تھا۔

معقول و منقول میں حکیم صاحب مولانا فخر الدین اور خواجہ احمد خاں کے شاگرد ہیں۔ مولوی محمدی ملقب بہ میاں صاحب بسمل تخلص سے مختصر وقایہ۔ مختصر معانی مطول و شرح عقائد نسفی پڑھی ہیں (مجموعۂ نغز۔ صـ ۱۰۴) فنِ طب میں رئیس الحکما و شریف الاطبا حکیم محمد شریف خاں کے اور فنِ شعر میں ہدایت اللہ خاں ہدایت کے تلمیذ ہیں۔

حکیم صاحب کسی کے ملازم نہیں تھے۔ اور طبابت ذریعۂ معاش تھی۔ مولوی کریم الدین تاریخ شعرائے اُردو میں لکھتے ہیں "علم طب خوب ان کو آتا تھا۔ علاج بیماریوں کا کیا کرتے تھے (صـ ۳۱۹) صاحب گلستانِ سخن ان کو "حکیم کامل اور طبیب فاضل" کے معزز الفاظ سے یاد کرتے ہیں (صـ ۴۰۳) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت اچھے طبیب تھے۔

ان کی زندگی ایک بے انقلاب زندگی معلوم ہوتی ہے جو طبابت اور شعر کی خدمت میں خاموشی کے ساتھ بسر ہو گئی۔ ابتدائے شعور سے انھیں شعرگوئی کا شوق تھا۔ مشاعروں میں ضرور حاضر رہتے۔ امیر الامرا نجیب الدولہ کے

عہد میں میر محمدی شرف کے ہاں محفلِ مشاعرہ منعقد ہوا کرتی تھی۔ حکیم صاحب ان ایام میں محض بتدی فن تھے۔ لیکن مشاعرے میں ضرور شامل ہوا کرتے۔ فرماتے ہیں :۔

" در ایّام دولت نواب معلےٰ القاب نجیب الدولہ بہادر عفی اللہ عنہ طرح مراختہ بخانہ خود می انداخت۔ قاسم ہیچمدان سراپا نقصان کہ دران اوان بتدی ایں فن بود بمجلس وے حاضر می شد۔ (ص ۳۴/۱)

اسی زمانے میں میاں مصحفی دہلی میں مقیم تھے اور اپنے گھر مشاعرے کراتے تھے۔ حکیم صاحب ان مشاعروں میں بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں :۔

" در زمانے کہ وارد حضرت دہلی بود یک چند طرح مراختہ بخانۂ خود انداختہ با قاسم ہیچمدان سراپا نقصان کہ اکثر بمشاعرہ اش میرفت بسیار باہلیت و آدمیت پیش می آمد۔" (ص ۱۸۹/۱)

معلوم ہوتا ہے کہ اسی عہد میں استاد ہدایتؔ کی شاگردی اختیار کی ہے۔ ہدایتؔ کے ذکر میں کہتے ہیں :۔

" قاسم ہیچمدان سراپا نقصان باوصف صحبت مستوفی در عرض چہل سال تخمیناً گاہے ندیدہ کہ از وے کسی رنجیدہ" ص ۳۱۷/۲

اس میں چالیس کے زمانے کی طرف جو اشارہ ہے وہ تذکرۂ ہذا کی تحریر کے وقت یعنی ۱۲۲۱ھ میں کیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ (۱۱۸۱ = ۴۰ - ۱۲۲۱) ۱۱۸۱ھ میں حکیم صاحب استاد ہدایت سے تعلق میں آئے ہیں۔ اور غالباً اسی زمانے میں وہ ان کے شاگرد بنتے ہیں۔

نوعمری میں جو زلفِ سخن کے سنوارنے کا لپکا پڑا ہے مرتے دم تک نہیں چھوٹا۔ مشاعروں میں ان کی حاضر باشی ضروری تھی۔ کثرتِ مشق سے استادوں میں شمار ہونے لگے اور فنِ شعر کے ماہر تسلیم کر لیے گئے۔ انہی مشاعروں کی بدولت میر انشاء اللہ خاں انشا سے ان کا اور عظیم بیگ عظیم کا بگاڑ ہو جاتا ہے۔ حکیم صاحب کی سلیم الطبعی اور سلاست مزاج سے توقع نہیں ہو سکتی کہ وہ خود کسی معاملہ میں پہل کرتے۔ انشا کی شوخ اور ہنگامہ زا طبیعت ادھر مرزا کی خود بینی اور بد دماغی زیادہ تر اس ادبی معرکہ کی ذمّہ دار ہے۔ حکیم صاحب براہِ راست کوئی فریق نہیں تھے۔ لیکن مرزا عظیم کی رفاقت کی بنا پر انھیں اس جنگ میں حصّہ لینا پڑا۔ یہ شعری رزم جس میں انشا کی طرف سے بعض ناجائز امور کی حد تک اقدام ہوا ہے۔ مرزا میڈھو کے مشاعرے میں قطعات و غزلیات فخریہ سے گزر کر باقاعدہ میدانِ جنگ کی صورت اختیار کرنے والی تھی۔ جب حکیم صاحب کے سامنے شمع لائی گئی۔ انھوں نے انشا سے خطاب کر کے کہا۔ عمزاد! آپ کی سرکار سے ہمیں مسیلمۂ کذاب کا خطاب عنایت

ہوا ہے۔ بہت اچھا! اب ذرا ہمارے الفیل ما الفیل پر بھی کان دھریئے۔ صاحب مشاعرہ کو گمان گزرا کہ اب کوئی رکیک ہجو پڑھی جانے والی ہے۔ اِدھر سے یہ اور اُدھر سے محب علی محب اُٹھے اور کوشش کر کے فریقین میں صلح کرا دی۔ دونوں طرف شرفا تھے مان گئے۔ معاملہ بخیر و خوبی گزر گیا۔ اور کشت و خون تک نوبت نہیں آنے پائی۔ اس پرخاش شاعرانہ کی یادگار مرزا عظیم بیگ کا وہ مشہور مخمس ہے جس کے شعر ذیل نے ہماری زبان میں ضرب المثل کی عزت، حاصل کر لی ہے۔

شہ زور اپنے زور میں گرتا ہے مثل برق
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تذکرۂ انشا صفحہ ۸۲ و ۸۶)

تذکرۂ ہذا میں بعض اشاروں سے پایا جاتا ہے کہ حکیم صاحب نے بعض اوقات اِدھر اُدھر سفر بھی کیے ہیں۔ کنور پریم کشور فراقی کے ذکر میں کہتے ہیں کہ میں نے اس کے باپ کو بندرابن میں فقیرانہ لباس دیکھا ہے (ص $\frac{48}{2}$) اس سے ان کا بندرابن میں پہنچنا ثابت ہے۔

منت کے تذکرے میں لکھتا ہے کہ میں اور منت ایک ہی گاڑی میں لکھنؤ پہنچے۔ میں واپس چلا آیا اور وہ وہیں رہے۔

" اتفاقاً قاسم ہیچمدان سراپا نقصان ہم سفر آں فصاحت زبان

دریک گردوں تابلدۂ لکھنؤ رسید جامع المتفرقین دیر ادراند ک
فرصت بوطن مالوف رسانید د آن میر میدانِ سخنوری درہماں
(نواح) توطن گزید۔" (ص ۲۱۵/۲)

حکیم صاحب کی شادی مولوی نور احمد صاحب ممتازؔ کی دختر بلند اختر سے ہوئی تھی۔ نور احمد مولوی عبدالوہاب کے فرزند ہیں جو اپنے عہد کے بڑے عالم مانے جاتے تھے۔ خود مولوی نور احمد شاہ عالم ثانی کے ایام شہزادگی میں استاد تھے۔ جب شہزادۂ والا گوہر (شاہ عالم کی شہزادگی کا نام ہے) دیارِ شرقیہ کو چلے گئے۔ مولوی نور احمد کا سلسلہ سلطان ہدایت بخش اور نواب عماد الملک کی سرکاروں میں ہو گیا۔ آخر میں خانہ نشین ہو گئے اور باقی عمر بڑی عزت کے ساتھ گزار دی۔ اہلِ شہر و محلہ مولوی صاحب کی بیحد عزت کرتے تھے۔ یہ اس سے ظاہر ہے کہ جس دن مولوی صاحب کا انتقال ہوا۔ اہلِ بازار نے ان کے احترام میں اپنی دکانیں بند کر دیں اور شریکِ جنازہ ہو گئے اور جب تک مولوی صاحب کو دفن نہیں کر دیا گیا اس وقت تک واپس نہیں آئے۔ (ص ۲۱۰/۲)

اولاد میں حکیم صاحب نے صرف ایک فرزند کا ذکر کیا ہے۔ اور بمصداق 'الولد سر لابیہ' وہ بھی شاعر ہیں۔ ان کا نام عزت اللہ عشق ہے۔ حافظ و قاری ہونے کے علاوہ فنِ طبابت میں صاحب کمال ہیں۔ اور میرزا ولی عہد بہادر (اکبر شاہ ثانی) کے فرزند اکبر مرزا ابو المظفر بہادر شاہ ظفر (ابوظفر سراج الدین محمد

بہادر شاہ پادشاہ) اکے کلام کی اصلاح دیتے ہیں۔ اس موقعہ پر حکیم صاحب کے فقرے سے مترشح ہوتا ہے کہ شاید خود حکیم صاحب بھی شاہی خاندان کی اصلاح دیتے رہتے ہیں۔ ان کے الفاظ ہیں:۔

"اما از برخوردار کامگار میر عزت اللہ عشق مدعمرہ و زاد قدرہ کہ ارثاً سررشتۂ اُستادی ایں دودمان عالیشان دارد استشارہ می فرمایند" (ص ۳۷۳/۱)

ایک احتمال یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عزت اللہ عشق کے نانا مولوی نور احمد شاہ عالم ثانی کے استاد ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ اشارہ اس طرف ہو۔ بہرحال استاد ذوق سے پیشتر عشق ظفر کی غزلیات کی اصلاح دیا کرتے تھے۔

حکیم صاحب کے بزرگوں کا پیشہ درس و تدریس اور پیری مریدی تھا۔ آخرالذکر کو ترک کر کے حکیم صاحب نے اس کی جگہ طبابت کا مفید پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ مگر اوّل الذکر تعلیم و تعلم کو معلوم ہوتا ہے کہ برابر جاری رکھا۔ فنِ شعر میں ان کے شاگردوں کی فہرست جہاں تک کہ تذکرۂ ہذا کا تعلق ہے۔ نہایت مختصر ہے۔ لیکن میں ایسے شاگردوں کے نام جن کا ذکر اتفاقیہ اس تذکرے میں آگیا ہے۔ خواہ وہ مکتبی شاگرد ہوں یا فنِ شعر کے یا محض کتابی تکرار کرنے والے یہاں درج کیے دیتا ہوں۔

(۱) آفاقؔ۔ میر فریدالدین۔ اصل میں حکیم ثناراللہ خاں فراقؔ کے شاگرد ہیں۔

لیکن استاد کے کہنے سے حکیم صاحب کو بھی اپنا کلام دکھا دیا کرتے ہیں۔ (ص ۳۷/۱)

(۲) احسنؔ۔ احسن اللہ۔ حکیم صاحب ہی کے شاگرد ہیں۔ (ص ۵۴/۱)

(۳) اشرفؔ۔ غلام اشرف۔ منجملہ دیگر کمالات علم موسیقی ہیں پوری دست گاہ رکھتے ہیں۔ ساز سندر بین ان کی ایجاد ہے۔ بعض علوم عربیہ کے علاوہ ریختہ ہیں بھی حکیم صاحب سے اصلاح لیتے ہیں۔ ان کی لاابالیانہ طبیعت کے حکیم صاحب شکوہ سنج ہیں۔ کہتے ہیں کہ اب تو وہ اپنا کلام مجھے دکھائے بغیر غیر ذمّہ دارانہ طریق پر لوگوں کے سامنے پڑھ دیتے ہیں۔ (ص ۶۲/۱)

(۴) افسوسؔ۔ غفور بیگ۔ اصل ہیں استاد ہدایت کے تلمیذ ہیں۔ لیکن استاد کی غیبت ہیں اپنا کلام فراقؔ اور حکیم صاحب کو دکھا لیا کرتے ہیں (ص ۶۶/۱)

(۵) بیانؔ۔ خواجہ احسن اللہ خاں۔ مصنّف کے ساتھ بلاناغہ سبق کی تکرار کرتے رہے ہیں (ص ۱۲۳/۱)

(۶) تنہاؔ۔ ایک افغان زادہ تھا۔ عین عالم شباب ہیں انتقال کیا۔ اپنا کلام کبھی حکیم صاحب کو اور کبھی فراقؔ کو دکھاتا رہا ہے۔ (ص ۱۴۸/۱)

(۷) حفیظؔ۔ حافظ محمد حفیظ۔ کشمیری الاصل اور دہلوی المولد ہے۔ اپنا کلام کبھی فراقؔ کو کبھی حکیم صاحب کو دکھاتا رہا۔ بعد میں عشقؔ سے

مشورہ کرنے لگا۔ (ص ۲۱۳/۱)

(۸) راقم۔ غلام محمد ہفت قلم۔ مصنف مشہور تذکرہ خوشنویساں مجموعۂ نغز کی تالیف سے بارہ تیرہ سال پیشتر جب راقم لکھنو نہیں گیا تھا۔ حکیم صاحب سے شرح شمسیہ اور حاشیۂ میر پڑھتا رہا ہے۔ اور شعر میں بھی اصلاح لی ہے (ص ۲۶۴/۱)

(۹) شفیق۔ مظہر علی خاں۔ مشق سخن فراق سے کرتا رہا ہے۔ لیکن حکیم صاحب اور ان کے فرزند عشق سے بھی استفادہ کیا ہے۔ (ص ۳۲۴/۱)

(۱۰) نیاز۔ میاں نیاز احمد شاعر مشہور۔ حکیم صاحب کے ساتھ بعض کتابوں کی تکرار کی ہے (ص ۳۸۸/۲)

(۱۱) سرور۔ میر فیض علی۔ سید ابراہیم کی اولاد سے ہے۔ جو سید شمس الدین کے بھائی ہیں۔ ان کا مزار دہلی سے دو منزل پر قصبۂ اجڑاڑہ میں واقع ہے۔ سادات کبرویہ میں سے ہیں اور طریق شطاریہ پر عامل ہیں۔ ان کے مزار پر ذیقعد کی سترھویں تاریخ سے بیسویں تک سالانہ عرس ہوتا ہے۔ جس میں قرب وجوار کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔ یہ سرور علوم عقلیہ ونقلیہ کی تحصیل کے لیے اپنے وطن سے آکر حکیم صاحب کے ہاں مستقلاً مقیم ہو گیا ہے اور پوری سرگرمی کے ساتھ اپنی تعلیم میں مصروف رہے۔ (ص ۳۸۹/۲ تکملہ)

حکیم صاحب کا شمار چوٹی کے شعرا میں نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے کلام کا جوہر شستگی اور روز مرہ کی صفائی ہے۔ کثرتِ مشق نے کلام کو پختگی کی حد تک پہنچا دیا ہے۔ مگر ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ شاعری اس میں بہت کم پائی جاتی ہے۔ ان کے پُر گو ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ جیسا کہ ان تصنیفات سے ظاہر ہے۔ اس تذکرہ کی تالیف کے وقت ایک ضخیم دیوان ختم ہو چکا ہے۔ جس میں سات ہزار اشعار ہیں۔ اس کے علاوہ بحر رمل، مسدّس محذوف میں ایک معراج نامہ لکھا جا چکا ہے۔ جس کے ابیات کی تعداد تین ہزار پانسو ہے۔ (صہ ۹۳ جلد دوم)

سنہ ۱۳۱۷ھ میں ایک مثنوی بوزن شاہنامہ شیخ عبد القادر جیلانی کے حالات و کرامات میں موسوم بہ کرامات پیرانِ پیر ختم کر چکے ہیں جس میں پانچ ہزار دو سو اشعار ہیں اور بشرط زندگی ارادہ کر رہے ہیں کہ غزوۂ بدر کو نظم کے قالب میں ڈھالیں۔

کرامات پیرانِ پیر کے سوا باقی تالیفات راقم کی نظر سے نہیں گزری ہیں۔ یہ مثنوی نواب صدر یار جنگ بہادر کے کتب خانہ واقع حبیب گنج میں محفوظ ہے۔ اور وہیں راقم کو حکیم صاحب کی اس متبرک تالیف کی زیارت کا موقع پہلی مرتبہ ملا۔ گزشتہ سطور میں حکیم صاحب کی زندگی پر روشنی ڈالنے والے بعض اشعار اسی مثنوی سے ماخوذ ہیں۔

یہ مثنوی گویا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی جناب میں مصنّف کی انتہائی عقیدت مندی کی ایک یادگار ہے۔

لیکن حکیم صاحب کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ جس کی بنا پر انھیں ہمارے ادبیات کی تاریخ میں ایک ممتاز جگہ مل گئی ہے۔ ان کی موجودہ تالیف مجموعۂ نغز ہے۔ اس قابلِ قدر تالیف کی اہمیّت اور اس کا صحیح رتبہ معلوم کرنے کے لیے ہمیں اس شاخِ ادب کی ان مصنّفات کا ذکر کرنا ہوگا۔ جو اس تذکرے سے پیشتر عالمِ وجود میں آچکی ہیں۔ اور جن کے متعلق ہمیں کچھ علم ہے۔

سنہ ۱۱۶۵ھ میں نکات الشعراء اور تذکرۂ علی حسینی گردیزی۔ سنہ ۱۱۶۸ھ میں مخزنِ نکات۔ سنہ ۱۱۷۵ھ میں چمنستانِ شعرا۔ سنہ ۱۱۸۸ھ و سنہ ۱۱۹۲ھ کے مابین میر حسن کا تذکرہ۔ سنہ ۱۱۹۳ھ میں تذکرۂ شورش۔ سنہ ۱۱۹۶-۹۵ھ میں گلزارِ ابراہیم۔ سنہ ۱۲۰۸ھ میں تذکرۂ مصحفی۔ گلشنِ ہند۔ سنہ ۱۲۱۵ھ میں اور تذکرۂ عشقی اسی سن کے عنقریب بعد مرتب ہو چکے ہیں۔ مجموعۂ نغز ان تالیفات کے مقابلے میں یقیناً ایک مبسوط اور ضخیم تالیف ہے۔ لیکن دو اور تذکرے ہیں جو ضخامت اور حجم کے اعتبار سے اس پر فضیلت رکھتے ہیں۔ چونکہ ہمارے تذکرے کا ان کے ساتھ قریبی تعلق بتایا جاتا ہے اس لیے ان کا ذکر کسی قدر تفصیل سے کیا جاتا ہے۔

ان میں ایک تو عیار الشعرا از خوب چند ذکا ہے۔ جو ۱۲۰۸ھ یا ۱۲۱۳ھ میں شروع ہوا۔ اور مؤلف برابر تیس سال تک اس میں اضافے کرتا رہا۔ آخری تاریخ ۱۲۱۳ھ بتائی جاتی ہے۔ اس تصنیف میں پندرہ شاعروں کا ذکر ہے۔ اور ایک ہزار صفحات ہیں۔

دوسرا تذکرہ عمدۂ منتخبہ از اعظم الدولہ سرور ۱۲۱۶ھ کی تالیف ہے۔ اور بارہ سو شعرا کے حالات پر شامل ہے۔

اب مجموعۂ نغز کی باری آتی ہے۔ یہ تالیف چھ سو ترانوے ریختہ نگاروں کے حالات اور آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۲۲۱ھ اس کی تاریخ اختتام ہے۔ اگرچہ اس تاریخ سے بہت عرصہ پہلے اس کی داغ بیل پڑ چکی ہے۔

اسپرنگر جس کے سامنے یہ تذکرے موجود ہیں، کہتا ہے کہ قاسم کا تذکرہ سرور کے تذکرے پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ ساتھ ہی سرور کی تالیف کو عیار الشعرا کا ایک اصلاح یافتہ مرتبہ کہتا ہے۔ مگر خود عیار الشعرا کی نسبت اس کی رائے بہت بری ہے۔ کہتا ہے کہ اس میں تکرار کے علاوہ ہر قسم کا رطب و یابس اور غیر تنقیدی مواد جمع کر دیا ہے۔ حتیٰ کہ غیر شاعروں کو بھی شاعر لکھ مارا ہے۔ ہم ان دونوں تذکروں سے ناواقفیت کی بنا پر کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے کہ مجموعۂ نغز پر ان تذکروں کا پرتو کس قدر ہے۔ اور مصنف کی اپنی کوشش کا

حصّہ کس حد تک ہے۔ حکیم صاحب ذکاؔ اور سرورؔ کے حالات کے ضمن میں ان کے تذکروں کا ذکر کرتے ہیں۔ مگر ان سے استفادہ کی بابت کچھ نہیں کہتے۔ البتہ ایک امر سے معلوم ہوتا ہے کہ تذکرۂ ہذا میں خود مصنّف کی تحقیقات اور تلاش کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ اسپرنگر جس کے پاس شفیق اور میر حسن کی مولفات کے سوا فہرست بالا کے تمام تذکرے موجود ہیں۔ ریختہ گویوں کی جدید فہرست تیار کرتے وقت جس میں التزاماً یہ اصول مدِّ نظر رکھا ہے کہ ہر شاعر کا ذکر اصل ماخذ سے نقل ہو نہ اس کے کسی ناقل سے۔ "مجموعۂ نغز" کو تین سو بیس شعرائے اردو کے سلسلے میں استعمال کر رہا ہے۔ جس سے صریحاً ظاہر ہے کہ ماخذی اطلاعات کی ایک مقدار اس میں جمع ہے۔ ادھر دتاسی نے اپنی تاریخ شعرائے اُردو میں کثرت کے ساتھ اس سے کام لیا ہے۔ لیکن اس تالیف کی حقیقی وقعت کا اس وقت اندازہ ہوتا ہے۔ جب مولانا محمد حسین آزادؔ کی مشہور عالم تصنیف آبحیات کی ورق گردانی کی جاتی ہے۔ مولانا نے اگرچہ ہر موقعہ پر اس تالیف سے استفادہ کا اظہار نہیں کیا ہے۔ تاہم وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے۔ کہ آبحیات کا ایک بڑا حصّہ اس تذکرے سے ماخوذ ہے۔

یہ تذکرہ جیسا کہ اس عہد کی تالیف کا دستور ہے۔ فارسی زبان میں مرقوم ہے جس میں نثر سادہ و عاری کو موقعہ بموقعہ مرجز و مقفیٰ کے ساتھ آمیز

کر دیا گیا ہے۔ لیکن یہ بدعت آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ محمد شاہ کے زمانے سے لے کر شاہ عالم ثانی کے اختتامِ عہد تک کے شعرا کے حالات و کلام پر یہ تصنیف روشنی ڈالتی ہے۔ مصنف دَور سوم و چہارم کے شعرا سے ذاتی واقفیت رکھتا ہے۔ چالیس سال تک اس نے باغِ سخن کی آبیاری کی ہے۔ شاعروں اور مشاعروں سے واسطہ رکھا ہے۔ اور شعر و غزل کے چرچوں میں اوقات گزاری کی ہے۔ اس لیے اس کو اپنے عہد کے شعرا، ان کے محاسن و اخلاق، قابلیت و استعداد اور جوہر کے کلام کے دیکھنے اور رائے قائم کرنے کا نہایت نادر موقعہ ملا ہے۔

اساتذہ کے اسمار کے ساتھ مصنف نے یہ التزام کیا ہے کہ ہر استاد کے تخلص کا ہم قافیہ جملہ اس کے نام سے پہلے لایا ہے اور پھر یہ فقرہ گاہ گاہ بادنیٰ تغیر ہر جگہ اس نام کے ساتھ دُوہرایا گیا ہے۔ گویا سرکار قاسمی سے خطابات عطا ہوئے ہیں۔ شیخ ظہور الدین حاتم کا نام یوں لکھا ہے:۔

استاد اکثرے از سخن سنجانِ عالم شیخ ظہور الدین حاتم ص ۹۸/۱، ص ۱۴/۱، ص ۲۸۷/۱۔

میرزا مظہر کے لیے۔ سخن سنج ہنر گستر مرزا جانِ جاناں مظہر ص ۱۲۳/۱،

ص ۲۰۰/۱ ، ص ۲۵۴/۱ ۔

سودا کو۔ سرآمد شعرائے فصاحت آما مرزا محمد رفیع سودا ص ۳۰/۱ ، ص ۵۹/۱ ، ص ۱۰۶/۱ ، ص ۲۵۶/۱ ، ص ۳۵۷/۱ ۔

میر صاحب کو۔ سخن سنج بے نظیر محمد تقی میر ص ۱۰۷/۱ ، ص ۱۹۵-۴/۱ ، ص ۳۴۶/۱ ، ص ۳۶۱/۱ ، ص ۳۶۶/۱ ۔

میر درد۔ مملکت سخن سازی رایکہ تاز مرد خواجہ میر درد ص ۲۴/۱ ، ص ۱۲۶/۱ ، ص ۱۷۷/۱ ، ص ۲۶۷/۱ اور سخن سنج روشن ضمیر حضرت خواجہ میر ص ۲۷۷/۱ ، ص ۲۸۹/۱ ، ص ۲۴۰/۱ ، ص ۲۳۵/۱ سے بھی خواجہ میر درد مُراد ہیں ۔

میر سوز۔ شاعر فصاحت افروز محمد میر سوز ص ۳۴/۱ ، ص ۸۰/۱ ، ص ۲۰۳/۱ ص ۲۷۶/۱ وغیرہ ۔

ہدایت ۔ استاد صاحب درایت ہدایت اللہ خاں ہدایت ص ۱۹/۲ ص ۲۴/۲ ، ص ۸۲/۲ وغیرہ ۔

فراق ۔ دوستدار (محب) سراپا وفاق حکیم ثناء اللہ خاں فراق ص ۱۲۶/۱ ، ص ۲۷۴/۱ ، ص ۳۵۴/۱ ، ص ۳۶۶/۱ ۔

مشہور اور پایہ کے شعرا کے نمونۂ کلام کثرت کے ساتھ اشعار نقل کیے ہیں۔ ان کے حالات کے سلسلے میں اگرچہ چنداں اہتمام نہیں کیا گیا ہے۔ تاہم اور تذکروں کے مقابلے میں ہمارے مؤلف کی

مساعی بارآور مانی جاسکتی ہے۔ شعراء کی تاریخ وفات و حیات اگرچہ درج نہیں ہے۔ تاہم ایسے امور موجود ہیں جن سے ان کے زمانوں کے متعلق غلطی کا احتمال باقی نہیں رہتا۔

تذکرہ کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ اگرچہ مشغلۂ شعر کے خلاف تھا۔ اور سیاسیات کے مطلع پر فتنہ و آشوب کی گھنگھور گھٹائیں ہر وقت چھائی ہوئی تھیں۔ احمد شاہ ابدالی کی آمد اور بعد کے سیاسی واقعات نے مغلیہ سلطنت کے شیرازہ کو درہم و برہم کردیا ہے۔ دہلی ویران ہو رہی ہے۔ اور اس کے فرزند تلاش معاش میں دربدر اور خاک بسر پریشان حال پھرتے ہیں۔ لیکن راجا سے پرجا تک جس کو دیکھو شوق شعر میں ڈوبا ہوا ہے۔ ذکور و اناث اور عامی و عالم اس کی چیٹک سے خالی نہیں۔ مسلمان اور ہندو بلکہ فرنگی زادوں تک یہ ذوق سرایت کر گیا ہے۔ سلاطین و عمال۔ امراء و علماء، سپاہ و اہلِ دیوان کے علاوہ ہر طبقہ کے پیشہ وروں پر شاعری کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ مثلاً منیر صیقل گر ہے۔ اگرچہ اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ محمد امان نثار معمار ہیں۔ جامع مسجد دہلی انہی کے بزرگوں کی بنائی ہوئی ہے اور یہ خود بھی اسی پیشے سے بسر اوقات کرتے ہیں۔ یہ وہی نثار ہیں جنھوں نے میر تقی میر کے اژدر نامہ کے جواب میں بدیہہ نظم پڑھ کر اہلِ مشاعرہ سے

خراجِ تحسین وصول کیا تھا۔ اسی طرح حسین بخش بخشؔ پارچہ فروش ہے۔ مدسنگھ شگفتہؔ آہن گر ہے۔ خواجہ ہیلنگا شیداؔ علاقہ بند ہے۔ میر صادق علی صادقؔ فیل بان ہے۔ شنبھوناتھ عزیزؔ مہاجن ہے۔ میر لطیف علی لطیفؔ جواہرات کا دلال ہے۔ اور مغل علی خاں مغلؔ علاقہ بند و سوداگر۔ بدرالدین مفتونؔ بزاز اور یکرنگ سُنار ہے۔ محمد ہاشم ثنائیؔ خیاط ہے۔ اس کے ساتھ مرثیہ خوانی کی خدمت کو بھی ضم کر لیا ہے۔ اور کافی شہرت رکھتا ہے۔ محمد عارف رفوگر ہے۔ عنایت اللہ عرف کلّو حجامؔ[۱] ہے اور حضرت مولانا محمد فخرالدین کی سرتراشی کرتا ہے۔ شہر میں میاں کلّو کو مرزا سوداؔ کے تلمذ پر فخر ہے۔ مذاق سخن اس قدر بلند ہے کہ سوداؔ کے سوا کسی کو شاعر بھی تسلیم نہیں کرتے۔ غلام ناصر جرّاح ہے۔ مقصودؔ ایک سقّہ ہے جو فن شعر میں بازار کے لونڈوں کا استاد ہے۔ قرینؔ ایک خاکروب ہے۔ اگرچہ تکملہ میں درج کرتے وقت مصنّف نے اس کے اصل پیشے کا ذکر ترک کر دیا ہے۔

اسی طرح ہر وضع و قماش کے شعر گو موجود ہیں۔ ثقہ و سنجیدہ نگار سے لے کر رندا و باش، ہزال و پواج اور فحش گو اپنی اپنی بولی بول رہے ہیں۔

۱ے سر میاں حجام بہتوں کا پھریں تھے مونڈتے آج اس کوچے میں انکی بھی حجامت ہو گئی

آجکل کے خوبرو دیکھو تو ہیں یہ سکھ بچے ان تلک حجام ہی پہنچے نہ یہ حجام تک

(اختر شیرانی)

شلاً جعفر زٹلی اٹل (امیر عبد الجلیل بلگرامی) محمد عطا بانکہ۔ صاحب قران۔ شہوت وغیرہ۔ موخر الذکر کو شاہ عالم ثانی نے مسخرۃ الدولہ قزساق خان بہادر پھکڑ جنگ کا مناسب خطاب عنایت کیا تھا۔ بعض نے عجیب عجیب تخلص اختیار کیے ہیں۔ کوئی اوباش ہے کوئی عیاش ایک عشاق ہے اور ایک کافر ہے۔ یہ بزرگ اپنے اشعار کو کافر کٹہ کے خطاب سے یاد کرتے ہیں۔ پنچھا، جھبنا، مکھو وغیرہ بھی اسی قسم کے نام ہیں۔

احمد نگر، فرخ آباد، رامپور، لکھنؤ، عظیم آباد، مرشد آباد اور حیدر آباد وغیرہ شاعری کے مرکز ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ طاقتور مرکز دہلی ہے۔ مشاعرے کثرت سے ہوتے ہیں۔ اور ہر فرقہ وخیال کے لوگ اس میں حصہ لیتے ہیں۔

حکیم صاحب دشتِ سخن کے پرانے سیاح ہیں۔ ان کی تمام عمر شعرا اور شاعروں کی صحبتوں میں گزری ہے۔ اس لیے ان کی رائیں شعرا کے کلام اور مقام کے متعلق قابلِ احترام ہیں۔ باوجودیکہ اس تذکرہ میں سینکڑوں شعرا کا ذکر ہے۔ ان میں ایسے بھی ہوں گے جن کے ساتھ بمقتضائے بشریت معاصرانہ چشمک اختلاف اور عداوت بھی ہو گی۔ لیکن ہر ایک کے ذکر میں واقعہ نگاری کے فرائض کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے اور

حق گوئی اور انصاف پسندی سے تجاوز نہیں کیا ہے۔ تقریباً ہر شخص کو نیکی کے ساتھ یاد کیا ہے۔ یہ امر ان کی نیک دلی اور سلیم الطبعی کی روشن دلیل ہے۔

انشاءاللہ خاں انشؔا کے ساتھ اگرچہ ان کے جھگڑے رہے شعروں میں نوک جھونک ہوتی رہی۔ فخریے اور ہجویں لکھی گئیں آخر معاملہ تیغ زبان سے گزر کر زبانِ شمشیر تک پہنچا۔ ان امور کے جاننے کے بعد خیال گزرتا ہے کہ حکیم صاحب نے اپنی تالیف میں انشؔا کے باب میں آفت توڑی ہوگی۔ ان کی سیرت و اخلاق اور زندگی کی تصویر نہایت بھونڈی اور بھیانک اُتاری ہوگی۔ لیکن دیکھا جاتا ہے کہ ان کے قلم نے اپنی فرض شناسی سے مطلق تزلزل نہیں کیا ہے۔ بلکہ انشا کی سیرت کے کمزور پہلوؤں کو بھی اچھی طرح واضح نہیں کیا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ انشؔا، ٹھٹول، شوخ اور ہنگامہ آرا تھے لیکن ان کی ستیزہ کاری کے قصّوں کی تحریر کے وقت بھی ہمارے مصنّف کا رویہ تعجب کی حد تک اغماض اور چشم پوشی کو کارفرما ہے۔ انشؔا اور مصحفؔی کے معرکہ کے سلسلے میں لکھتے ہیں:۔

"اما ازانکہ بے عیب ذاتِ خداست تعالیٰ شانہ اعظم برہانہ"۔ ماہ تمام باایں رفعت نام ونور باخنی داغ سیاہ برجگر

دارد و قاسم ناتمام بایں مسکنت مالاکلام و وارستہ معاشی واقعہ نویسی راحیلہ ساختہ بعیب چینی آں بدر منیر سپہر شرافت می پردازد۔ بنابر مقتضائے بشری اندکی شوخ طبع و ہنگامہ آرا و خود بیں واقع شدہ در بلدۂ لکھنؤ بمشاعرہ مرشد معظم الیہم بہ بیاں غلام ہمدانی مصحفی کہ شاعرے است مسکیں نہاد بے ہیچ بحدّے طرف شدہ کہ کار از گفتگوے رکیک کہ شایانِ شان ہنرمندان نبود واگزاشتہ بہجوگوئی کشید بلکہ آنچہ زبان زد احاد الناس است و بمجلس عامیان نسزد تا بمحفل بہشت آیین ملوک و سلاطین چہ رسد چہ برطراز د کہ حیا بہ تحریرش رخصت نمی دہد و قلم حقائق رقم عرق عرق انفعال می شود۔ اگر از انسان کہ سراپا سہو و نسیان است خطائے رفت رفت۔ کلام بشر کلام اللہ نیست کہ بے خطا باشد۔ شعر است ؎

شعر اگر اعجاز باشد بے بلند و پست نیست
در ید بیضا ہمہ انگشتہا یک دست نیست (صہ ۸۱/۱)

ان الفاظ پر یہ بیان ختم ہوتا ہے۔ اب خود ان کے ساتھ جو بیتی ہے اس کی رام کہانی یوں شروع کی ہے:۔

"اگرچہ گلہ گذاری خاصہ بعد صلح شعاری شعار اہل صلاح نیست اما چوں کار بواقعہ نگاری افتاد بر سبیل حکایت ماجرائے کہ بمشاعرۂ امین الدولہ معین الملک ناصر جنگ بہادر عرف مرزا سیڈو صاحب امیر تخلص بحضرت دہلی روداد نبدے ازاں شرح دادن مضائقہ ندارد۔"

اس تمہید کے بعد اصل سرگزشت بیان کی گئی ہے۔ جس میں انشا کی زیادتیاں بھی درج ہیں۔ اپنی بے قصوری اور بے بسی کا بھی ذکر ہے۔ مگر اس روداد کے خاتمہ پر مصنف کے جذبات کا ترجمان یہ مصرع ہے۔ ع

درمیان جان و جانان ماجرائے رفت رفت (ص $\frac{۲-۸۶}{۱}$)

اور اسی مصرع پر یہ قصہ ختم کر دیا جاتا ہے۔

شاہ نصیر کی کج خلقی اور رعونت کے حکیم صاحب البتہ شکوہ سنج ہیں۔ اور وجہ بھی معقول ہے۔ قطع نظر ان دیرینہ مراسم کے جو شاہ صاحب کے والد شاہ غریب اور حکیم صاحب کے درمیان تھیں اور شاہ صاحب حکیم صاحب کے سامنے پیدا ہوئے۔ ان کی گود میں کھیلے اور بڑے ہوئے جوان ہو کر حکیم صاحب کے ساتھ نخوت اور بے اعتنائی سے پیش آئے لکھتے ہیں:-

"باوصفے کہ والد ماجدش بر قاسم ہیچمدان خیلے مہربان وزبدۂ
صوفیان زمان حضرت میر جہان براین سراپا نقصان نہایت
عنایت فرما بودند وبعہذا جلوہ اش از کتم غیب بمنصۂ ظہور بحضور
ایں عین قصور ودیگر امور مستدعیہ مودت وتعیش با
سرور کہ ذکر آں ہا باوصف عدم ملایمت باطناب محل
می کشد از ہمہ اغماض العین فرمودہ برخلاف چشمداشت
پیش می آید۔ ہے ہے غلط کردم وخطا کردم۔ جائے
شکوہ نیست۔ در اظہار اوصاف جبلی وابراز اخلاق خلقی
انسان مجبور ومعذور است ع

"کل انا ر تیرشح بمافیہ" (ص ۲۷۳/۲)

مولانا آزاد نے اس گتھی کو یوں سلجھایا ہے:۔

"حکیم قدرت اللہ خاں قاسم سے ایک خاص معاملہ یہ درمیان
آیا کہ ایک دفعہ مشاعرے میں طرح ہوئی۔ یار شتاب اور تلوار شتاب۔
شاہ نصیر نے جو غزل کہہ کر پڑھی تو اس میں قطعہ تھا کہ:۔

رخِ انور کا ترے وصف لکھا جب ہم نے — انوری نے دیا دیوان الٹ آبِ شتاب
پھر پڑھا ہم نے جو مضمون بیاضِ گردن — سن اسے ہو گیا چپ قاسم انوار شتاب

حکیم صاحب مرحوم خاص وعام میں واجب التعظیم تھے۔ اس کے علاوہ

فضیلت علمی کے ساتھ فنِ شعر کے مشاق تھے اور فقط موزونی طبع اور روزِ کلام کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ چونکہ خود قاسم تخلص کرتے تھے۔ اس لیے قاسم انوار کا لفظ ناگوار ہوا۔ چنانچہ دوسرے شاعروں کی غزل میں قطعہ لکھا:۔

واسطے انسان کے انسانیت اوّل شرط ہے　　میر ہو یا میرزا ہو خاں ہو یا نواب ہو
آدمی تو کیا خدا کو بھی نہ ہم سجدہ کریں　　گر نہ خم تعظیم کو پہلے سر محراب ہو

(آبحیات صفحہ ۲۰۷-۸)

لیکن مصنّف کے بیان کی روشنی میں یہ توجیہ ناقابلِ قبول ٹھہرتی ہے۔
شاہ نصیر کے علاوہ حکیم صاحب میر صاحب (میر تقی میرؔ) سے بھی خفا ہیں۔ خفگی کے اسباب سے ہم تاریکی میں ہیں۔ الزام وہی ہے جو شاہ نصیر کے خلاف تھا۔ یعنی نخوت اور بد دماغی۔ یہ کمزوری شاعروں میں کم و بیش پائی بھی ضرور جاتی ہے۔ آبحیات میں میر صاحب کی سیرت کی جو بدنما تصویر اُتاری گئی ہے۔ اس کے بعض رنگ حکیم صاحب ہی کے تیار کردہ ہیں۔ ہم ان الزامات کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتے۔ ناظرین ان کے متعلق بعض اشارے عنوانِ ذیل میں ملاحظہ فرمالیں:۔

آبحیات اور مجموعۂ نغز

اس سے قبل اشارہ کیا جاچکا ہے کہ حکیم صاحب کا یہ تذکرہ مولینا محمد حسین آزاد کی مشہور تالیف آبِ حیات کا ایک اہم ماخذ ہے۔ اس مسئلہ پر کسی قدر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے اور مختصراً اس اطلاع کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ جو اس تذکرے سے لی گئی ہے۔

ولی اور ناصر علی کے درمیان شاعرانہ تعلّی کا قصہ صد ۹۳ آبحیات شاہ مبارک آبرو کے حالات اور اشعار متفرق۔ مکھن پاکباز کا ذکر صد ۹۷ شیخ شرف الدین مضمون کا حال اور اشعار صد ۱۰۲، آرزو کا ذکر اور اشعار صفحہ ۱۲۱، ۱۲۲، آرزو کی بدیہہ شعر خوانی صد ۱۲۳، سودا کے شعر کو حدیثِ قدسی کہنا صد ۱۴۲۔ محمد شاکر ناجی کے حالات اور نادر شاہ سے جنگ کے متعلق ان کے خمسہ کے دو بند اور متفرق اشعار صد ۱۰۵ شاہ حاتم کے بیشتر اور اشرف علی خاں یک رنگ کے کمتر حالات و اشعار صفحہ ۱۰۷ اس تذکرے سے منقول ہیں۔

میرزا جان جاناں مظہر کے واقعۂ شہادت کے ذکر میں تو خود آبحیات میں اس تذکرے کا حوالہ دیا گیا ہے۔ مولانا آزاد فرماتے ہیں :-

"لیکن حکیم قدرت اللہ خاں قاسم اپنے تذکرے میں فرماتے ہیں کہ مرزا صاحب اپنے کلام میں اکثر اشعار حضرت علی کی مدح میں کہا کرتے تھے۔ اس پر بگڑ کر کسی سنّی نے یہ حرکت کی"۔ (حاشیہ میں اضافہ کیا ہے)

"عجیب مشکل ہے حکیم صاحب بھی ایک خوش اعتقاد سنت جماعت تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ سنّی نے مارا۔ لوگ کہتے ہیں شیعہ نے مارا"۔ (ص ۱۲۴)

لیکن حکیم صاحب کا منشا بالکل برعکس ہے۔ اس کی عبارت ہے:۔

"از انجاکہ مشرب صافی و مذہب اہل حق حق بوئے ارزانی داشتہ بود۔ ظالمے ناحق شناس در ایام متبرکہ عاشور بہ تعصب مذہب اپے بہ حقیقت کار نابروہ کردے غریق حب جناب ولایت مآب و حریق عشق حضرت امامت انتساب مرتضوی بود سلام اللہ علیہ کرم اللہ وجہہ چنانچہ بعض اشعار آبدارش خاصہ ایں بیت ؎

نکرد مظہر ما طاعتے و رفت بخاک
نجات خود بتولای بوتراب گذاشت

بر بے گناہیش گواہی دہد بے گناہ شہید ساختہ بحضور سراپا سرور شہدای کربلائے معلّٰے علیہم السلام والرضوان رسانید"۔ (ص $\frac{199}{2}$)

سودا کے بیان میں میر و میرزا کی افضلیت کے سلسلے میں مجموعہ نغز

کی اصل عبارت بھی منقول ہے۔ چنانچہ:۔

حکیم قدرت اللہ خاں قاسم بھی اپنے تذکرے میں فرماتے ہیں:۔

"زعم بعضے آنکہ سرآمد شعرائے فصاحت آنا مرزا محمد رفیع سودا غزل گوئی بوئے نرسیدہ اما حق آنست کہ ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

مرزا دریائیست بیکراں و میر نہریست عظیم الشان۔ در معلومات قواعد میرزا بر مرزا برتریست و در قوت شاعری مرزا را بر میر سروری" (صـ ۱۶۴)

سودا کا لطیفہ قائم علی امیدوار کے ساتھ صـ بقا اللہ خاں بقا کے حالات صـ ۱۵۴ حاشیہ اور اشعار میر صاحب کی ہجو میں صـ ۲۲۲ میر خاں کمترین کا حال حاشیہ صـ ۲۱۱، صـ ۲۱۲ اسی ماخذ سے ہیں۔

میر تقی میر کے متعلق ہمارے ہاں عام جذبات یہ ہیں کہ مولانا آزاد نے میر صاحب کی بد دماغی اور تنگ مزاجی کے افسانے کو غیر ضروری فروغ دیا ہے۔ جس کی اصل غالباً کچھ بھی نہیں۔ مصنف گل رعنا کا بیان ہے۔

آزاد کہتے ہیں کہ "افسوس یہ ہے کہ ان کو (میر صاحب کو) اوروں کے کمال بھی دکھائی نہ دیتے تھے اور یہ میر سے شخص کے دامن پہ بدنما دھبہ ہے۔ ایک اور جگہ کہتے ہیں کہ "خواجہ حافظ اور شیخ سعدی کی

غزل پڑھی جائے تو وہ سر ہلانا گناہ سمجھتے تھے۔ کسی اور کی کیا حقیقت ہے"۔
مگر جب اس کی جانچ ہم ان کی کتاب نکات الشعرا سے کرتے ہیں تو
حیرت کی کچھ انتہا نہیں رہتی کہ یہ بیان کس قدر واقعہ کے خلاف ہے۔
(گل رعنا صلـ۱۵۶)

مولانا آزاد کی اصل عبارت یہ ہے :۔

"سب تذکرے نالاں ہیں۔ کہ اگر یہ غرور اور بے دماغی فقط امرا
کے ساتھ ہوتی تو معیوب نہ تھی۔ افسوس یہ ہے کہ اوروں کے کمال بھی
انھیں دکھائی نہ دیتے تھے۔ اور یہ امر ایسے شخص کے دامن پر نہایت بدنما
دھبہ ہے جو کمال کے ساتھ صلاحیت اور نیکوکاری کا خلعت پہنے ہو۔
بزرگوں کی تحریری روایتیں ثابت کرتی ہیں کہ خواجہ حافظ شیرازی اور
شیخ سعدی کی غزل پڑھی جائے تو وہ سر ہلانا گناہ سمجھتے تھے۔ کسی اور
کی کیا حقیقت ہے۔ (آبحیات صفحہ ۱۶ - ۲۱۷)

اس موقع پر مولانا آزاد نے تخیل سے کام نہیں لیا ہے۔ ان کی
عبارت کا اصل ماخذ حکیم صاحب کا یہ فقرہ ہے :۔

"از نخوت و خود سریش چہ بر نگارم کہ سینۂ قلم حقائق رقم
می نگارد بر شعر کسے گر ہمہ اعجاز باشد و کلام فصیح شیراز سرہم
نمی جنبانید بہ تحسین خود چہ رسد و بہ سخن احدے اگرچہ معجز

طرازی بود گفتۂ اہل شیرازی گوش ہم فراہمی دارد امکان چیست
کہ حرف آفرین بر زبانش رود (ص $\frac{۲۳۰}{۲}$)

ولی کے متعلق آزاد کا یہ بیان بے اصل مانا گیا ہے۔ ولی کہ بنی نوع شعرا کا آدم ہے۔ اس کے حق میں فرماتے ہیں۔ "ولی شاعریست از شیطان مشہور تر" میر خان کمترین اسی زمانے میں ایک قدیمی شاعر دلی کے تھے۔ انھیں اس فقرے پر بڑا غصہ آیا۔ ایک نظم میں اوّل بہت کچھ کہا۔ آخر میں آکر کہتے ہیں۔ ع

ولی پر جو سخن لائے اسے شیطان کہتے ہیں" (ص ۱۱-۲۱۲)

نکات الشعرا چھپ گیا ہے۔ بیشک اس میں شیطان والا فقرہ موجود نہیں ہے۔ لیکن آزاد کا بیان حکیم صاحب کے ان بیانات پر مبنی ہے:۔

"در تذکرہ خود ہمہ کس را بہ بدی یاد کردہ در حق شاعر شان جلی المتخلص بہ ولی نوشتہ کہ وے شاعرے است از شیطان مشہور تر و سزائے ایں کردار ناہنجار از کمترین شاعر بواجبی یافتہ کہ وے ہجو ہائے متعددہ ادکردہ کہ بعضے ازان نہایت رکیک د پردہ در افتادہ"۔ (ص $\frac{۲۳۰}{۲}$)

"بنا بر نوشتن میر در تذکرۂ خود شاعر شان جلی المتخلص بہ ولی

داکہ وے شاعر لیست از شیطان مشہور تر ہجوہائے رکیکہ
بواجبی نمود"۔ (ص ۱۴۳/۲)

"حقش بر جملہ سخن پردازان ہندی زبان ثابت است و
سخن بر سخنش ابلیس منشی و سلطنت۔ میر خاں کمترین کہ
خداش بیامرزد بسیار بموقعہ و بجا گفتہ کہ ع
ولی پر جو سخن لاوے اُسے شیطان کہتے ہیں (ص ۲۹۷/۲)

محمد امان نثار کے حالات اثر در نامہ کا ذکر اور نثار کی ہجو نگاری ص ۲۱۸ ۔ اسی تذکرے سے منقول ہے ۔ اور جرأت کے حال میں ایک حوالہ بھی ملتا ہے ۔ چنانچہ :۔

حکیم قدرت اللہ خاں قاسم فرماتے ہیں کہ ان کے بزرگ دربار شاہی میں دربانی کی خدمت رکھتے تھے (ص ۲۳۶) جرأت کے بعض ابتدائی حالات ص ۲۳۷ ۔ مرزا محمد تقی خاں ترقی کے مشاعرے میں جرأت کا دھوم دھامی غزل پڑھنا اور میر صاحب سے داد طلب کرنا ان کا ٹال ٹال جانا اور بعد میں جھنجلا کر یہ کہنا "کیفیت اس کی یہ ہے کہ تم شعر وعر تو کہہ نہیں جانتے ہو۔ اپنی چوما چاٹی کہہ لیا کرو (ص ۲۴۱) اسی تالیف کا فیضان ہے ۔ البتہ ایک فرق ہے کہ مجموعہ نغز میں 'چوما چاٹی' کی جگہ 'چوما چاٹا' لکھا گیا ہے ۔ ملاحظہ ہو ۔ (ص ۱۵۵/۲)

میر حسن کے حالات ص۲۵۳ ۔ میر ماشاء اللہ خاں کے پورے
حالات ص۲۵۹ ۔

انشاء اور عظیم بیگ کا معرکہ (ص۲۶۲ ، ص۲۶۵) اور نواب امین الدولہ یمین الملک ناصر جنگ عرف مرزا مینڈھو کے ذکر کے لیے بھی یہی تذکرہ سند مانا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی موقعے ہیں جہاں آبحیات میں اس تالیف کا پرتو نمایاں ہے ؛

کتاب منزل لاہور کی چند اہم مطبوعات

تنقید و ادب

اُردو ادب کے آٹھ سال۔ عشرت رحمانی ۔ ۱۲—۰—۰
جدید اُردو شاعری۔ پروفیسر عبدالقادر سروری ۔ ۲—۸—۰
دورِ حاضر اور اُردو غزل گوئی۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی ۔ ۳—۸—۰
مقالاتِ شیرانی۔ پروفیسر حافظ محمود شیرانی ۔ ۳—۸—۰
ادبی کہانیاں۔ نسیم امروہوی ۔ ۳—۴—۰
کشکول۔ رئیس احمد جعفری ۔ ۵—۰—۰
اُردو زبان اور ہندو۔ ناظم سیوہاروی ۔ ۱—۱۲—۰
ادبستان۔ علامہ خلیقی دہلوی ۔ ۲—۸—۰
خطوطِ غالب۔ مولانا غلام رسول مہر ۔ ۱۲—۰—۰
آبِ حیات۔ مولانا محمد حسین آزاد ۔ ۵—۰—۰
محاوراتِ نسواں۔ وزیر بیگم ضیا ۔ ۰—۱۲—۰
مطالب بانگِ درا۔ مولانا غلام رسول مہر ۔ ۶—۰—۰
مطالب بالِ جبریل۔ مولانا غلام رسول مہر ۔ ۵—۰—۰
مطالب ضربِ کلیم۔ مولانا غلام رسول مہر ۔ ۴—۰—۰
سرگزشتِ الفاظ۔ احمد دین بی۔ اے ۔ ۲—۸—۰
حکایاتِ بیدپائے۔ انوارِ سہیلی کا نیا ترجمہ
مرزا احمد رشید ایم۔ اے ۔ ۴—۸—۰

فلسفہ، نفسیات، معاشیات و سائنس

ہر دلعزیزی۔ عابدی جعفر ۔ ۴—۰—۰
بچوں کی نگہداشت۔ حسین انور ۔ ۳—۰—۰
تابناک زندگی۔ حسین انور ۔ ۳—۴—۰
فلسفۂ کامرانی۔ حسین انور ۔ ۸—۰—۰
قابلیت کا مصرف۔ کمال احمد رضوی ۔ ۲—۸—۰
زندگی تابندگی۔ کمال احمد رضوی ۔ ۲—۰—۰

خود کو بھی موقع دیجیے۔ کمال احمد رضوی ۔ ۲—۰—۰
عادتیں اور ہم۔ عابدی جعفر
اندھیرے اور تاریک گوشے۔ حسین انور
فلسفۂ تعلیم و تربیت۔ رئیس احمد جعفری ۔ ۲—۱۲—۰
نفسیاتی علاج۔ رئیس احمد جعفری ۔ ۳—۰—۰
تکلیف و اذیت۔ رئیس احمد جعفری ۔ ۳—۰—۰
تحلیل نفسی۔ حزب اللہ ایم۔ اے ۔ ۸—۰—۰
تعلیمی نفسیات۔ عبدالحی علوی ایم۔ اے ۔ ۸—۰—۰
دوست بنو دوست بناؤ۔ نسیم امروہوی ۔ ۲—۸—۰
نوجوانوں کی نفسی بیماریاں۔ ڈاکٹر محمد ستار علی ۔ ۲—۸—۰
معاشیاتِ قومی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین ۔ ۸—۰—۰
ہمارے نسخے (۲ حصے) ظہور الحق قریشی ۔ ۶—۴—۰
فرض شناسی۔ سید ناظر حسن زیدی ۔ ۴—۰—۰
ہم اور نفسیات۔ عابدی جعفر ۔ ۴—۰—۰
رازِ قدرت۔ پروفیسر قمر الزمان ۔ ۳—۰—۰
سائنس اور جرم۔ علی ناصر زیدی ۔ ۳—۸—۰
خدماتِ سائنس۔ علی ناصر زیدی ۔ ۳—۸—۰
معجزاتِ سائنس۔ علی ناصر زیدی ۔ ۳—۸—۰
سائنس شاہراہِ ترقی پر۔ علی ناصر زیدی ۔ ۴—۰—۰
مصنوعات کی کہانی۔ علی ناصر زیدی ۔ ۴—۰—۰
نئی ایجادیں۔ علی ناصر زیدی ۔ ۳—۸—۰
ملک ملک کی سیر ملک ملک کے انسان
علی ناصر زیدی ۔ ۴—۰—۰
خود شناسی۔ حسین انور ۔ ۳—۸—۰
دولت آپ کے قدموں میں۔ ۶—۰—۰
مطمئن رہیے۔ محمد شفیع الدین ۔ ۲—۱۲—۰
زندگی سے فائدہ اٹھائیے۔
کمال احمد رضوی ۔ ۲—۰—۰

منظوم و افکار

صبحِ بہار۔ اختر شیرانی ۔ ۳—۰—۰
اختر ستان۔ اختر شیرانی ۔ ۳—۰—۰
لالۂ طور۔ اختر شیرانی ۔ ۴—۰—۰
طیورِ آوارہ۔ اختر شیرانی ۔ ۳—۸—۰
شہناز۔ اختر شیرانی ۔ ۳—۸—۰
نشاطِ رفتہ۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی ۔ ۷—۰—۰
کلیاتِ حسرت۔ ایڈیٹر عشرت رحمانی
(مولانا فضل الحسن حسرت موہانی کی غزلیات کا مکمل مجموعہ) ۔ ۵—۰—۰
دیوانِ حافظ (عکسی ایڈیشن) ۔ ۸—۰—۰

اقبالیات

اقبال قرآن کی روشنی میں۔ ظفر ایم۔ اے ۔ ۹—۰—۰
اقبال۔ غلام رسول مہر ۔ ۹—۰—۰
نادراتِ اقبال۔ غلام رسول مہر ۔ ۴—۰—۰
اقبال اور ذکرِ رسول۔ رئیس احمد جعفری ۔ ۵—۰—۰
عرفانِ اقبال۔ بشیر مفتی القادری ۔ ۳—۰—۰
رموزِ اقبال۔ ڈاکٹر میر ولی الدین ۔ ۰—۴—۰
ارشاداتِ اقبال۔ عبدالرحمٰن طارق ۔ ۲—۸—۰
اقبال کی پیشگوئیاں۔ ڈاکٹر ہاشمی ۔ ۳—۰—۰

تصانیفِ اقبال

بانگِ درا مجلد	۵—۰—۰	بالِ جبریل	[illegible]
ضربِ کلیم	۳—۰—۰	ارمغانِ حجاز	
مثنوی پس چہ باید کرد		مثنوی اسرار و رموز	
مسافر	۲—۰—۰	جاوید نامہ	
زبورِ عجم	۳—۸—۰	پیامِ مشرق	

شیخ غلام علی اینڈ سنز ناشران و تاجرانِ کتب کتاب منزل
کشمیری بازار لاہور ۔ اردو بازار ... بندر روڈ کراچی